حمایت علی شاعر کی ادبی خدمات

ڈاکٹر رعنا اقبال

مقتدرہ قومی زبان
پاکستان

حمایت علی شاعر کی ادبی خدمات

ڈاکٹر عنا اقبال

مقتدرہ قومی زبان، پاکستان
۲۰۱۲

جملہ حقوق بحق مقتدرہ قومی زبان محفوظ ہیں

سلسلہ اشتراک وتعاون: ۰۳۔

عالمی معیاری کتاب نمبر ISBN۹۷۸-۹۶۹-۴۷۴-۲۹۱-۵

☆

طبع اوّل	....	۲۰۱۲ء
تعداد	....	۵۰۰
قیمت	....	=/۳۰۰ روپے
فنی تدوین	....	صفدر رشید
اہتمام	....	پورب اکادمی، اسلام آباد، ۰۵۱-۲۲۱۰۱۰۱
ناشر	....	ڈاکٹر انوار احمد

صدر نشین
مقتدرہ قومی زبان، ایوانِ اُردو،
پطرس بخاری روڈ، ایچ۔۸/۴،
اسلام آباد، پاکستان۔
فون: ۰۵۱-۹۲۵۰۳۰۸
فیکس: ۰۵۱-۹۲۵۰۳۱۰

ای میل: ahmadanwaar49@yahoo.com

☆

یہ کتاب مقتدرہ قومی زبان اور پورب اکادمی، اسلام آباد کے اشتراک وتعاون سے شائع کی جارہی ہے۔

پیش لفظ

ہماری جامعات کے حوالے سے بعض کلاسیکی محققوں کے ذہن میں کچھ تحفظات ابھرتے ہیں جب کسی ایک تخلیق کار کی سوانح، شخصیت اور فن کو موضوع بنایا جاتا ہے مگر حقیقت میں ایسے تمام کام مستقبل میں تواریخ ادب لکھنے والے اور تنقید کے نگار خانہ فکر کو سنوارنے والے سبھی عالموں کے کام آتے ہیں۔ مقتدرہ قومی زبان نے کوشش کی ہے کہ پاکستانی جامعات کے ان مقالات کو بھی شائع کیا جائے جن پر پی ایچ ڈی یا ایم فل کی ڈگری دی جا چکی ہے، چنانچہ ہمیں خوشی ہے کہ وفاقی اردو یونیورسٹی کراچی سے وابستہ محترمہ رعنا اقبال کا مقالہ ''حمایت علی شاعر'' شائع کر رہے ہیں جس پر محترمہ رعنا اقبال کو جامعہ کراچی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی گئی ہے۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ اہل علم مقتدرہ کی جانب سے اشتراک وتعاون کی بنیاد پر شائع ہونے والی اس کتاب کی عملی پذیرائی کریں گے اور عملی پذیرائی سے ہماری مراد یہ ہے کہ وہ نہ صرف اسے خود خریدیں گے بلکہ اپنے احباب کو خرید کر بھی پیش کریں گے۔ ان کے ایسے اقدام کو پاکستان میں فکری ترقی اور کتاب کلچر کے ظہور کا خواب دیکھنا بھی ممکن نہیں۔ اسے ہم پورب اکیڈمی کے اشتراک سے شائع کر رہے ہیں۔

محترمہ ڈاکٹر انجم حمید کی سرگرمی میں مقتدرہ میں ایک ایسا شعبہ قائم کر دیا گیا ہے جس میں وسائل کے اشتراک کی بنیاد پر ایسی کتب کی اشاعت کو ممکن بنایا جائے گا، جنھیں جامعات پی ایچ ڈی یا ایم فل کی ڈگری دے چکی ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ اس کام میں ہمیں ااور اہلِ دل کا تعاون ویسے حاصل رہے گا، جیسے 'اخبارِ اردو' کی سالانہ خریداری مہم میں حاصل رہا ہے۔

(انوار احمد)

ای میل: ahmadanwaar49@yahoo.com

ویب گاہ: www.nla.gov.pk

اسلام آباد: ۷۔فروری ۲۰۱۲ء

فہرست

پیش لفظ	ڈاکٹر انوار احمد	۳
حرفِ آغاز	ڈاکٹر رعنا اقبال	۷
۱۔ حمایت علی شاعر کا عہد		۱۱
۲۔ حمایت علی شاعر بحیثیت شاعر		۲۵
۳۔ شاعر کی نثر نگاری		۱۴۵
۴۔ تحقیقی و علمی کام		۱۵۸
۵۔ فلم، ٹی وی، اسٹیج، ریڈیو		۱۶۵
۶۔ حمایت علی شاعر کے تراجم، انٹرویوز اور خطوط		۱۷۸
۷۔ حمایت علی شاعر اور معاصرین		۲۰۹
۸۔ اردو شعر و ادب میں شاعر کا مقام		۲۲۰
کتابیات		۲۳۰

حرف آغاز

آج مجھے قلم سے رشتہ جوڑے کم وبیش تیس سال تو ہو ہی چکے ہیں اور اس عرصے میں بہت کچھ لکھا تقریباً دس کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور اتنی ہی تعداد میں اشاعت کی منتظر ہیں۔ ادب اور صحافت سے عملی وابستگی نے مجھے ہمیشہ کتاب اور قلم کے قریب ہی رکھا۔ شاید میں نے اس کے علاوہ کچھ اور کیا ہی نہیں۔ لیکن اللہ گواہ ہے کہ آج یہ چند سطریں قلم بند کرتے وقت میرے دل کی کیا حالت ہے میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں اور تحریر کی شکستگی اس بات کا ثبوت ہے شاید یہ تحریر بہت مربوط بھی نہ ہو سکے۔ اس کی وجہ بھی میں آپ کو بتا دیتی ہوں۔ وہ یہ کہ دراصل یہ کتاب میرے مرحوم والدین کی دلی آرزو اور ان کے ایک دیرینہ خواب کی تعبیر ہے۔

ہم آٹھ بہن بھائی ہیں لیکن میں نے اپنے علاوہ کسی اور بہن بھائی کے لئے اپنی والدہ کے منہ سے یہ الفاظ نہیں سنے کہ ''میری دلی آرزو ہے کہ میری بیٹی اردو سائنس کالج میں پڑھائے'' حالانکہ میری معصوم والدہ کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ان کی بیٹی سائنس کی طالبہ نہیں ہے۔ بس وہ میری تعلیم سے دیوانہ وار محبت دیکھ کر انتہائی خوشی کے عالم میں یہ جملہ کہا کرتی تھیں۔ ادب سے لگاؤ میرے والد کی دین ہے وہ خود بہت اچھے اور بہت منفرد شاعر اور جگر صاحب پر جان چھڑکنے والے ایک بہت مہذب اور نفیس طبیعت کے انسان تھے۔ جب انہوں نے مجھے اس طرف مائل دیکھا تو وہ ایک طرح سے بہت مطمئن نظر آنے لگے تھے اور مسلسل میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔

یہ کتاب چونکہ میرا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے اس لئے یہاں میں صرف اسی سے متعلق ایک دو باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ میری والدہ کا انتقال ۳ ستمبر ۱۹۹۸ء کو ہوا اس وقت میں انہیں ایک خوشی یہ دے چکی تھی کہ میں اردو کالج میں پڑھا رہی تھی اور اس کے لئے میں نے جو پاپڑ بیلے ہیں وہ میرا اللہ یا میں خود جانتی ہوں لیکن میں صرف اپنی ماں کے الفاظ کو پورا کر دکھانا چاہتی تھی۔ اپنے انتقال کے پورے دو سال کے بعد وہ میری اکلوتی بیٹی ندا کے خواب میں آئیں اور اس سے کہا کہ ''میری بیٹی (یعنی میں) سب سے پہلے پی ایچ ڈی کرے گی'' حالانکہ میں سچ بتاؤں اس وقت تک میرے

ذہن میں دور دور تک پی ایچ ڈی کے متعلق کچھ بھی نہ تھا انہوں نے دو اور باتیں بھی اس سے کہی تھیں جن میں سے بفضل خدا آج تک دو پوری ہو چکی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ تیسری بھی ہو جائے گی بیٹی کے خواب کے بعد میں نے خود کو ماں کی اس خواہش کے لئے وقف کر دیا اور آج میں یہ سطریں لکھ رہی ہوں۔ اب دوسری بات..... مئی ۲۰۱۰ء میں جب میں نے اپنا مقالہ کراچی یونیورسٹی میں جمع کرا دیا تو ایک جلد اپنے والد کے کمزور ہاتھوں میں پکڑا دی انہوں نے جس طرح اسے آنکھوں سے لگایا اور اسے جس طرح چوما میری آنکھوں میں وہ منظر آج بھی پیوست ہے، لیکن اللہ کی رضا کے آگے میں سر جھکاتی ہوں۔ یکم فروری ۲۰۱۱ء کو میرے والد میری ماں سے ملنے عدم آباد چلے گئے اور میں اپنی ڈگری اور یہ کتاب انہیں نہ دکھا سکی۔ بس یہی وجوہ ہیں کہ اس بہت خوشی کے موقع پر اور یہ تحریر لکھتے وقت میری آنکھوں سے آنسو نہیں رک رہے میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اس موقع پر خوشی کا اظہار کروں یا اپنے دلی رنج و غم کا۔ لیکن جو میرے پروردگار کی مرضی۔

جہاں تک اس کتاب کا تعلق ہے تو مختصراً اس بارے میں بھی عرض کرتی ہوں کہ حمایت علی شاعر پر پی ایچ ڈی کرنے کا مجھے خیال کیسے آیا۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ میرے والد جناب اطہر ضیائی خود ایک کہنہ مشق شاعر اور اپنی زبان و ادب سے سچی محبت کرنے والے انسان تھے اور اللہ کا شکر ہے کہ نہ صرف پاکستان بلکہ بیرون پاکستان بھی علم و ادب کی بہت مستند اور قد آور شخصیات کو میں نے اپنے گھر میں دیکھا۔ کیونکہ ماہانہ مشاعرے، ہفتہ وار فکری نشستیں میرے گھر پر ہوا کرتی تھیں اور میں فخریہ کہتی ہوں کہ میں نے اپنا بچپن بہت بڑے لوگوں کے ساتھ گزارا۔ اسی نسبت سے میں حمایت علی شاعر کو بھی جانتی اور پہچانتی تھی سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ جب عملی طور پر میں ادب میں آئی تو ان کے فن کی مختلف جہتوں سے واقف ہوئی۔ ان کی کچھ انفرادیتوں سے آگاہی ہوئی تو میں نے ان پر کام آغاز کیا اور دو کتابیں ''بارش سنگ سے بارشِ گل تک'' اور ''تثلیث یا ثلاثی'' مرتب کیں۔ کچھ اور مختلف کام بھی ان کے ساتھ کئے تو انہیں مزید سمجھنے کا موقع ملا۔ پھر جب اس دنیا سے جا چکنے کے بعد بھی میری والدہ نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو میں خود کو اس کام سے نہ روک سکی اور یوں میری نگاہ میں حمایت صاحب آ گئے۔ میں نے جامعہ کراچی میں رجسٹریشن کروایا لیکن وہاں ''زندہ شخصیت'' پر ڈاکٹریٹ کرنے پر پابندی تھی اور میں نے اس کے لئے بھی ایک جنگ لڑی اور اپنے مقصد میں کامیاب رہی۔

اپنے موضوع کے حوالے سے صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ حمایت علی شاعر اردو کے ایک اہم اور قابل ذکر شاعر ہیں ان کی زندگی بڑی ہمہ جہت ہے اور اسی طرح ان کے فن کے پہلو بھی متنوع ہیں۔ وہ نثر نگار بھی ہیں، محقق بھی، صحافی بھی ہیں، نغمہ نگار بھی، مکالمہ نویس بھی ہیں اور ریڈیائی ڈراموں کے مصنف بھی۔ اداکار بھی رہے اور صداکار بھی۔ اس طرح ان کی ادبی شخصیت بڑی پہلو دار، بہت متنوع اور ادب کے طالب علم کے لئے بڑی توجہ طلب بن جاتی ہے۔ وہ اردو میں ایک نئی صنف ثلاثی کے موجد بھی ہیں تو دوسری طرف اردو میں پہلی ''منظوم خودنوشت سوانح حیات'' وہ بھی ایک بھرپور لکھنے کا سہرا بھی انہی کے سر جاتا ہے، لیکن ان سب باتوں سے قطع نظر میرے لئے سب سے زیادہ یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ اب جب کہ وہ ماشاءاللہ ''پیرانہ سالی'' میں قدم رکھ چکے ہیں تب بھی ان کا تخلیقی عمل جاری ہے۔

ان کی تمام تر علمی ادبی کاوشوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے ان پر تحقیقی مقالہ لکھنے کا ارادہ کیا اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور خاص فضل سے میں اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکی۔ لیکن اس موقع پر میں محترم و مشفق پروفیسر ڈاکٹر سید محمد یونس حسنی صاحب کی انتہائی ممنون ہوں کہ انہوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی فرمائی۔

اب آخری مرحلہ اس مقالے کی کتابی شکل میں اشاعت کا تھا اور اس حوالے سے میں بہت فکرمند تھی کیونکہ اپنے والدین کے خوابوں کی اس تعبیر کو میں انہی کے شایان شان طریقے سے زیور طبع سے آراستہ کرنا چاہتی تھی اور اس کے لئے میں محترم ڈاکٹر انوار احمد اور مقتدرہ قومی زبان کی بہت شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری کتاب کو یہ اعزاز بخشا اور میں اپنے ارادے میں کامیاب ہو سکی۔

اللہ تبارک و تعالیٰ انہیں اجر عظیم سے نوازے۔ آمین۔

رعنا اقبال

۲۵ر جنوری ۲۰۱۲ء

کراچی

باب اول

حمایت علی شاعر کا عہد

یوں تو شاعر کا کلام ہی اس کی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے مگر شاعری کی زبان اور ہوتی ہے۔ شاعری اشاروں کنایوں میں بہت سی حقیقتیں چھپا بھی دیتی ہے۔ کہیں شاعر کا انکسار بعض سچائیوں پر پردہ ڈال دیتا ہے اور کہیں اس کی خودستائی مبالغے کا شکار ہو جاتی ہے۔ محقق کی نظر میں دونوں پیرائے حقیقت کا چہرہ بگاڑ دیتے ہیں۔ زندگی، خدا اور انسان کے درمیان ایک خوب صورت سمجھوتے کا نام ہے۔ ہر انسان اپنی بساط بھر اس سمجھوتے کا پابند ہوتا ہے۔ جیسے جیسے انسان کا شعور بیدار ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو پہچاننے لگتا ہے اور اپنی دنیا میں اپنا مصرف بھی تلاش کرتا ہے۔

حمایت علی شاعر ایک باشعور انسان کا نام ہے، میں نے ان سے گفتگو کر کے، ان کی کتابیں پڑھ کر اور خصوصاً ان کی خودنوشت سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' کا مطالعہ کر کے انھیں دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر یہ خودنوشت بھی منظوم ہے اور اکاون (۵۱) اقساط میں تین ہزار سے زیادہ اشعار پر پھیلی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کتاب میں اشعار کے بین السطور سے ان کی زندگی کو دیکھنے اور پرکھنے کا مرحلہ درپیش رہا۔ مگر مجھے ایک اور وسیلے سے بھی ان کی زندگی کو دیکھنے کا موقع مل گیا۔ انھوں نے ایک فلمی ہفت روزہ ''نگار'' میں اپنی زندگی کے حوالے سے بہت کچھ لکھا تھا ''شاعر کی کہانی شاعر کی زبانی'' کے عنوان سے دس اقساط پر مشتمل یہ کہانی ۳۰ر اپریل سے ۲ر جولائی ۲۰۰۴ء تک ہر ہفتے ''نگار'' میں چھپتی رہی۔ حمایت علی شاعر کا تعلق چوں کہ فلم انڈسٹری سے بھی رہا ہے اس لیے فلموں کے شائقین بھی چاہتے تھے کہ ان کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوں اور حمایت صاحب یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ علم وادب کے قاری کے تقاضے کیا ہوتے ہیں اور شائقین فلم کیا چاہتے ہیں۔ ''آئینہ در آئینہ'' اور اس ''زبانی کہانی'' کے مطالعے سے یہ فرق واضح ہو جاتا ہے۔ مذکورہ کہانی میں انھوں نے زیادہ تر فلم انڈسٹری کا احوال لکھا ہے اور اپنی فلموں کی

بابت بتایا ہے۔ اس کے علاوہ ریڈیو پاکستان کراچی سے بھی انھوں نے ''مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا'' کے عنوان سے اپنی یادداشتیں (بارہ تیرہ قسطوں میں) زبانی سنائی تھیں۔ ریڈیو والوں نے انھیں ریکارڈ کر لیا تھا۔ میں نے ان سے بھی کچھ مواد حاصل کیا اور اب تحقیقی نقطۂ نگاہ سے واقعات بیان کر رہی ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ میں نے ان کے مختلف انٹرویوز سے بھی استفادہ کیا ہے اور ان کے گھر جا کر مختلف اوقات میں ان کی بیگم معراج نسیم صاحبہ اور ان کے بچوں سے بھی بات کی ہے۔ ان کے کچھ رشتہ داروں سے بھی معلومات حاصل کیں یہاں تک کہ ان کے پڑوسیوں سے بھی ملاقاتیں کیں۔ میں حمایت صاحب کے دوستوں کو بھی جانتی ہوں اور دشمنوں کو بھی۔ اس لیے میں نے وہ تحریریں بھی کتابی شکل میں پیش کر دی ہیں جو حمایت صاحب کی مخالفت اور ان کے جواب میں لکھی گئی تھیں اور فلم کے ساتھ ادبی موضوعات سے بھی تعلق رکھتی تھیں۔

حمایت صاحب نے کام بھی تو بہت متنوع کیے ہیں۔ ان میں متنازعہ مسائل بھی ہیں۔ اس سلسلے میں دو کتابیں ان کے دوستوں نے مرتب کی ہیں۔ یعنی قاصد عزیز اور نعمت اللہ نے ایک مختصر کتابچہ ''کسی چمن میں رہو'' اور مرزا سلیم بیگ نے ''احوالِ واقعی'' جب کہ میری اس وقت تک مرتب کردہ کتابوں کی تعداد تین ہے۔ ''بارشِ سنگ سے بارشِ گل تک''، ''تثلیث یا ثلاثی'' اور ''چراغ بکف''۔ آخر الذکر کتاب ابتدا میں حمایت صاحب نے خود مرتب کی تھی لیکن نظر ثانی کے وقت میں نے اس میں کچھ ضروری تحریروں کا اضافہ کر دیا۔

اس طویل تمہید کے بعد میں اصل موضوع کی طرف آتی ہوں اور اس کا آغاز ''شاعر کی کہانی شاعر کی زبانی'' کے چند جملوں سے کرتی ہوں جو حمایت صاحب نے اپنی تاریخ پیدائش کے بارے میں کہے ہیں... ''میری تاریخ پیدائش ۱۴ر جولائی ۱۹۲۶ء ہے لیکن خاندانی یادداشت کے حوالے سے ۱۹۳۰ء یا ۱۹۳۱ء ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ ریاست حیدرآباد کی تقویم بھی مختلف تھی یعنی عیسوی اور ہجری کے بجائے وہاں ایرانی تقویم ''فصلی'' رائج تھی۔ جس کے مہینوں کے نام بھی مختلف ہیں، مثلاً آزر، دے، بہمن، اسفندار، فروردی، اردی بہشت، خورداد، تیر، امرداد، شہریور، مہر، آبان۔ فصلی سن اور عیسوی سن میں دس سال کا فرق ہوتا ہے۔ ظاہر ہے حیدرآباد پر انڈیا کے قبضے کے بعد تقویم بدلنے سے ریکارڈ میں کچھ نہ کچھ فرق بھی رہ گیا ہوگا۔'' لیکن حمایت صاحب نے اپنے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ میں ۱۴ر جولائی ۱۹۲۶ء ہی اپنی تاریخ ولادت لکھوائی ہے۔

ان کا خاندان دو خانوں میں بٹا ہوا ہے۔ ددھیال فوجی اور ننھیال مذہبی۔ ان کے دادا میر ببر علی فوج میں تھے اور والد پولیس میں۔ جب کہ نانا مولوی تھے۔ اس گھرانے میں قاضی اور ملاّ قسم کے بزرگ زیادہ تھے۔ حمایت صاحب کی والدہ محترمہ لطف النساء بیگم پٹن کے قاضی کی بیٹی تھیں بچپن میں والدہ کے انتقال کے بعد ان کے والد قاضی اسماعیل الدین صاحب نے دوسری شادی کرلی۔ لطف النساء بیگم کی شادی نوعمری ہی میں سیّد تراب علی صاحب سے کردی گئی۔ اس وقت ان کی عمر بہ مشکل پندرہ یا سولہ برس کی ہوگی۔ حمایت صاحب اُن کی دوسری اولاد ہیں۔ ان سے بڑی ایک بہن تھیں جن کا نام حبیب النساء تھا۔ حمایت صاحب تین یا چار سال کے تھے تو ان کی والدہ کا نومولود بیٹے کے ساتھ ہی انتقال ہوگیا ان کے چند ہی سال بعد ان کی بہن حبیب النساء بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں اور حمایت صاحب بالکل تنہا رہ گئے۔ تراب علی صاحب کو بیگم کے انتقال سے گہرا صدمہ پہنچا اور انھوں نے سات آٹھ سال تک دوسری شادی نہیں کی۔ شاید وہ یہ بھی سوچتے ہوں کہ ابھی ان کا بیٹا بہت چھوٹا ہے اور نہ جانے سوتیلی ماں کا سلوک اس کے ساتھ کیسا رہے۔ شاید اسی اندیشے کی بنا پر حمایت صاحب کی دادی نے بھی اپنے بیٹے کے لیے ایسی لڑکی کی تلاش کی جو خود بھی ماں سے محروم تھی اور بیٹے کو سمجھا بجھا کر اس بن ماں کی لڑکی کو بہو بنا کر لے آئیں۔ ان کے عزیزوں میں ایک صاحب سیّد نور المقتدیٰ نام کے تھے جو بہت نیک اور شریف انسان تھے۔ ان کی بیگم بھی دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر دنیا سے چلی گئی تھیں۔ چناں چہ مقتدیٰ صاحب نے اپنی سالی سے شادی کرلی تا کہ بچے سکون سے رہ سکیں۔ لیکن سگی ماں تو سگی ماں ہی ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسی بہت کم مثالیں ہیں کہ سوتیلی ماؤں نے سگی ماؤں کی جگہ پُر کردی ہو۔ مقتدیٰ صاحب کی صاحب زادی حور النساء بیگم تراب علی صاحب کی دوسری بیگم کہلائیں اور وہ حمایت صاحب کے لیے بھی ایک اچھی ماں ثابت ہوئیں۔

مگر اس ماں کی محبت کے باوجود حمایت صاحب کے دل میں ایک احساسِ محرومی برقرار رہا۔ چھوٹی سی عمر میں ماں اور بہن سے بچھڑ جانا اور دس گیارہ برس کی عمر تک بالکل اکیلے زندگی گزارنا، اس کرب سے صرف وہی واقف ہوسکتا ہے جو اُس سے گزرا ہو اور پھر حمایت صاحب جیسا حساس بچہ! جو بچپن ہی سے اپنی ماں کی قبر کی تلاش میں تھا اور اکثر قبرستان جا کر گھنٹوں وہاں بیٹھا رہتا۔ اس ضمن میں ان کے چند اشعار پیش کر رہی ہوں:

میں سوچتا ہوں تو وہ دور یاد آتا ہے[۱] — بھلانا چاہوں تو کچھ اور یاد آتا ہے
وہ ایک چھوٹا سا لڑکا وہ ایک قبرستان — وہ ایک پیڑ کی چھاؤں اداس اور سنسان
وہ کھوئی کھوئی سی آنکھوں میں جستجو کوئی — لرزتے ہونٹوں میں اپنے سے گفتگو کوئی
بس اک خیال کہ لمّاں میری یہیں ہیں کہیں — اسی جگہ پہ اُتاری گئی ہیں زیرِ زمیں
یہیں سے ان کو خدا نے بلا لیا شاید — زمیں سے "ان کو" فلک پر اُٹھا لیا شاید
کبھی مجھے بھی بلا لے تو پھر مزہ آئے — یہاں پہ کون ہے جو، ماں کی طرح سے اپنائے

خدا محرومی کے اس احساس سے بچوں کو دُور رکھے۔ میرے خیال میں ماں اور بہن کے انتقال کے اثرات شعوری اور لاشعوری طور پر حمایت صاحب کے محسوسات پر اتنے شدید تھے کہ جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو وہ اندر سے بالکل ٹوٹ چکے تھے۔

اورنگ آباد کی ادبی فضا کے بارے میں، میں پہلے لکھ ہی چکی ہوں کہ حمایت صاحب کی تربیت کن استادوں اور کن بزرگوں کے سائے میں ہوئی۔ وہ کس قسم کی کتابیں پڑھتے تھے۔ ان کے احساسِ محرومی اور احساسِ تنہائی نے ان میں کیسی مایوسی اور دل شکستگی کی کیفیت پیدا کردی تھی اور پھر وہ کس طرح زندگی کی طرف واپس آئے اور کس طرح ایک مختلف اندازِ فکر ان میں سرایت کر گیا۔ کیسے باغیانہ خیالات ان میں جاگ اُٹھے اور پھر وہ کس طرح اورنگ آباد چھوڑ کر حیدر آباد چلے گئے۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔

ان باغیانہ خیالات کے سبب اسکول کی تعلیم میں ان کا دل نہ لگا۔ وہ مطالعے کے بہت شوقین تھے لیکن اب درسی اور نصابی کتب کے بجائے دوسری کتابیں ان کے زیرِ مطالعہ رہتیں جو انھیں نیا شعور عطا کررہی تھیں۔ سماجی، سیاسی اور مذہبی اعتبار سے وہ نئے انداز میں سوچنے لگے تھے۔ وہ روایتی تنگ نظر ماحول سے نکلنا چاہتے تھے اور اس فضا میں آنا چاہتے تھے جو ایک نئی دنیا کی بشارت دے رہا تھا۔ ان دنوں اُن کے محبوب شعرا میں علامہ اقبال اور دکن کے انقلابی شاعر مخدوم محی الدین اور نثری کتابوں اور رسالوں میں علامہ نیاز فتح پوری کی کتابیں اور ان کا رسالہ "نگار" سرِفہرست تھا۔ وہاں کی لائبریری "ادبستان" میں یہ رسالہ آتا تھا۔ حمایت صاحب اس کا ایک ایک صفحہ پڑھ جاتے اور اپنے ہم عمروں اور دوستوں سے بحثیں کرتے، پھر یوں ہوا کہ وہ اپنے بزرگوں سے بھی بحث کرنے لگے جو ظاہر ہے کہ اُس زمانے میں بہت معیوب بات تھی چناں چہ خاندان میں وہ ایک

بگڑے ہوئے نوجوان مشہور ہو گئے۔ اس عمر میں سگریٹ پینا اور ہوٹلوں میں بیٹھنا بھی شرفا میں بہت بُرا سمجھا جاتا تھا۔ یہ بُرائی بھی حمایت صاحب پر اپنی مُہر لگا چکی تھی۔ اس کے بعد ستم یہ ہوا کہ وہ میٹرک میں فیل ہو گئے۔[1] (وہ ریاضی میں کم زور تھے) اس تمام صورتِ حال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک دن وہ یہ کہہ کر کہ "اب اپنی زندگی خود بنائیں گے" گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور حیدر آباد چلے گئے۔ نصابی تعلیم بھی ادھوری رہ گئی تھی اس لیے وہ اخبارات کے دفتروں میں سروس تلاش کرتے رہے۔ رہنے کے لیے کوئی جگہ نہ ہونے کے سبب اکثر عشاء کے بعد کسی مسجد میں سو جاتے مگر وہاں بھی مسجد کے امام نے پابندی لگا دی۔ چناں چہ کبھی کسی مقبرے میں یا کبھی پتھر گٹی (ایک بازار) کے چبوتروں پر سو جاتے۔ آخر ایک اخبار روزنامہ "جناح" میں انھیں روزانہ قطعہ لکھنے اور ہفتہ وار کالم لکھنے کا کام مل گیا۔ اس اخبار میں وہ قلمی نام سے لکھتے اور رات گئے تک اخبار کے دیگر کام بھی انجام دیتے تھے تاکہ اخبار کے دفتر میں سونے کا موقع مل جائے۔ اکثر کاغذ کے گودام میں سو جاتے۔ ایک دن اخبار کے نمائندے کے طور پر پریم چند سوسائٹی کے ایک جلسے میں شریک ہوئے اور مائکروفون پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اسی جلسے میں مرزا ظفر الحسن (دکن ریڈیو کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر) بھی موجود تھے۔ انھوں نے حمایت صاحب کی آواز پسند کی اور ریڈیو آنے کے لیے کہا۔ آڈیشن ہوا اور وہ ریڈیو میں اناؤنسر اور نیوز ریڈر منتخب کر لیے گئے۔ اس سروس کی وجہ سے انھیں اخبار کی نوکری کو خیر باد کہنا پڑا۔ وہاں صرف پچاس روپے ملتے تھے۔ ریڈیو سے پچاسی روپے ملنے لگے اور یہ امید بھی دلائی گئی کہ چھ ماہ پروبیشنری مدت ختم ہونے کے بعد تنخواہ ایک سو بیس روپے ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں یہ بڑی رقم ہوتی تھی۔ حمایت صاحب نے ریڈیو کو ترجیح دی اور "جناح" کو چھوڑ دیا۔ ویسے بھی وہ اس اخبار کی پالیسی سے متفق نہیں تھے۔

حیدر آباد میں اُس وقت جو نامی گرامی شعرا اور ادیب تھے ان میں چند سے حمایت صاحب کو واقفیت تھی، مثلاً مسلم ضیائی، نظر حیدر آبادی، تحسین سروری اور ابراہیم جلیس وغیرہ۔ ریڈیو پر سروس کے باعث ان کے لیے پھر شب بسری کے مسائل پیدا ہو گئے اور وہ پھر کسی مقبرے وغیرہ میں جا کر سونے لگے۔ ایک رات حیدر آباد کی ایک ندی (دریائے موسیٰ) کے پل پر (جو نیا پل کے نام سے موسوم ہے) لیٹ گئے۔ تھکے ہوئے تھے ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا، وہ جلد ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ یہ بڑی خطرناک جگہ تھی اگر وہ کروٹ لیتے تو دریا میں

جا گرتے۔ مگر اتفاق سے وہاں سے گزرتے ہوئے مسلم ضیائی صاحب کی نظر اُن پر پڑ گئی انھوں نے حمایت صاحب کو جگایا اور یہاں سونے کی وجہ دریافت کی۔ پھر انھیں اپنے ساتھ "مجردگاہ" لے آئے۔ یہ ایک اونچی عمارت تھی جو معظم جاہی مارکیٹ کے قریب ہے۔ اس میں دو کمروں کے فلیٹ تھے۔ مسلم ضیائی بھی چوں کہ تنہا ہی تھے اور وہیں رہتے تھے، انھوں نے ایک کمرے میں بچوں کے رسالے "تارے" کا دفتر قائم کر رکھا تھا اور اس کا نام "اردو محل" رکھ دیا تھا (حمایت صاحب "تارے" میں لکھتے بھی تھے) مسلم ضیائی کے اصرار پر وہ "تارے" کے دفتر میں ہی رہنے لگے۔

شادی کے بعد کچھ عرصہ انھوں نے بہت پُر لطف گزارا لیکن ایک ڈیڑھ سال کے بعد ہی اکتوبر ۱۹۵۰ء میں انھیں ملازمت سے ہٹا دیا گیا۔ نہ صرف انھیں بلکہ ان کی بیگم کو بھی جو اس وقت ایک اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ ریاست حیدر آباد کے انڈیا میں ضم ہونے کے بعد اس میں بڑی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ لسانی بنیادوں پر علاقے تقسیم کر دیے گئے تھے۔ مرہٹی زبان کے علاقے مہاراشٹر میں، تلگو زبان کے علاقے آندھرا پردیش میں اور کنڑی زبان کے علاقے کرناٹک میں شامل کر دیے گئے تھے۔ دوسری بات یہ کہ فوج اور پولیس کے اکثر افسران کو ریٹائر کر دیا گیا تھا جن میں حمایت صاحب کے والد بھی شامل تھے۔ ایک اور افتاد ان کے خاندان پر یہ آن پڑی کہ ان کی آبائی زرعی زمینوں پر کچھ لوگوں کے اشارے پر کاشت کاروں نے قبضہ کر لیا تھا جس کی وجہ سے ان کا خاندان بڑے معاشی مسائل کا شکار ہو گیا تھا۔ حمایت صاحب نظریاتی طور پر ہمیشہ سے جمہوریت پسند اور ترقی پسند خیالات کے انسان رہے ہیں اس لیے مجلس اتحاد المسلمین کے سیاسی دور میں بھی وہ کبھی سیّد قاسم رضوی اور ان کے رضا کاروں کے طرف دار نہیں ہوئے بلکہ ایک طرح سے ان کے مخالفین میں ہی ان کا شمار ہوتا تھا۔ وہ کانگریسی بھی نہیں تھے۔ مگر جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے کہ وہ مخدوم محی الدین کے زیر اثر کچھ اشتراکی خیالات رکھتے تھے۔ چناں چہ ملازمت ختم ہو جانے کے بعد ان کے اندر بغاوت جاگ اُٹھی اور وہ احتجاجاً اخبار بیچنے لگے۔ چوں کہ وہ بحیثیت شاعر اور (بالخصوص) نیوز ریڈر حیدر آباد میں خاصے مشہور تھے۔ اس لیے کچھ ادبی اور ثقافتی انجمنوں نے اس زیادتی کے خلاف آواز اُٹھائی۔ ترقی پسند شاعر اور ادیب قمر ساحری اور وہاب حیدر نے باضابطہ ایک مہم چلا دی۔ نتیجتاً ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی اہلِ قلم کے احتجاجی بیانات

شائع ہونے لگے۔ ''بلٹز'' (ممبئی) میں خواجہ احمد عباس نے اپنے مشہور کالم ''لاسٹ پیج'' میں بڑے سخت الفاظ میں حکومت کی مذمت کی۔ ''نقوش'' (جالندھر) میں فکر تونسوی اور نریش کمار شاد نے اداریتی نوٹ لکھا۔ ''شاہراہ'' (دہلی) میں ساحر لدھیانوی نے ''ضربِ کلیم'' (کلکتہ) میں پرویز شاہدی نے اور ہفتہ وار ''شاہد'' (ممبئی) میں عادل رشید نے حمایت صاحب کے لیے احتجاج کیا۔ کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان ہفتہ وار ''نئی زندگی'' اور ''کراس روڈز'' نے بہت ہی پُرزور الفاظ میں مطالبہ کیا کہ شاعر صاحب کو ملازمت پر بحال کیا جائے۔ حیدرآباد کے اخبارات میں بھی یہی مطالبہ کیا گیا۔ حیدرآباد دکن کے ہفتہ وار ''پرواز'' نے ان تمام بیانات کو جمع کر کے ۹ رنومبر ۱۹۵۰ء کو ایک خصوصی شمارہ شائع کر دیا تھا۔ (یہ خاص شمارہ میں حمایت صاحب کی لائبریری میں دیکھ چکی ہوں) اس کا عکس مرزا سلیم بیگ نے اپنی کتاب ''احوالِ واقعی'' میں بھی دیا ہے۔

اس احتجاج کا نتیجہ یہ ہوا کہ محکمۂ نشریات کی جانب سے ایک وضاحت کی گئی کہ حمایت صاحب سرکاری ملازم ہوتے ہوئے حکومت کے خلاف سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے انھیں ملازمت سے ہٹایا گیا ہے۔ ریاست حیدرآباد میں کمیونسٹ پارٹی پر بڑے عرصے سے پابندی عائد تھی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کو بھی اس کا ذیلی ادارہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے ایسے تمام اہلِ قلم کی سرکاری محکموں سے وابستگی ممنوع قرار دے دی گئی تھی۔ اس زمانے میں حیدرآباد میں تلنگانہ تحریک بھی چل رہی تھی جس کی قیادت مخدوم محی الدین، روی نرائن ریڈی، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور جوادرضوی کر رہے تھے۔ اسی دوران حمایت صاحب کو ممبئی سے ایک رسالہ ایڈٹ کرنے کی دعوت مل گئی اور وہ اپنی بیوی اور ننھی سی بیٹی کو لے کر اورنگ آباد گئے اور انھیں اپنے والدین کے پاس چھوڑ کر ممبئی جا پہنچے جہاں ان کے باغیانہ ذہن سے ایک اور حرکت سرزد ہوگئی۔ دکن ریڈیو کی ایک رفیق کار، تلگو زبان کی سابقہ اناؤنسر اوشا ممبئی میں ''اپٹا'' (IPTA) انڈین پیپلز ایسوسی ایشن سے منسلک تھیں۔ انھوں نے حمایت صاحب سے ایک سیاسی بھجن لکھنے کی فرمائش کی۔ کوریا پر امریکا کے حملے کے خلاف ساری دنیا میں احتجاجاً ''امن تحریک'' چل رہی تھی۔ دنیا کے تمام انسانیت پسند اہلِ قلم اُس کے ساتھ تھے۔ فرانس کے مصور پکاسو نے علامت کے طور پر فاختہ کی ایک تصویر بنائی تھی جو امن کے تمام پرچموں پر اُڑ رہی تھی۔ اوشا نے اس بھجن کی دھن پریم دھون سے بنوائی اور اسے ''اپٹا'' کے اسٹیج پر یوں پیش کیا کہ ایک پردے پر جنگ کی تباہ کاریوں کے ہول ناک مناظر

پینٹ کروائے گئے۔ اس کے سامنے ڈالروں کے ڈھیر پر امریکا کے صدر ٹرومین کی مورتی کھڑی کی جس کے کئی ہاتھ تھے اور ہر ہاتھ میں وہ جنگی ہتھیار تھامے ہوئے تھا۔ اس مورتی کے اطراف امریکا کے پٹھو حکمران مثلاً چنگ کائی شیک، شاہ ایران، سعودی عرب کے بادشاہ اور ہندو پاکستان کے بعض وزرا (اپنے مخصوص کاسٹیوم میں) بیٹھے یہ بھجن گا رہے تھے۔ بھجن کا مکھڑا یہ تھا:

ڈالر دیس کے راجہ، او سب راجوں کے رکھوالے
کٹھن گھڑی ہے ہم بھگتوں پر، آ کر ہمیں بچا لے
آج ہمارے دیس کی جنتا ہم کو آنکھیں دکھائے
لاکھ جتن کر ڈالے لیکن پھر بھی منھ کی کھائے
سواگ کا لالچ، نرک کی دھمکی، کچھ بھی کام نہ آئے
لٹتی آن بچا لے... او سب راجوں کے رکھوالے

حمایت صاحب بتاتے ہیں کہ اس بھجن کی دھن اتنی پُرکشش تھی اور اسے اتنے خوب صورت انداز میں گایا اور اسٹیج کیا گیا کہ اس کی شہرت ممبئی میں دُور دُور تک پہنچ گئی۔ اسی ''بھجن'' کے سبب حمایت صاحب سے ایک فلم ''اسٹیج'' کا ایک گانا بھی لکھوایا گیا جو بعد ازاں بہت مقبول ہوا۔ لیکن اُس وقت تک حمایت صاحب پاکستان آ چکے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس بھجن کے سبب ممبئی کی سی آئی ڈی اوشا اور پریم دھون کے پیچھے پڑ گئی وہ انڈر گراؤنڈ ہو چکے تھے۔ حمایت صاحب کو اگرچہ ممبئی میں عام لوگ نہیں جانتے تھے لیکن پھر بھی کچھ دوستوں کے مشورے پر وہ بھی اورنگ آباد چلے گئے۔ مبادا کوئی سی آئی ڈی کو یہ اطلاع کر دے کہ بھجن کے شاعر حمایت علی شاعر ہیں۔

حمایت صاحب کے والد کو جب یہ معلوم ہوا کہ ممبئی میں ان کے صاحبزادے یہ تماشا کر آئے ہیں تو وہ اور بھی فکر مند ہو گئے اور حمایت صاحب سے اصرار کیا کہ وہ پاکستان چلے جائیں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ہندوستان میں کسی بھی وقت گرفتار ہو سکتے ہیں۔ انھیں دنوں میٹرک کے امتحانات بھی ہونے والے تھے۔ والد کی خواہش پر شاعر صاحب نے امتحان بھی دے دیا۔ (وہ دو برس ریاضی کے پرچے میں فیل ہوتے رہے تھے) اور امتحان کے فوراً بعد وہ کھوکھراپار کے راستے اپنے دو ہم عمر رشتہ داروں کے ساتھ کراچی پہنچ گئے۔

کراچی میں قائداعظم کے مزار کے اطراف میں بنی ہوئی جھونپڑیوں میں جیل کے پاس کشمیر روڈ

کے قریب (پہلے یہ علاقہ اسلام آباد کہلاتا تھا) وہ ایک جھونپڑا خرید کر رہنے لگے۔ حیدرآباد دکن پر ہندوستان کے قبضے کے بعد دکن ریڈیو کے بہت سے ملازمین پاکستان آ گئے تھے۔ کراچی ریڈیو پر حمایت صاحب کے جو دوست اور بزرگ تھے ان کی مدد سے حمایت صاحب کو بھی ریڈیو پاکستان میں کانٹریکٹ پر کام مل گیا۔ ان دوستوں میں وراثت مرزا، عبدالماجد، جہاں آرا سعید اور خصوصاً مرزا ظفرالحسن نے ان کا بڑا ساتھ دیا۔ لیکن شاعر صاحب کا دل کراچی میں نہیں لگ رہا تھا (ظاہر ہے ان کی چہیتی بیوی اورنگ آباد میں تھیں) کھوکھراپار کا راستہ بند ہو چکا تھا اور اب وہ چٹاگانگ کے راستے بحری جہاز سے ہی جا سکتے تھے۔ مگر اس کے لیے بڑی رقم کی ضرورت تھی اور شاعر صاحب کو ریڈیو سے صرف سو یا ڈیڑھ سو روپے ملتے تھے۔ پھر جھونپڑی کی زندگی... ایسی زندگی کے بارے میں تو انھوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

۱۹۵۲ء میں ممبئی سے ساحر لدھیانوی صاحب کا ایک خط شاعر صاحب کو ملا جو انھوں نے صہبا لکھنوی (مدیر افکار) کی معرفت بھیجا تھا جس میں انھوں نے شاعر صاحب کو خوب ڈانٹ پلائی تھی۔ ممبئی میں انھوں نے جس فلم کا گانا لکھا تھا، اتفاق سے وہی گانا ہٹ ہوا تھا۔ ساحر صاحب نے خط میں لکھا کہ شاعر صاحب فوراً انڈیا آ جائیں (ساحر صاحب بھی پاکستان بننے کے بعد ہندوستان گئے تھے) شاعر صاحب پریشان ہو گئے اور روزنامہ ''امروز'' کے دفتر جا کر ابراہیم جلیس سے مشورہ کیا۔ جلیس صاحب نے انھیں سمجھایا کہ اب وہ ایسا کریں گے تو انڈیا میں گرفتار ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ ان کا نام نہ صرف ریڈیو پاکستان کراچی سے نشر ہوتا ہے بلکہ پاکستان ہجرت کی خبر بھی روزنامہ ''سیاست'' (حیدرآباد دکن) میں چھپ چکی ہے۔ ساحر صاحب ۴۷ء میں ہی چلے گئے تھے اس لیے کہ ان کی والدہ اور نانی صاحبہ لدھیانہ میں کسی سکھ دوست کے گھر میں مقیم تھیں اور وہ لاہور میں رسالہ ''ادب لطیف'' کے ایڈیٹر تھے۔ چناں چہ پاکستان بنتے ہی جب پنجاب میں فسادات شروع ہوئے تو ساحر صاحب فوراً لدھیانہ گئے اور وہاں سے اپنی والدہ اور نانی کو لے کر دہلی چلے گئے جہاں انھیں حالی پبلشنگ ہاؤس کے رسالہ ''شاہراہ'' کی ادارت کا چانس مل گیا۔ کچھ عرصے بعد وہ ممبئی چلے گئے اور فلموں کے لیے نغمات لکھنے لگے۔ ابراہیم جلیس صاحب نے حمایت صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ ہندوستان جانے کا خیال ترک کر دیں اور اپنی فیملی کو یہاں بلوا لیں۔ ان دنوں پرمٹ سسٹم شروع ہو چکا تھا جو محکمہ وزارت خارجہ سے حاصل ہوتا تھا۔ اتفاق سے

اس محکمے میں حمایت صاحب کے زمانہ طالب علمی کے ایک دوست محمد میاں مالاباری کام کرتے تھے ان کی کوششوں سے حمایت صاحب کو جلد ہی پرمٹ بھی مل گیا اور انھوں نے اپنی بیگم کو ممبئی سے بحری جہاز کے ذریعے کراچی بلوا لیا اور اپنی جھونپڑی میں بسا لیا۔

(ان تمام واقعات کا تفصیلی ذکر ان کی منظوم سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' میں اشعار کی صورت میں موجود ہے)۔ حمایت صاحب میٹرک تو پاس کر ہی چکے تھے اس لیے انھوں نے ۱۹۵۲ء میں اردو کالج کراچی میں داخلہ بھی لے لیا۔ وہ اپنی شادی کے دوران ہی یہ عہد کر چکے تھے کہ اعلیٰ تعلیم ضرور حاصل کریں گے اور اپنے والد کی آرزو پوری کریں گے۔ یہی نہیں ان کی بیگم نے بھی سلسلۂ تعلیم شروع کر دیا۔ انھوں نے پہلے ''ادیب فاضل'' کیا جو بی اے کے مماثل سمجھا جاتا تھا۔ کیوں کہ انگریزی کے پیپر دینے کے بعد یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کی اجازت مل جاتی تھی۔

اسی زمانے میں حکومت نے قائداعظم کے مزار کے اطراف میں ڈالی ہوئی جھونپڑیاں اٹھوانے کا حکم دے دیا اور وہاں بسے ہوئے لوگوں کو مختلف علاقوں میں چھوٹے چھوٹے پلاٹ قیمتاً الاٹ کر دیے۔ چناں چہ حمایت صاحب اور ان کے کچھ عزیزوں کو ڈرگ روڈ کالونی میں جگہ ملی جو بعد میں شاہ فیصل کالونی کے نام سے مشہور ہوئی۔ لوگوں نے پہلے تو وہاں بھی جھونپڑیاں ڈالیں، پھر رفتہ رفتہ (اپنی بساط کے مطابق) مکانوں کی شکل دیتے رہے۔ لیکن وہاں نہ پانی کی سہولت تھی نہ روشنی کی۔ سڑکیں بھی ناپختہ تھیں اور آمد و رفت کا انتظام بھی ناقص تھا۔ نزدیک ہی ریلوے لائن ہونے کے سبب وہاں ایک ریلوے اسٹاپ بنا دیا گیا تھا۔ چناں چہ لوگ بسوں کے علاوہ لوکل ٹرین سے بھی شہر آنے جانے لگے۔ مگر یہ علاقہ غیر محفوظ بہت تھا۔ رات میں اکثر لوگ لٹ جاتے تھے اور شاعر صاحب تو رات گئے ہی گھر لوٹا کرتے تھے کیا کرتے مجبوری تھی۔ اس دوران اللہ تعالیٰ نے انھیں دو بچوں سے اور نواز دیا تھا اس لیے اخراجات اور بھی بڑھ گئے تھے۔ کبھی کبھی انجمن ترقی اردو بھی چلے جاتے اور بابائے اردو کی اردو انگریزی ڈکشنری کی ترتیب میں جز وقتی کام کر کے کچھ روپے کما لیتے تھے۔

شاعر صاحب کے باغیانہ مزاج کے بارے میں تو لکھ ہی چکی ہوں، یہ بغاوت ان کی ذاتی زندگی میں بھی نظر آتی ہے۔ ہندوستان میں ان کے دوستوں میں ہندو اور سکھ بھی شامل تھے۔ وہ ان کے تہواروں میں شریک بھی ہوتے اور عید بقرعید انھیں اپنے گھر بھی مدعو کرتے تھے ان کے گھر کے

لوگ بھی بہت روادار تھے وہ بھی کسی مذہب اور کسی فرقے سے نفرت نہیں کرتے تھے۔ حیدر آباد دکن میں ایسا ماحول تھا ہی نہیں کہ باہم نفرتیں پروان چڑھتیں پاکستان میں تو غیر مسلم بہت کم ہیں اس لیے عام لوگوں کا جذبۂ نفرت آپس ہی میں بٹ کر رہ گیا ہے۔ متعصب مولوی حضرات اس آگ کو ہوا دیتے ہیں اور نتیجے میں شیعہ سنی فساد کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعر صاحب نے اس صورتِ حال کے پیش نظر اپنے بچوں کے نام ہی مختلف اختیار کیے۔ پاکستان میں ان کے گھر جب پہلا بیٹا پیدا ہوا تو انھوں نے اس کا نام ''روشن خیال'' رکھا اسی طرح بیٹیوں کے نام بھی منفرد ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں حیدر آباد سندھ میں ریڈیو پاکستان قائم ہوا تو حمایت صاحب نے اپنا تبادلہ وہاں کروالیا۔ اس کا ایک سبب تو میرے خیال میں یہ تھا کہ وہ حیدر آباد دکن سے کراچی آئے تھے نام کی کشش اپنی جگہ لیکن دوسری وجہ کراچی کی بڑھتی ہوئی وسعت جس کے باعث وہ اپنی محدود آمدنی میں یہاں خود کو سمیٹ نہیں سکتے تھے، اس وقت حیدر آباد بہت چھوٹا سا لیکن پُرسکون شہر تھا اس میں انھیں حیدر آباد دکن کی خصوصیات بھی نظر آتی تھیں۔ چناں چہ شاعر صاحب نے جلد ہی ایک نو آباد محلہ لطیف آباد میں ایک کوارٹر قسط وار رعایتی داموں میں خرید لیا اور وہاں مستقل آباد ہو گئے۔ ساتھ ہی سٹی کالج میں داخلہ لے لیا اور گریجویشن کرنے کے بعد سندھ یونیورسٹی سے ایم اے بھی کر لیا۔ وہ پی ایچ۔ ڈی بھی کرنا چاہتے تھے جو بہ وجوہ نہ کر سکے۔ ۱۹۵۶ء میں انھوں نے حیدر آباد سے ایک دو ماہی رسالہ ''شعور'' بھی نکالا تھا۔ مگر اس کے صرف تین شمارے شائع ہو سکے۔ حیدر آباد ہی میں انھوں نے ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھے۔ غنائیے اور گیتوں بھری کہانیاں بھی لکھیں۔ گیت اور نغمے تو وہ لکھتے ہی تھے۔ تنقیدی اور تحقیقی مضامین بھی لکھے اور یہیں انھوں نے ۱۹۶۰ء میں ''خلائی'' بھی لکھنا شروع کی۔ اسی دوران وہ فلمی نغمہ نگاری بھی کرنے لگے۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ ان کی ایک نظم ''اَن کہی'' مشاعروں میں بہت مقبول تھی۔ ان کے ریڈیو کے ایک ساتھی خلیل احمد نے، جو اچھے موسیقار بھی تھے، اس نظم کے کچھ اشعار فلم ''آنچل'' کے لیے سلیم رضا کی آواز میں ریکارڈ کیے:

تجھ کو معلوم نہیں تجھ کو بھلا کیا معلوم

یہ نغمہ لاہور کے ایور نیو اسٹوڈیو میں ریکارڈ ہوا اور اتنا مقبول ہوا کہ پروڈیوسر فرید احمد صاحب نے اپنی فلم کے سارے نغمے شاعر صاحب ہی سے لکھوائے۔ جو غیر معمولی شہرت کے حامل ہوئے اور

۱۹۶۲ء میں جب یہ فلم ریلیز ہوئی تو اس فلم کے ایک مشہور ترین نغمے ''کسی چمن میں رہو تم بہار بن کے رہو'' پر انھیں بہترین نغمہ نگار کا ''نگار ایوارڈ'' عطا کیا گیا یہ نغمہ احمد رشدی نے گایا تھا۔ دوسرے سال یعنی ۱۹۶۳ء میں فلم ''دامن'' کے بہترین نغمے ''نہ چھیڑا سکو گے دامن'' (نور جہاں) پر بھی انھیں ''نگار ایوارڈ'' دیا گیا اور انھیں بہ یک وقت کئی فلموں کے کنٹریکٹ مل گئے۔ فروری ۱۹۶۲ء میں انھوں نے ریڈیو پاکستان کی ملازمت چھوڑ دی تھی اور مستقلاً فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے تھے، وہ دور مالی اعتبار سے ان کی خوش حالی کا دور تھا۔ اسی زمانے میں انھوں نے فلم سازی بھی شروع کر دی، پہلے ''لوری'' بنائی جو باکس آفس پر بھی بہت کامیاب رہی پھر ایک فلم ''منزل ہے کہاں تیری'' شروع کی... لیکن ہمارا معاشرہ کسی کو آگے بڑھتا ہوا کب دیکھ سکتا ہے۔ شاعر صاحب کی مخالفت اسی زمانے سے شروع ہو گئی تھی جب انھیں پہلا نگار ایوارڈ ملا تھا اور پھر یہ سلسلہ ہر شعبۂ حیات میں چلتا رہا۔ ریڈیو، ٹیلی وژن، فلم، مشاعرہ، تدریس ہر میدان میں ان کی مخالفت کی جاتی رہی۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بظاہر دوست بنے رہتے ہیں یا جو کسی کی انگلی پکڑ کر چلتے ہیں اور جب پیروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں تو در پردہ اسی کی مخالفت شروع کر دیتے ہیں۔ میں ان تمام حضرات کو نام بہ نام جانتی ہوں لیکن شاعر صاحب نے ان کا نام لینے سے منع کر دیا ہے۔ میں بھی جانتی ہوں کہ ان مخالفین کا منشاء کیا ہے:

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

نام و نمود کی خاطر ہی کچھ لوگ ایسی حرکتیں کرتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ وقت ہر چیز کا تجزیہ کر دیتا ہے اور وہ چھوٹی سی خوبی بھی جو قدرت ہر انسان کو عطا کرتی ہے اپنے ہی جسم کی گرد میں چھپ جاتی ہے۔ ایک دوست کی کرم فرمائی سے ان کی دوسری فلم ''منزل ہے کہاں تیری'' ادھوری رہ گئی۔ انھوں نے تیسری فلم ''گڑیا'' بنانے کا پروگرام بنایا اس کی تکمیل کے دوران اپنے ملک کا مقدر آڑے آ گیا ہمارے سیاست دانوں نے ملک توڑ دیا بنگلہ دیش وجود میں آ گیا پاکستان اور چھوٹا ہو گیا تھا۔ شاعر صاحب نے حالات کا اندازہ کرتے ہوئے یہ فلم ''بلیک اینڈ وہائٹ'' بنائی تھی۔ اس وقت اِکا دُکا فلمیں رنگین بنتی تھیں۔ ہندوستانی فلموں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمارے فلم سازوں نے یہ روش اختیار کی کہ زیادہ سے زیادہ کلر فلمیں بنائیں، اس وقت تک ٹی وی رنگین نہیں ہوا تھا اس لیے انڈیا کی فلمیں بھی بلیک اینڈ وہائٹ ہی نظر آتی تھیں۔ پھر ٹی وی بھی رنگین ہو گیا اور پاکستانی

فلموں کا یہ چارم بھی ختم ہو گیا۔ ''گڑیا'' بھی انھیں حالات کا شکار ہوئی۔ چناں چہ شاعر صاحب نے فلم انڈسٹری ہی چھوڑ دی وہ سندھ یونیورسٹی میں پڑھانے لگے۔ شاعر صاحب نے ہر کام بہت قرینے سے کیا۔ تعلیم سے ہمیشہ رشتہ جوڑے رکھا۔ اپنے بچوں کو بھی اعلیٰ تعلیم دلائی اور ہندوستان میں اپنے بھائی بہنوں کی تعلیم سے بھی غافل نہیں رہے۔ انھوں نے والد کی زندگی میں ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کر لی تھی۔

یہ ۱۹۶۴ء کی بات ہے، وہ ہندوستان جانے ہی والے تھے کہ ۱۹۶۵ء میں جنگ چھڑ گئی اور راستے بند ہو گئے۔ ۱۹۶۷ء یا ۱۹۶۸ء میں ان کے والد حمایت صاحب سے ملنے خود پاکستان آ گئے اور اپنی بہو اور بیٹے کو اپنے ارادوں میں کامیاب اور خوش حال دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ وہ دور شاعر صاحب کا فلم انڈسٹری میں کامیابی اور عروج کا دور تھا۔ انھوں نے شاہ فیصل کالونی میں اپنا مکان بھی بنوا لیا تھا۔ ان کے والد اُس وقت پاکستان اس غرض سے آئے تھے کہ اپنے تمام بچوں میں اپنی خاندانی جائیداد کو تقسیم کر دیں۔ جب انھوں نے یہ ارادہ ظاہر کیا تو شاعر صاحب نے انھیں منع کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ تو اپنی زندگی بنا چکے ہیں۔ بچے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں انشاء اللہ وہ بھی کچھ بن ہی جائیں گے اس جائیداد کی اُن کے چھوٹے بہن بھائیوں کو زیادہ ضرورت ہے اُن کی تعلیم شادی بیاہ سبھی کچھ باقی ہے آپ میرا حصہ بھی انھیں کو دے دیں۔ والد صاحب کے اصرار کے باوجود شاعر صاحب حصہ لینے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان کے والد اپنے بیٹے کی اس اعلیٰ ظرفی سے بہت متاثر ہوئے اور انھیں دعائیں دے کر پاکستان سے رخصت ہو گئے ۱۹۷۰ء میں وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد حمایت صاحب کئی بار اورنگ آباد گئے ان کی دوسری والدہ کا کچھ ہی برس پہلے انتقال ہوا ہے بہن بھائی سب ماشاء اللہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور مختلف عہدوں پر فائز ہیں اور اپنے گھروں میں خوش و خرم اور مطمئن زندگی گزار رہے ہیں شاعر صاحب ہمیشہ ان کی خوشیوں میں شریک رہے۔ خود شاعر صاحب کے آٹھ بچے ہیں، چار بیٹے چار بیٹیاں، یہ آٹھوں بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ شاعر صاحب نے اپنی منظوم سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' میں جو تقریباً ساڑھے تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے آخر میں ایک شعر، حاصلِ حیات کے طور پر لکھا ہے:

بس ایک کام کیا میں نے زندگی بھر میں

کہ سارے بچے ہیں تعلیم یافتہ گھر میں

ان کے پانچ بچے امریکا اور کینیڈا میں اور تین پاکستان میں مقیم ہیں اب وہ خود بھی اکثر ملک سے باہر رہتے ہیں۔ مشاعروں کے وسیلے سے انھوں نے ساری دنیا دیکھ لی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اپنے ہم عصر شعرا میں جتنے ممالک کی سیر حمایت صاحب نے کی ہے، اتنی شاید ہی کسی نے کی ہو۔ حمایت صاحب کہتے ہیں ''تقسیم ہند کے سبب ہندوستان میں اردو ہندی کے سہارے زندہ رہے گی اور وہ بھی صرف گفتگو کی حد تک، تحریری طور پر بہت محدود ہو جائے گی۔ مغربی دنیا میں ''رومن'' کے سہارے کچھ عرصے پڑھی جائے گی پھر یہاں کوئی بولنے والا بھی نہ ہوگا۔'' اس خیال سے کچھ لوگوں کو اختلاف بھی ہو سکتا ہے، بہر حال فیصلہ تو وقت ہی کرے گا۔ حمایت صاحب کے خیال کے مطابق اردو صرف پاکستان میں ہی باقی رہے گی، اس لیے کہ یہاں کی علاقائی زبانوں کا رسم الخط بھی فارسی سے مستعار ہے۔

شاعر صاحب کی اب تک جو شعری کتب شائع ہوئی ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ ''آگ میں پھول۔ مٹی کا قرض۔ ہارون کی آواز، چاند کی دھوپ اور تشنگی کا سفر'' (طویل افسانوی اور تمثیلی نظموں کا مجموعہ) ایک فلمی نغمات کا مجموعہ ''تجھ کو معلوم نہیں'' ایک قومی نغموں کا مجموعہ ''جاگ اُٹھا ہے سارا وطن'' اور ایک منظوم سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ''۔ ایک منتخب کلام کا مجموعہ ''حرف حرف روشنی'' ہے اور اب ان کا کلیات بھی شائع ہو گیا ہے۔ شاعر صاحب نے حیدر آباد سندھ کے ایک یادگار انڈو پاک مشاعرے کا انتخاب بھی مرتب کیا ہے۔ ''دود چراغ محفل'' کے نام سے اردو کی سات سو سالہ نعتیہ شاعری کا انتخاب بھی ''عقیدت کا سفر'' کے نام سے کیا ہے۔ اس کے دو حصے ہیں ایک چھپ چکا ہے دوسرے کا انتظار ہے۔ یہ انتخاب سندھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے رسالے ''صریر خامہ'' کے ''نعت نمبر'' کے لیے کیا گیا تھا اس رسالے کے دو نمبر شاعر صاحب نے خود مرتب کیے تھے۔ ایک یہی ''نعت نمبر'' تھا اور دوسرا ''اقبال نمبر'' دونوں رسالے اپنے موضوع اور مواد کے حوالے سے منفرد ہیں۔

ان کی نثری کتابیں چار ہیں۔ ایک سندھی کے جدید اور عہد آفریں شاعر ''شیخ ایاز'' کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں ہے۔ دوسری ضخیم کتاب ''شخص و عکس'' ان کے تنقیدی مقالات اور مختلف ادبی مباحث پر مشتمل ہے۔ تیسری کتاب دکن کے اہلِ قلم سے متعلق ہے۔ اس کا نام ہے ''کھلتے

کنول سے لوگ''۔

اس کتاب کے بھی دو حصے ہیں پہلا حصہ چھپ گیا ہے۔ چوتھی کتاب ''کچھ پیش رو کچھ ہم سفر'' کے نام سے ان کے مختلف مقالات کا مجموعہ ہے۔ حمایت صاحب نے ٹیلی وژن اور ریڈیو پر بھی تاریخی اور تحقیقی موضوعات پر مسلسل پروگرام پیش کیے ہیں۔ مثلاً ''خوشبو کا سفر'' (علاقائی زبانوں کے شعرا کا پانچ سو سالہ اردو کلام) ''محبتوں کے سفیر'' (سندھی شعرا کا اردو کلام) ''لب آزاد'' (پاکستان میں احتجاجی شاعری کے پچاس سال کا انتخاب) ''نشید حریت'' تحریکِ آزادی میں اردو شاعری کا حصہ (۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک) اسی طرح اردو کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا تاریخ وار مطالعہ بھی انھوں نے پیش کیا۔ حمایت صاحب کے کلام کا انگریزی کے علاوہ سندھی، ہندی اور انڈیا کی علاقائی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ امن عالم پر ان کی طویل نظم ''بنگال سے کوریا تک'' کے دو انگریزی ترجمے میں ایک "Flower In Flames" ترجمہ نگار پروفیسر راجندر سنگھ ورما (پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ) دوسرا "Flute And Bugle" ترجمہ نگار پرکاش چندر (ریذیڈنٹ ایڈیٹر ٹائمز آف انڈیا، لکھنؤ) سندھی ترجمے کا نام ''گل باہ مہ'' ہے جو پروفیسر ایم۔ ای، عالمانی نے کیا ہے۔ ''حرف حرف روشنی'' (کلام کا انتخاب) کا ترجمہ انگریزی میں راجندر سنگھ ورما نے "Every Word A Glow" کے نام سے اور ہندی ترجمہ ''شبد شبد پرکاش'' کے نام سے قاضی رئیس نے کیا دوسرا ترجمہ مسز بھکتل نے کیا جن کا تعلق مہاراشٹر سے ہے۔

حمایت علی شاعر کے ریڈیو اور اسٹیج ڈراموں کا بھی ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ ''حمایت علی شاعر کے ڈرامے'' مرتبہ انور جبیں قریشی) ان ڈراموں کے سندھی میں ''حمایت علی شاعر جا ڈرامہ'' کے نام سے ترجمہ ہو چکے ہیں۔ ان کی شاعری اور شخصیت پر کئی رسائل نے گوشے شائع کیے ہیں لیکن ایک ضخیم ادبی مجلّہ ''شخصیت'' (حمایت علی شاعر نمبر) کے نام سے بھی شائع ہو چکا ہے۔ جو انور جبیں قریشی نے مرتب کیا ہے۔

مختصر یہ کہ حمایت علی شاعر ایک فعال شخصیت کا نام ہے۔ ان کی کئی کتابیں ابھی زیرِ طبع ہیں جن میں نعمات اور گیت بھی ہیں اور منظوم و منثور ڈرامے بھی۔ تنقیدی اور تحقیقی مضامین بھی ہیں اور گیتوں بھری کہانیاں اور تلاشیاں بھی ہیں۔ یوں تو وہ اپنا سفرنامہ لکھنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں جس کے لیے ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔

باب دوم

حمایت علی شاعر بحیثیت شاعر

اپنی شاعری کے آغاز اور اس کے محرکات کے بارے میں حمایت صاحب نے ایک خاص بات بڑے شاعرانہ انداز میں کہی تھی۔ ''سعادت حسن منٹو کے ساتھ مجھے کرشن چندر بھی اچھے لگتے تھے ان کی نثر بڑی خوب صورت ہوتی ہے، شاید اسی سے میرے اندر کے ''منہ بند شاعر'' کو لکھنے کی ترغیب ملی ایسا لگتا ہے کہ پیاس کی شدت سے میری روح، ادب کے 'صفا و مروہ' پر پانی کی تلاش میں سرگرداں تھی کہ زمین کی مامتا کو جوش آ گیا اور مجھ میں شاعری کا چشمہ پھوٹ پڑا میں شعر کہنے لگا''۔ حقیقت بھی یہی محسوس ہوتی ہے۔ میں پہلے بیان کر چکی ہوں کہ حمایت صاحب کے گھرانے میں کوئی شاعر نہیں تھا ان کے دادا فوج میں تھے اور والد پولیس میں۔ دوسرے رشتہ داروں میں زیادہ تر مولوی، مُلّا یا قاضی اور فقیہہ تھے، شاعری سے کسی کا تعلق نہیں تھا۔ حمایت صاحب کی ذات میں یہ خصوصیت ممکن ہے کہ ان کی مرحوم والدہ کی طرف سے آئی ہو کہ وہ بچپن ہی میں اپنی والدہ کی شفقت سے محروم ہو گئی تھیں۔ محرومی انسان کو حساس بنا دیتی ہے لیکن قدرت ایسے بندوں کو غیر معمولی حوصلہ بھی عطا کرتی ہے۔ حمایت صاحب بھی تین برس کی عمر میں ماں کی محبت سے محروم ہو گئے تھے اللہ نے انھیں کچھ زیادہ ہی قوتِ برداشت سے نوازا تھا اور یوں ''حساس طبیعت''، ''تنہائی کی رفاقت'' اور ''مسلسل صعوبت'' نے انھیں ''شاعر'' بنا دیا۔ جذبہ و احساس کی شدت نے اظہار کی مختلف راہیں تراشیں تو پہلے وہ افسانہ نگار بن گئے اور پھر شاعر۔

ان کے گھرانے میں کوئی بھی شاعر نہیں تھا اس لیے اس خلاف توقع واقعہ کی بناء پر ان کا مذاق اُڑایا گیا اور جب لفظ ''شاعر'' ایک تمسخر اور ایک طنز بن کر ان کی خاندانی تضحیک پر اتر آیا تو حمایت صاحب جن کے مزاج میں بغاوت کا عنصر پہلے سے تھا، تو انھوں نے چیلنج کے طور پر اس ''کم عزت پیشے'' کو قبول کر لیا اور فخر کے ساتھ اپنے نام کا حصہ بنا لیا۔

وہ ''حمایت تراب'' سے ''حمایت علی شاعر'' ہو گئے۔ حمایت صاحب نے اس سلسلے میں ''آئینہ در آئینہ'' میں ایک جگہ لکھا ہے۔

کسی نے طنز سے جب مجھ کو کہہ دیا شاعر — تو میں نے ضد میں تخلص ہی رکھ لیا شاعر
بجائے ''میر'' تخلص ہے آج نام کے ساتھ — کہ رشتہ جوڑ لیا میں نے یوں عوام کے ساتھ

انھوں نے اپنی ابتدائی ادبی، سیاسی اور مذہبی تربیت کے بارے میں اپنے انگریزی کے استاد اختر الزماں ناصر پر اپنے ایک مضمون میں یہ بات واضح کی ہے۔

''میری ذہنی تربیت کے اب دو مرکز بن چکے تھے۔ ایک اختر صاحب کی محفلیں اور دوسرا پیپلز بک ہاؤس۔ چناں چہ ذہن کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ سیاست، مذہب، تاریخ اور ادب۔ سبھی موضوعات پر دماغ سوچنے لگا اور کئی بند کھڑکیاں اور دروازے کھلنے لگے۔ گفتار میں جرأت بھی آتی گئی۔ جذبات میں ہیجان رہنے لگا اور عمر کے مطابق جوش و خروش میں اضافہ ہوتا گیا۔ چناں چہ میں نے شاعری شروع کر دی۔ اس وقت مخدوم محی الدین کی آواز پہلے ہی ریاست میں گونج رہی تھی میں بھی مخدوم کا ہم نوا ہو گیا اور جوشیلی نظمیں کہنے لگا''۔

اپنے ایک اور مضمون ''پودے اور مسلم ضیائی'' میں حمایت صاحب لکھتے ہیں۔

''ان دنوں علامہ اقبال کا نام میرے لیے حرف اوّل تھا، اس کے بعد نیاز فتح پوری اور پھر مخدوم محی الدین۔ یہ تین ناموں کا ایک مثلث تھا جس میں زاویہ، قائمہ ہمیشہ علامہ اقبال رہتے۔ بمبئی کے رسالے ''قومی جنگ''، ''نیا ادب'' اور نظام کے علاوہ حیدرآباد کا ''سویرا'' اور روزنامہ ''پیام'' (ایڈیٹر قاضی عبدالغفار) بھی میرے مطالعے میں رہتے اور میں ترقی پسند ادیبوں سے ایک ذہنی قرب محسوس کرتا''۔

لیکن شاہدہ حسن کے ایک مضمون ''داستان رنگ و سنگ کا شاعر'' میں ان کی ایک نظم ''ظہور قدسی'' کے کچھ اشعار سے ان کی مذہب سے وابستگی کا بھی سراغ ملتا ہے۔ یہ نظم (بحوالہ انٹرویو ''چہارسو'' راولپنڈی) غالباً ۱۹۴۷ء میں ایک مذہبی رسالے ''الارشاد'' میں شائع ہوئی تھی۔ حمایت صاحب سے دریافت پر معلوم ہوا کہ یہ نظم ۱۹۴۶ء میں چھپی تھی۔

یک بہ یک ابھرا زمیں سے آفتاب چارہ ساز
عارف و شیطان کش و باطل شکن، بندہ نواز

واقف سرِ کن و دانائے راز زندگی
جلوہ فرما پیکر خاکی میں نور ایزدی
خاک پر تو نے کھلائے پھول اے ابر کرم
یہ خزاں آباد دنیا بن گئی رشکِ ارم

اس نظم کے حوالے سے حمایت صاحب نے ''چہارسو'' میں ایک دل چسپ واقعہ بھی لکھا ہے'' (نظم کا) انداز بیان ایسا تھا کہ مدیر محترم کو میری عمر کا اندازہ نہ ہو سکا (رسالے میں) شاعر کا نام لکھا تھا ''مولوی میر حمایت علی شاعر اورنگ آبادی''۔ بس پھر کیا تھا۔ اسکول سے شہر تک میرا نام ''مولوی'' پڑ گیا۔ اب ''شاعر صاحب'' کی بجائے مذاقاً مجھے ''مولوی صاحب'' پکارا جانے لگا۔ کچھ دوست ''کامریڈ مولوی'' کہتے۔

حمایت علی شاعر کا ذہن بچپن ہی سے باغیانہ تھا۔ اس کی کچھ مثالیں ان کے افسانوں کے حوالے سے میں نے فراہم کی ہیں۔ ''آئینہ در آئینہ'' میں اشعار کی صورت میں بھی انھوں نے اپنے اس دور کا احوال لکھا ہے۔

بس ایک میں تھا گھرانے میں ناخلف ایسا — بنا ہوا تھا ہر اک فرد کا ہدف ایسا
کہ میرا نام بھی سننا انھیں گوارا نہ تھا — وہ کیا برائی تھی جس کا میں استعارہ نہ تھا
سبب یہ تھا کہ مجھے اختلاف تھا سب سے — میں اپنے گھر میں خود اپنا رقیب تھا کب سے
میں اپنی عمر کے لڑکوں سے مختلف تھا بہت — ہر اک روایت کہنہ سے منحرف تھا بہت
کتابیں پڑھتا تھا ایسی جو باغیانہ تھیں — سبھی بزرگوں کی نظر میں کافرانہ تھیں

دراصل حمایت صاحب کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی تھی کہ ان کا یہ ''باغیانہ پن'' فطری امر تھا۔ وہ اس لیے کہ ہمارے متوسط گھرانے جہاں تعلیم بھی نہ ہو، جہاں روایتی اور جاہلانہ عقاید تواتر اور تسلسل کے ساتھ نسل در نسل بطور ورثہ منتقل ہو رہے ہوں، ایسے گھرانوں میں جتنی بھی برائیاں ہوں وہ کم ہیں۔ حمایت صاحب نے اپنی سوانح حیات میں اس کا تفصیل سے اظہار بھی کیا ہے۔

مگر کچھ ایسے بھی تھے اقربائے درد نواز — جو بن گئے تھے بہت پیار سے مرے ہم راز
کبھی تو دیتے بیری کا واسطہ مجھ کو — کبھی نیا ہی دکھاتے تھے راستہ مجھ کو
کبھی سراب سا آئینۂ متاعِ خلوص — کبھی وہ لفظ کہ مفہوم ہی بہت مخصوص

کہیں یقیں میں گماں کی لطیف آمیزش　　کہیں گماں میں چمکتے یقین کی تابش
کہیں وفاؤں میں تھوڑی سی بے وفائی بھی　　کہیں ادائے محبت میں کج ادائی بھی
امانتوں میں خیانت، دیانتیں جھوٹی　　خدا کے نام پہ ساری عبادتیں جھوٹی
گھرے ہوئے تھے تضادوں میں ظاہر و باطن　　بس ایک جال تھا جس سے رہائی ناممکن

حمایت علی شاعر کے دل کا ''ابال'' بھی ان کی شاعری میں رواں ہوگیا۔ مذہبی روایتی عقائد، مذہبی مذموم شخصیتیں، جن کے خلاف علامہ اقبال کے اشعار نے بھی راہ ہموار کردی تھی۔

اور خاص طور سے علامہ کی نظم ''ملا اور بہشت'' سے کچھ اشعار برائے لطف سخن یہاں لکھ رہی ہوں:

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا
حق سے جب حضرت مُلّا کو ملا حکم بہشت
عرض کی میں نے، الٰہی مری تقریر معاف
خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت
ہے بد آموزی اقوام و ملل کام اس کا
اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

اس کے بعد مخدوم کے ایسے مصرعے کہ:

خدا سویا ہوا ہے جل رہی ہے شمع شیطانی

حمایت صاحب کے ذہن پر کس طرح کے اثرات مرتب کرتے ہوں گے۔ اس پر علامہ نیاز فتح پوری کے رسالے ''نگار'' کی مذہبی بحثیں۔ کریلا اور نیم چڑھا کے مصداق ایک نوجوان ذہن کو اچھا خاصا میدان جنگ بنائے رکھتی ہوں گی اور بحکم اقبال: ''جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو'' ان کا ذہن ان کے دل کے ''نقش کہن'' کو نہ صرف مٹا دینے پر تیار ہوتا ہوگا بلکہ کبھی کبھی ''چراغ دیر و حرم'' تک بجھا دینے کی بابت سوچتا ہوگا۔

ان کی ایک نظم ''تقدیر'' (مطبوعہ۔ سویرا۔ حیدر آباد دکن شمارہ ۹، ۱۰۔ ۱۹۴۷ء) پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں وہ کیا سوچنے لگے تھے۔ دو شعر ملاحظہ کیجیے:

تقدیر

ایک بنت جہل، زرداری کا پروردہ خیال
عرش و کرسی کے پس پردہ ملوکیت کی چال

نوچ ڈالے جس نے شاہینِ خرد کے بال و پر
تنگ تر کر دی تھی جس نے وسعتِ قلب و نظر

سوشلزم اور مارکسزم سے متعلق کتابوں کے مطالعے کا فائدہ انھیں یہ ہوا کہ وہ زندگی کا محض تاریک رخ ہی نہیں دیکھتے بلکہ ان کی نظر روشن رخ پر بھی رہتی تھی۔ بقول ان کے ''انقلاب روس پر علامہ اقبال کی طویل نظم ''خضر راہ'' کا یہ شعر میرے وردِ زبان رہتا تھا۔''

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

حمایت صاحب خود بھی ایسے ہی شعر کہتے تھے:

سامراجی بربریت کے تلے کچلے ہوئے
ہند کے مردہ دلوں کو پھر سے گرمائیں گے ہم

ان کی ایک نظم ان کے جوش و خروش اور جذبۂ حریت کی آئینہ دار ہے۔ (مندرجہ ذیل نظم غالباً انھوں نے ۱۵ اگست (یوم آزادی ہند) کے بعد کہی تھی)

مسافر خنک چھاؤں پا کر نہ دم لے مسافر

مسافر یہ چھاؤں نہیں تیری منزل　　نہ دم لے ابھی اور بھی ہیں مراحل
تمدن، حکومت، معابد، عقائد　　پس پردہ ہیں سیکڑوں تیرے قاتل
مسافر ابھی دور ہے تیری منزل

یہ نظم کافی طویل ہے، اور مرزا سلیم بیگ نے اپنی کتاب ''احوال واقعی'' (مطبوعہ ۱۹۹۴ء) میں بھی حمایت صاحب کے ابتدائی کلام کے طور پر منتخب کی ہے۔

یہ دور ریاست میں رضا کار تحریک کے عروج کا دور تھا۔ اکثر ترقی پسند ادیب بھی مجلس اتحاد المسلمین کے پلیٹ فارم پر چلے گئے اور وہ قاسم رضوی کی رہنمائی میں ایک ''آزاد مسلم مملکت یا ہندوستان کے جنوب میں ''ایک اور پاکستان'' کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ہفتہ وار ''پرچم'' اور ''آزاد حیدر

آباد'' میں ابراہیم جلیس کے کالم پابندی سے شائع ہوتے جن میں کانگریس کے خلاف اتحاد المسلمین کی حمایت میں مختلف فرقہ وارانہ خیالات کا اظہار ہوتا تھا۔ یہ کالم پھر ایک کتاب ''ترنگے کی چھاؤں میں'' کے نام سے شائع بھی ہوگئے۔ یہ اور بات کہ حیدرآباد پر ہندوستان کے قبضے (ستمبر ۱۹۴۸ء) کے بعد جب ابراہیم جلیس پاکستان آگئے اور یہاں کے ترقی پسندوں کے درمیان رہ کر انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انھوں نے ایک یادگار رپورتاژ ''دو ملک ایک کہانی'' کے نام سے لکھا اور کالموں کے مجموعے ''ترنگے کی چھاؤں میں'' کو Dis Own (عاق) کر دیا۔ جب کہ نئے شعرا اور حمایت علی شاعر اپنے انداز میں شاعری کرتے رہے۔

حمایت صاحب انھی باغیانہ اور پرشور نظموں کے سبب کافی مشہور ہوگئے تھے۔ مشاعروں میں بھی وہ خوب کامیابیاں حاصل کر رہے تھے اور ترقی پسند رسالوں میں بھی تواتر کے ساتھ شائع ہوتے۔ اس وقت بھی ہفتہ وار ''شاہد'' (بمبئی) کے کچھ شمارے میرے سامنے ہیں۔ یہ رسالہ بھی ترقی پسند ادب کا ترجمان تھا۔ اس میں کرشن چندر، مجروح سلطان پوری، مسلم ضیائی، مہندر ناتھ، ظ انصاری، ملک راج آنند، سری نواس لاہوٹی، فکر تونسوی، خلیل الرحمٰن اعظمی، رفعت سروش، شریف عنایت اللہ (انور عنایت اللہ)، باقر مہدی، قمر احمد فاروقی (قمر جمیل)، احمد حمید (اے حمید)، سہیل ادیب (ادیب سہیل) اور کبھی کبھی جوش ملیح آبادی تک شائع ہوتے تھے۔ ان شماروں میں حمایت صاحب کی نظمیں زیادہ تر پہلے صفحے پر چھپی ہوئی ہیں۔

۳ر اپریل ۱۹۴۹ء کو ''ایک منظر'' کے عنوان سے ایک نظم شائع ہوئی تھی۔ جس کے توسین میں لکھا تھا (تخیل۔ حقیقت اور روایتی شاعر) یہ بڑی دل چسپ اور خیال انگیز نظم ہے۔ پہلے اور دوسرے بند میں ایک رات کا خوب صورت منظر کھینچا گیا ہے، تیسرے اور چوتھے بند میں روایتی شاعر کے انداز فکر کی جھلک ہے۔ پانچویں سے نویں بند تک معاشرے کے موجود مسائل کی تصویر اور تجزیہ اور دسویں اور گیارہویں بند میں شاعری اور شاعر کے فرائض بتانے کے بعد روایتی انداز شعر گوئی پر وقت کا فیصلہ۔ حمایت صاحب کے انداز سخن کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے چند اشعار:

(منظر)

چودھویں کا چاند ہے یا حسنِ کافر بے نقاب
خاک کے ذرّے ہیں یا انوار کے روشن حباب

چاندنی چنکی ہے یا گردوں سے گرتی ہے شراب
تنکے تنکے پر جوانی، ذرے ذرے پر شباب

(اندازِ فکر)

کون کہتا ہے کہ یہ دنیا ہے ایک دارالمحن
آدمی پہنے ہوئے ہے زندگی ہی میں کفن
مفلسوں کے بک رہے ہیں کوڑی کوڑی میں بدن
من کی دنیا مر چکی ہے آج کل زندہ ہے دھن

تیس (۳۰) اشعار کی اس نظم کے ان چند اشعار سے حمایت صاحب کی شعر گوئی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان پر جوش کے زیر اثر مخدوم، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، ظہیر کاشمیری اور مجاز کے بھی اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ ان سب شعرا کا ایک ہی انداز نگارش تھا، نئی نسل ان شعرا کا اثر شدت سے قبول کر رہی تھی۔

ریڈیو کی سروس کے سبب حمایت صاحب تھوڑی سی احتیاط سے بھی کام لے رہے تھے جو ان کے معاشی حالات کا تقاضہ تھا۔ ملازمتوں میں اکھاڑ پچھاڑ جاری تھی۔ حمایت صاحب کا تعلق رضا کار تحریک سے نہ ہونے کے باوجود اندیشہ تھا کہ اقتدار کی اندھی لاٹھی ان پر بھی نہ برس پڑے۔ ریاست میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی پہلے سے عائد تھی اور تلنگانہ تحریک کے سبھی لیڈر عرصے سے انڈر گراؤنڈ تھے۔ کانگریس حکومت کے زیر عتاب جہاں اتحاد المسلمین کے صدر قاسم رضوی اور ان کے رضا کار تھے، وہیں تلنگانہ تحریک کے کمیونسٹ رہنما بھی حکومت کی زد میں تھے۔

دراصل تلنگانے کی اس تحریک کی بناء پر ریاست کے بادشاہ میر عثمان علی خاں بھی بری طرح خوف زدہ تھے جاگیرداری نظام کی کٹر مخالف، کمیونسٹ پارٹی نے تلنگانے کے کھیت مزدوروں اور کسانوں کو ہتھیار بند لڑائی پر اکسا رکھا تھا۔ کرشن چندر کی کتاب ''جب کھیت جاگے'' اسی دور کا رپورتاژ ہے جو شائع ہو کر سارے ہندوستان کے ادبی حلقوں کی توجہ کا مرکز بن چکا تھا۔

اس دور میں حمایت صاحب نے ایک قلمی نام بھی اختیار کر رکھا تھا۔ ''نردوش'' (اس کا ذکر میں پہلے کر چکی ہوں) اس نام سے ان کی بعض نظمیں ہندوستان کے مختلف رسالوں میں چھپ چکی تھیں۔

فی الحال میرے سامنے جو شمارہ ہے اس میں حمایت صاحب کی ایک نظم شائع ہوئی ہے۔ ''تلنگانہ'' کے عنوان سے:

یہ سرخ دھرتی جو آج تپ تپ کے سرخ انگارہ بن گئی ہے
اسی سے پھوٹے ہیں وہ شرارے جو خرمن زر جلا رہے ہیں
ہزار بادل گرج رہے ہیں ہزار بجلی کڑک رہی ہے
ہزار طوفان اٹھ رہے ہیں مگر یہ بڑھتے ہی جا رہے ہیں
نہ فکر امروز ہے انھیں اور نہ یاد ماضی ستا رہی ہے
نظر میں مستقبلِ درخشاں کی ضو ہے جو رہ دکھا رہی ہے

اسی زمانے میں حمایت علی شاعر نے پچاس ساٹھ اشعار پر مشتمل ایک نظم ''کوریا'' کے عنوان سے لکھی جو بہت جوشیلی تھی۔ وہ نظم حیدرآباد دکن کے ایک ماہنامے ''آدمیت'' میں شائع ہوئی تھی جس کے مدیروں میں عزیز قیسی کے ساتھ وہ خود بھی شامل تھے۔

اس قسم کی دیگر نظمیں اور قطعات ہفتہ وار ''شاہد'' اور ''نظام'' (بمبئی)، ماہنامہ ''جادہ'' اور ''افکار'' (بھوپال)، اور ''ضرب کلیم'' (کلکتہ) میں شائع ہوتی رہیں اب ان کی نقلیں بھی حمایت صاحب کے پاس نہیں ہیں۔ ان کے پہلے مجموعۂ کلام ''آگ میں پھول'' میں صرف ''شہکار'' اور ''ایشیا'' ہے جو بہت پہلے ۲۲ مئی ۱۹۴۹ء کو ہفتہ وار ''شاہد'' (بمبئی) میں ''بیداری'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ پھر اس عنوان میں قدرے ترمیم کے ساتھ اپریل ۱۹۸۱ء میں ''ادب لطیف'' (لاہور) میں چھپی اور ''آگ میں پھول'' کے دوسرے ایڈیشن (۱۹۸۱ء) میں اس کی شکل اور ہے۔ عنوان بھی بدل دیا گیا یعنی ''ایشیا''۔ حمایت صاحب خوب سے خوب تر کی جستجو میں اکثر اپنی نظموں اور غزلوں پر نظر ثانی کرتے رہتے ہیں نتیجتاً تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔

اس نظم کو ''شاہد'' سے یہاں نقل کرتی ہوں:

بیداری

آخرش جاگ اٹھا صبح کی کرنوں کا شعور
شب کے پروردہ ستاروں کا فسوں ٹوٹ گیا

اک کرن پھوٹ کے چمکا گئی گلشن کا نصیب
دستِ صرصر سے ہر اک دامنِ گل چھوٹ گیا
کل تلک سرد تھی جن ذروں کے احساس کی آگ
آج تپ تپ کے وہ خورشید ہوئے جاتے ہیں
جن کو کچلا گیا صدیوں سے وہ بے جان عوام
انقلابات کی تمہید ہوئے جاتے ہیں
ہر طرف لرزہ براندام ہیں فاشزم پرست
انڈیا، چین، فلسطین، ملایا، برما
ہر طرف نغمۂ جمہور ہے شعلہ افشاں
ہر طرف آگ کے طوفان ہیں، خوں کے دریا
پھینکتے جاتے ہیں اندھیارے اجالوں پہ کمند
اور اجالے ہیں کہ بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں
کوئی اندیشہ فردا ہے نہ فکر امروز
سینۂ دہر پہ چڑھتے ہی چلے جاتے ہیں
فتح خود ان کے قدم لینے کو بڑھ آتی ہے
زندگی بے خود و سرشار ہوئی جاتی ہے

حمایت صاحب کا وہ دور گویا بڑا آتشیں دور تھا، ان کی ایک باغیانہ نظم جو کسی مذہبی موضوع سے متعلق تھی، وہ انھوں نے جب کسی مشاعرے میں پڑھی تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ اُس کا آخری شعر جو انھیں یاد تھا۔ یہ تھا:

غلط غلط نہ خدا ہے نہ کوئی عرشِ بریں
فقط قناعت، ادراک، لغزشِ تفہیم

اتفاق سے ڈاکٹر محی الدین قادری زور اس مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے، انھوں نے اس نظم کی مناسبت سے علامہ اقبال کے کچھ اشعار سنا کر جذباتی لوگوں کو کنٹرول کیا۔ اس مشاعرے کا ذکر

رسالہ ''ذہن جدید'' (دہلی) کے ایڈیٹر مشہور شاعر زبیر رضوی نے اپنی سوانح حیات ''گردشِ پا'' میں بھی کیا ہے۔ ماہنامہ ''سب رس'' حیدرآباد دکن (آندھراپردیش) میں جب اس سوانح کا یہ مخصوص حصہ..... شائع ہوا تو حمایت صاحب نے رسالے کے ایڈیٹر ڈاکٹر مغنی تبسم کو خط لکھا اور بعض غلط اشعار کی تصحیح کر کے اصل واقعہ بھی بیان کیا ہے، وہ خط بھی ''سب رس'' کسی شمارے میں چھپ چکا ہے۔

حمایت صاحب نے اپنے کسی مضمون میں اپنی ایک کتاب کے ضائع ہونے کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس کا نام تھا ''گھن گرج'' اور جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے وہ یقیناً ایسی ہی نظموں پر مشتمل ہوگی۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء میں جب آل انڈیا ریڈیو سے ان کی ملازمت ختم کر دی گئی اور احتجاجاً حمایت صاحب نے اخبار فروشی کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیا تو اُس زمانے میں یہ مجموعہ پریس میں تھا لیکن یکایک حمایت صاحب کو کچھ احباب نے ایک رسالہ ''نیا محاذ'' کی ادارت کے لیے بمبئی بلا لیا چناں چہ یہ کتاب شائع نہ ہو سکی اور ضائع ہوگئی۔ (اس رسالے کے اشتہارات ہفتہ وار ''پرواز'' (حیدرآباد دکن) کے مختلف شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ (۱۸ر نومبر ۱۹۵۰ء تا ۸ر جنوری ۱۹۵۱ء) اس کی مجلس ادارت میں ان کی بیگم معراج نسیم بھی شامل تھیں اور صفحۂ خواتین ترتیب دیا کرتی تھیں۔ ''آگ میں پھول'' میں ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۵ء تک ان کے کلام کا انتخاب ہے جس کے پہلے ایڈیشن میں (غالباً پاکستان کے وقتی مسائل کے خیال سے) انھوں نے اپنی کئی نظموں اور غزلوں کو شامل نہیں کیا تھا البتہ دوسرے ایڈیشن میں اس دور کا تقریباً سارا کلام یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن کے دیباچے اور پیش لفظ بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو ''میں اور میرا فن'' اور ''نقش ثانی'' کے عنوانات سے شائع ہوئے تھے اور اب مجلّہ ''شخصیت'' کے حمایت علی شاعر نمبر میں بھی محفوظ ہو چکے ہیں۔ ان مضامین کو پڑھ کر ان کے ادبی نظریات کو باآسانی سمجھا جا سکتا ہے بالخصوص زندگی اور اس کی سچائیوں کے بارے میں ان کا مخصوص نقطۂ نظر۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کے ہر خیال سے اتفاق کیا جائے مگر ان کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ان مضامین کا مطالعہ بھی بہت ضروری ہے۔ ''میں اور میرا فن'' میں وہ لکھتے ہیں۔

''شاعری میں میرا نقطۂ نگاہ کسی غیر معمولی انفرادیت کا حامل نہیں ہے۔ میں شعوری طور پر کسی ایسی جدّت کا طرف دار نہیں ہوں جو فن کار کا رشتہ اپنے عہد یا اپنے عہد کی زندگی سے توڑ لے۔ میرے

خیال میں جتنی اہمیت ایک زندہ روایت کی ہوتی ہے اتنی ہی ان اقدار کی بھی ہوتی ہے جنھیں عصر رواں جنم دیتا ہے۔ میرے نزدیک فن کار اپنے عہد کا نمائندہ انھیں معنوں میں ہوتا ہے اور ادب اپنے عہد کی تاریخ انھیں معنوں میں مرتب کرتا ہے کہ وہ اپنے عصر کی حقیقت کا ترجمان ہوتا ہے۔''

''ضروری ہے کہ حقیقت کی جستجو میں فکر کا رخ ''تاریخ'' کی روشنی میں متعین کیا جائے۔ تاریخ ادوار کے واقعاتی تسلسل کا نام نہیں بلکہ معاشرتی ارتقاء کے جدلیاتی ارتقاء کا نام ہے، جب تک ہم تاریخ کے مادی حقائق کی کسوٹی پر بحث طلب مسائل کو نہیں پرکھیں گے کھرے اور کھوٹے کا فرق ظاہر نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام جگر کو خون کر لینے کے مترادف ہے اور وہی فن کار اسے انجام دے سکتا ہے جو ادب کو دل کا مشغلہ نہیں بلکہ دماغ کی زندگی سے تعبیر کرتا ہو۔''

اسی کتاب میں پروفیسر ممتاز حسین کے ایک مضمون کا اقتباس بھی شامل ہے جو انھوں نے حمایت صاحب کی شاعری کے بارے میں لکھا تھا۔ ''حمایت علی شاعر نے خارجی حقیقت کو داخلی حقیقت میں تبدیل کیا ہے اور حقیقت کو مجاز سے چمکانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے کلام کی یہ خوبی ہر شخص کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے ان کی شاعری اگر ایک طرف اپنی خود نوشت سوانح عمری ہے تو دوسری طرف قومی تاریخ کا آئینہ بھی۔ ان کی آواز میں سکوت شب کا زیر و بم اور متلاطم سمندر کا مدوجزر دونوں ہی ہیں۔ وہ قوتِ گریہ اور قوت شعلہ دونوں ہی سے واقف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ نئے ادیبوں کی صف میں انھوں نے بہت جلد ایک نمایاں جگہ حاصل کر لی ہے۔''

''آگ میں پھول'' کے دوسرے ایڈیشن میں ''نقش ثانی'' کے عنوان سے حمایت صاحب نے جو دیباچہ لکھا ہے اس میں کچھ اعترافات بھی کیے ہیں۔ بالخصوص فلم انڈسٹری سے متعلق اپنی زندگی اور ان تحریروں کے حوالے سے جو انھوں نے معاشی ضرورت کے تحت لکھیں۔ یہ اور بات ہے کہ ریڈیو کی ملازمت کے دوران بھی انھوں نے جو کچھ لکھا اس کا بیشتر حصہ بھی معاشی ضرورت کے زمرے میں ہی آتا ہے۔ مثلاً بیشتر فیچرز، تقریریں، گیت اور نغمات وغیرہ، فرق صرف یہ ہے کہ وہ ایک سرکاری ادارے کے تحت قومی اور ملکی مسائل سے متعلق تحریریں ہیں، ظاہر ہے کہ وہ کمرشیل رائٹنگ کی تعریف میں نہیں آتیں۔ حمایت صاحب نے اپنی فلمی تحریروں کا تقابل ان مختلف شعرا کی تحریروں سے بھی کیا ہے جو ماضی میں بادشاہوں اور نوابوں کی تعریف میں لکھی گئیں اور جن کے عوض متعدد شعرا کو دولت سے نوازا گیا۔ ظاہر ہے کہ وہ کلام بھی ان شعرا کی معاشی ضرورت کا تقاضہ

تھا۔ حمایت صاحب لکھتے ہیں۔

''میں یہی سوچ کے خاموش ہو رہتا کہ وقت نے یہ سنگین مذاق صرف میرے ساتھ ہی نہیں کیا۔ تاریخ میں میرے جیسے کتنے شاعر و ادیب اپنے حالات سے مجبور ہو کر بازار میں جا بیٹھے۔ چاہے وہ بازار کسی بادشاہ کے دربار میں لگا ہو یا فلمی دنیا کے مصنوعی محلوں دو محلوں میں۔ بادشاہوں کی قصیدہ خوانی سے لے کر فلمی کرداروں کی سراپا نگاری تک ہر
بکنے والا حرف، علم و ادب کی توہین نہیں تو اور کیا ہے۔''

مگر ''درباری ادب آج بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اس لیے کہ ''شاہ پرستی'' ہمارے معاشرے میں ایک ''مثبت قدر'' سمجھی جاتی رہی ہے۔ اس میں مبالغہ بھی ہو تو اسے شاعر کی بلند خیالی سے تعبیر کیا گیا۔ اس کے برعکس ''فلمی شاعری'' اکثر معیاری اور دل کش ہونے کے باوجود ''مقام ادب'' بھی نہیں پا سکی۔ حمایت علی شاعر نے اپنے دیباچے میں فلمی شاعری کو اپنے ''زیاں'' سے تعبیر کیا ہے جس سے مجھے اتفاق بالکل نہیں ہے لیکن فی الحال میں انھی کے ایک شعر پر اس حصے کو ختم کرتی ہوں کہ:

بازار میں آئے ہیں تو بولی بھی اٹھے گی
فن، جنس ہی ٹھہرا ہے تو گاہک کی خطا کیا

☆☆

فکری پس منظر اور شعری اسلوب

حیدر آباد دکن میں شاہ پرستی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ بادشاہ کو ظل اللہ کہا جاتا تھا۔ ہر جمعہ کی نماز کے بعد خطبے میں امام صاحب خلفائے راشدین کے بعد میر عثمان علی خاں نظام دکن کا نام لیتے اور اسے بھی ان کی صف میں شریک کر دیتے تھے۔ حمایت صاحب کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہونا فطری تھا کہ خلافت اور بادشاہت دو مختلف چیزیں ہیں یا ایک ہی چیز کے دو نام ہیں؟ اسکول میں کبھی کسی صاحب علم استاد نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے بادشاہت کے خلاف ''جمہوریت'' کی راہ ہموار کی اور پھر عبدالماجد دریا آبادی کا یہ جملہ بھی ان کی نظر سے گزر چکا تھا۔ ''اسلام میں اگر اجتہاد کا عمل جاری رہتا تو دنیا کو سوشلزم کی ضرورت

پیش نہ آتی''۔

حمایت صاحب نے یہ بات اپنے ایک انٹرویو میں بھی دہرائی ہے۔

بقول ان کے جب فکر جامد ہو جاتی ہے تو ''بت'' بن جاتی ہے۔ اسلام نے اسی لیے ''بت شکنی'' کی تعلیم دی تھی کہ مسلمان فکری جمود کے شکار نہ ہوں۔ بدقسمتی سے ہم صدیوں سے اسی کے شکار ہیں۔ عقیدت، فکری جمود ہی کی مظہر ہوتی ہے۔ اس میں عقل کی رسائی بند ہو جاتی ہے اور یہاں تک کہہ دیا جاتا ہے کہ عقل ہی سارے فساد کی جڑ ہے اور ایسے خیالات جنم لیتے ہیں کہ:

عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے

ہر برائی عقل سے منسوب کر دی جاتی ہے۔ یعنی وہ فضیلت جس کی بناء پر آدم کو فرشتوں نے سجدہ کیا۔ انسان دشمن سمجھی جاتی ہے۔ فرشتوں کو انسان سے بہتر سمجھا جاتا ہے تاکہ اس کے ضمیر میں ''بندگی'' شامل کر دی جائے اور وہ ''بادشاہِ وقت'' کا تابع ہو کر رہ جائے۔ امام حسینؓ کی شہادت کے بعد اسلام کی پوری تاریخ ''بادشاہت'' کی تاریخ ہے اور ہر بادشاہ نے لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے اپنے نام سے پہلے لفظ ''خلیفہ'' استعمال کیا ہے اور اس کے خلاف ہمیں کہیں کوئی احتجاج بھی نہیں ملتا۔ اس لیے کہ امامانِ وقت اور علمائے مساجد نے خلیفہ اور بادشاہ کے تضاد کو نمایاں ہی نہیں کیا بلکہ حکمِ حاکم کو ''حکمِ ربانی'' کے مترادف قرار دے دیا۔ ایسے معاشرے میں لوگوں کو عقل سے خوف زدہ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ چناں چہ مسلمان جتنا عقل سے دور ہے اتنا شیطان سے بھی نہیں۔ وہ عقل کو شیطان کا تابع سمجھتا ہے۔ مسلم امہ کے اندر تخلیقی فکر کا فقدان اسی طرزِ عمل اور طرزِ تعلیم سے پیدا ہوا ہے۔ بیسویں صدی میں مغرب سے جو فکری رو، مشرق کی طرف آئی اور سر سید ''جیسے'' بزرگوں نے ''عقلیت'' کو جو رواج دیا اور اقبال سے جوش تک جو تحریک آگے بڑھی، جمود پرست حضرات کی مخالفت کے باوجود ہمارے ادبی ماحول میں عام ہوتی گئی۔ حمایت صاحب کی فکری تربیت میں سرسید اور اقبال کی تعلیمات بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کا افسانہ ''بدلتے زاویے'' جو ایک طرح سے انھی کی آپ بیتی کا ''ایک واقعہ'' ہے اس طرزِ فکر کا سراغ دیتا ہے۔ شاعری میں اس کا ظہور ان کی نظم ''تقدیر'' سے ہوتا ہے۔ اس نظم کے پس منظر میں بھی علامہ اقبال کا یہ شعر یقیناً کارفرما نظر آتا ہے:

ستارہ کیا تری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیِ افلاک میں ہے خوار و زبوں

انھوں نے ''تقدیر'' کو ''بنتِ جہل'' کہا تھا۔ ''ایک بنتِ جہل زرداری کا پرورہ خیال'' یہ نظم حمایت صاحب کے کسی مجموعۂ کلام میں نہیں ہے لیکن ان کے پہلے شعری مجموعے ''آگ میں پھول'' کی بعض رباعیات سے ان کے فکری پس منظر کا سراغ مل جاتا ہے۔

فطرت کے تلون کو نہ کھونے دیجیے
میں روتا ہوں چلیے مجھے رونے دیجیے
لیکن مرے سرکار، بنام تقدیر
انسان کو حیوان نہ ہونے دیجیے

☆☆

ہر نقش سے اک خواب مجسم ابھرا
ہر ذرے سے اک ساختہ عالم ابھرا
قدرت کی حقیقت کا ملا جب بھی سراغ
ہر عکس سے عکسِ رخِ آدم ابھرا

''سورج'' ہماری شاعری میں اکثر نئے دور کے آغاز بلکہ کسی انقلاب کی نمایندگی کرتا ہے۔ مثلاً

افق سے آفتاب ابھرا، گیا دورِ گراں خوابی

(اقبال)

شب کے ماتھے پہ یہ آزردہ ستارہ کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے

(مخدوم)

حمایت صاحب کے مصرعے میں ''سورج'' ایک ''منفی کردار'' نظر آتا ہے۔ میں سوچتی ہوں اس اندازِ فکر میں کہیں ریاست کے بادشاہ عثمان علی خاں کا اثر تو نہیں؟ عوام بادشاہ کے تابع ضرور ہوتے ہیں مگر بادشاہ مر جاتا ہے اور عوام زندہ رہتے ہیں ''رات سورج کو نگل سکتی ہے تاروں کو نہیں۔''

بادشاہت یا آمریت کے خلاف غالباً یہ پہلا علامتی اظہار تھا اور یہی علامت ان کی نظم ''مزار قائد پر'' کے ان اشعار میں پاکستان کے حکمرانوں پر بھی منطبق ہوتی ہے۔

یہ زعم اوج فلک لاکھ بے نیاز رہے
یہ آفتاب ستاروں کے بیچ ہے کہ نہیں
مہ و نجوم کی تابانیاں ہیں کم لیکن
مہ و نجوم کی تابانیوں کو موت نہیں

اور جب ۱۹۵۹ء میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے پاکستان میں پہلی بار مارشل لاء عائد کیا اور فوجی آمریت کی بنیاد ڈالی تو حمایت صاحب نے ایک نظم ''ایک منظر ایک سوچ'' کے عنوان سے لکھی تھی جس کے آخری اشعار یہ تھے۔

سوچتا تھا میں کہ دیکھا رات ساری کٹ گئی
ایک سورج ناگہاں ابھرا بصد جاہ و جلال
چاند کی دولت سحر کے غاصبوں میں بٹ گئی

☆☆

سورج اپنی کامرانی پر بہت مغرور ہے
سوچتا ہوں اس سحر سے شام کتنی دور ہے

یہ نظم حمایت صاحب کے دوسرے مجموعۂ کلام ''مٹی کا قرض'' (مطبوعہ ۱۹۷۴ء میں ''منظر۔ پس منظر'' کے عنوان سے چھپی ہے۔ مگر ڈاکٹر وزیر آغا نے اسے پہلے ہی عنوان سے ۱۹۵۹ء کے بہترین ادب (مطبوعہ ۱۹۶۱ء) میں شامل کیا جو اکادمی پنجاب لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوا تھا۔ اس نظم کو پڑھ کر حیدر آباد دکن سے مخدوم محی الدین نے اپنے خط میں حمایت صاحب کو لکھا کہ:

''پچھلے دنوں تمھاری کچھ نظمیں بہترین شاعری کے انتخاب میں پڑھیں۔ جدید شعراء کے بارے میں یہ کتابیں اردو میں بھی شائع ہوئی ہیں اور دیوناگری رسم الخط میں بھی، خدا جانے تم تک پہنچیں یا نہیں۔ یہاں تمھاری ''ثلاثیاں'' بھی موضوع بحث رہی ہیں یہ اچھی صنف ہے، مختصر اور جامع۔ بڑی گمبھیرتا آگئی ہے سوچ میں آخر ہے نا دکن کی مٹی۔ دکن کی مٹی کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ ''سورج'' بھی نہیں جو تمھاری شاعری میں ''آمریت'' کی علامت کے طور پر ابھرا ہے (یہ تشبیہ

پاکستانی شاعر ہی دے سکتا ہے)'' ان علامتوں اور حمایت صاحب کے شعری اسلوب کے بارے میں آگے چل کر تفصیل سے لکھوں گی۔ فی الحال ان کے فکری پس منظر کی کھوج میں ہوں۔

مارکسزم پر بھی ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور مذہبی علوم پر بھی۔ میں نے ان کی لائبریری میں مختلف مذاہب پر بڑی اہم کتابیں دیکھی ہیں اور فلسفہ اور تاریخ پر بھی، اصل میں جس شخص کا تعلق پڑھنے لکھنے سے ہو وہ کہیں نہ کہیں جھلک ہی جاتا ہے۔ حمایت صاحب کی شاعری میں تفکر کی بات ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے بھی کی ہے۔ ''مٹی کا قرض'' پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''حمایت علی شاعر ان سخن وروں میں ہیں جو سوالوں کا جواب دیتے ہیں اور فکر و استدلال کا سہارا لے کر شعر کو فکر کا وسیلہ بناتے ہیں۔ وہ سوال بھی اٹھاتے ہیں اور جواب بھی دیتے ہیں''۔ آگے چل کر لکھتے ہیں۔

''شاعر کا مرکزی سوال روح اور بدن کی جنگ سے متعلق ہے، یہی جنگ آگے چل کر فطرت اور انسان کی کشمکش بن جاتی ہے۔ اس آویزش میں شاعر بدن اور مٹی کا طرف دار ہے۔ بدن اور مٹی کا یہ اعلان جنگ اپنے عہد کے شعور اور تاریخی حرکت ارتقائی کے حوالے سے ہے اور شاعر ہمیں باور کراتا ہے کہ بدن، روح پر، دھرتی، آسمان پر اور انسان، فطرت پر غلبہ پا کر رہے گا۔ اس آویزش میں قدرتی طور پر اندیشے اور خوف اور وسوسے بھی ابھرتے ہیں اور وحشت کی فضا بھی ہے جو شاعر کے داخلی المیے میں ایک معنی پیدا کرتی ہے۔ یہ ہے مجملاً Content جو حمایت علی شاعر کے اس مجموعے میں مختلف عنوانات کے تحت بیان ہوا ہے اور میں اسے شاعر کا فکری مینی فیسٹو کہنا چاہوں گا۔ اپنے موضوع کی نثری تشریح دیباچے میں خود شاعر نے پیش کر دی ہے۔''

اس کے بعد ڈاکٹر عبداللہ نے حمایت صاحب کے دیباچے کے مختلف جملوں اور خیالات سے بحث کی ہے اور بات فلسفیانہ مباحث تک چلی گئی ہے۔ بعض مفکرین اور سائنس دانوں کے حوالے بھی آ گئے ہیں مغرب اور مشرق کے طرز فکر کا موازنہ بھی ہو گیا ہے۔ ایک طویل بحث کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

''شاعری کے ایک مجموعے پر اتنی سنگلاخ فکری گفتگو بعض حضرات کے لیے تعجب انگیز ہو گی مگر تعجب

اس لیے نہیں ہونا چاہیے کہ حمایت علی شاعر کا یہ شعری مجموعہ ہماری فکری شاعری کا نمایندہ ہے۔ اس کے کلام میں فکری حقایق عمدہ شاعری بن کر نکلے ہیں۔ افکار نے تخلیقی پیکروں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس لیے یہ شاعری بھی ہے اور فکر بھی اور شاعر دونوں کے تقاضے پورے کر رہا ہے۔''

''آگ میں پھول'' میں حمایت صاحب کی نظم ''اقبال اور میں'' اور ''آدمی کی کہانی'' بھی فکری شاعری کی تعریف میں آتی ہیں۔ ''اقبال اور میں'' کا آخری شعر ہے:

اپنی تخئیل میں آباد ہوں میں
اپنے خلاق کا ہم زاد ہوں میں

اس شعر ہی سے یہ سراغ ملتا ہے کہ حمایت صاحب علامہ اقبال سے کتنے متاثر ہیں۔ دوسری نظم ''آدمی کی کہانی'' انسان کی ارتقائی تاریخ کا آئینہ دکھاتی ہے اور کائنات پر اس کے فکری تسلط اور اس کی اندرونی شکست و ریخت کا جائزہ لیتی ہے۔ اسی طرح اس کتاب میں فلسفہ عینیت کی روشنی میں ''طبقاتی مساوات'' کا تجزیہ بھی بڑے لطیف انداز میں کیا گیا ہے۔ ''رموز حیات'' میں بھی اس فلسفے کے نکات ایک خندہ استہزا کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

''آگ میں پھول'' کی غزلوں میں بھی جگہ جگہ یہ مخصوص فکر جھلکتی ہے۔

روح اور جسم میں ہے جنگ کڑی
ٹوٹ جائے نہ کہیں تار نفس

☆☆

اس دنیا سے گزر کر بھی ہم
اس دنیا سے گزرتے کب ہیں

☆☆

یہ کیسا قافلہ ہے جس میں سارے لوگ تنہا ہیں
یہ کس برزخ میں ہیں ہم سب، تمھیں بھی سوچنا ہو گا

''مٹی کا قرض'' تک آتے آتے ان کی فکر اور گہری ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کی پہلی نظم ''گفتنی و ناگفتنی'' اپنے عنوان کا آئینہ ہے۔

کھلا کہ لا ہی حقیقت ہے لا ہی افسانہ
عدم وجود میں پوشیدہ ہے خدا کی طرح
بس اک تسلسل جذب و گریز جاری ہے
ہر انتہا نظر آتی ہے ابتدا کی طرح

☆☆

کسے خبر کہ ہے یہ کیا ربط ظاہر و باطن
پہن کے بیٹھے ہیں سب جسم کو قبا کی طرح
میں اپنے آپ سے مصروفِ جنگ ہوں شاعر
لہولہان ہے دل، دشت کربلا کی طرح

حمایت صاحب اس کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''اپنی وحدت کی تلاش مجھ کو اپنے آپ سے نبرد آزما رکھتی ہے۔''

''تاریخ کا شعور شاعر کو عہد شناس بناتا ہے اور معاشرے میں اقدار کے جدلیاتی عمل سے آگاہ رکھتا ہے۔''

''شاعری اپنے عہد کی تنقید بھی ہے۔''

''میں جو صداقت کی تلاش میں اپنے کفن کا احرام باندھے کبھی اپنی ذات کا طواف کرتا ہوں اور کبھی اپنی دھرتی کا۔''

سوچا جائے تو ایک فن کار کا سارا تخلیقی عمل اسی وحدت کی جستجو ہی ہے۔ شاعر لفظ و خیال کی رفاقت میں یہ جستجو کرتا ہے اور جس سطح پر اس نے سوچا اسی سطح پر اسے کچھ مل جاتا ہے۔ یہاں ''کچھ'' کا لفظ میں شعوری طور پر استعمال کر رہی ہوں۔

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

ہر شاعر، صاحبِ فکر نہیں ہوتا جس فکر کی طرف میں اشارہ کر رہی ہوں۔ شاید حمایت صاحب کے اشعار سے ہی کچھ واضح ہو جائے۔

میں سوچتا ہوں مگر میری سوچ ہی کیا ہے
بس ایک خوابِ حقیقت ہے، آگہی کیا ہے

میں آئینے میں بھی ہوں آئینے کے باہر بھی
مرے وجود کی وحدت میں یہ دوئی کیا ہے
کوئی تو دیکھے مجھے میری آنکھ سے یا رب
دکھائی دیتا ہے مجھ کو سراب میں کیا کیا

یہ سب اشعار ان کی مختلف غزلوں کے ہیں، ایسے اور بھی اشعار ہیں جو مختلف تجربوں کی نشان دہی کرتے ہیں:

دیکھا وہ خواب رات کہ میں چیخ چیخ اٹھا
میرا خدا بھی حلقہ دار و رسن میں تھا
کس درجہ ہولناک ہے شاعر شعور ذات
کتنی حسین پہلے یہی کائنات تھی
ہمیں حرم میں نہاں تھے، ہمیں صنم سے عیاں
ہماری ذات سے باہر ہمیں خدا نہ ملا

حمایت علی شاعر کی تیسری کتاب ''تشنگی کا سفر'' ہے جو چار طویل نظموں پر مشتمل ہے۔ (ان نظموں پر ''طویل نظموں'' کے باب میں گفتگو ہوگی)۔ چوتھی کتاب ''ہارون کی آواز'' جس میں ایک طویل نظم ''حرف حرف روشنی'' اور مختلف نظمیں اور غزلیں ہیں۔ اس کتاب کا فکری پس منظر اس کے نام سے عیاں ہے۔ حمایت صاحب نے ''واحد متکلم'' کے عنوان سے جو دیباچہ لکھا ہے اس میں قرآن حکیم، توریت اور انجیل کی بعض آیتوں کے ایسے حوالے ہیں جو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے بعض واقعات کی تصدیق کرتے ہیں۔ حمایت صاحب نے انھیں اپنے عہد پر منطبق کیا ہے اور کتاب کے نام کا جواز نکالا۔ اس کتاب میں بھی ایسے اشعار ہیں جو حمایت صاحب کی فکر کی عکاسی کرتے ہیں۔ نظموں سے قطع نظر غزلوں کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمایئے:

ازل سے ایک عذاب قبول و رد میں ہوں
کبھی خدا تو کبھی ناخدا کی زد میں ہوں
خدا نہیں ہوں مگر زندہ ہوں خدا کی طرح
میں اک اکائی کی مانند ہر عدد میں ہوں

میں اپنا آپ ہی خالق ہوں آپ ہی مخلوق
میں اپنی حد سے گزر کر بھی اپنی حد میں ہوں
میرا تضاد ہی میری بقا کا ضامن ہے
میں مطمئن ہوں اگر اپنے جزر و مد میں ہوں

یہ اشعار مختلف زاویوں سے حمایت صاحب کے فکری پس منظر پر روشنی ڈالتے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر ایک بات جو تمام اشعار کے پس منظر میں نمایاں ہوتی ہے وہ سائنسی آگہی کی جستجو ہے۔ ان کی عقلیت پسندی ہے اور سائنسی آگہی کی جستجو میں ان کا ذہن روایتی فکر سے مسلسل نبرد آزما رہتا ہے۔ وہی بات جو ایک دور میں غالب کو مضطرب رکھتی تھی۔ غالب کی فکری جھنجھلاہٹ کسی انقلاب کی آرزومند تھی۔ غالب کی نگاہ میں مغرب کے علوم تھے نہ مغرب کے بدلتے ہوئے افکار۔ پھر بھی کلکتہ میں جب انھوں نے دخانی جہاز دیکھے تو محسوس ہوا کہ کوئی تغیر آنے والا ہے۔ سرسید نے لندن میں جو کچھ دیکھا تھا۔ غالب کو ہندوستان میں بھی دکھائی دینے لگا تھا مگر وہ اسے کوئی نام نہیں دے سکتے تھے۔ وہ تبدیلی سیاسی غلامی کے راستے سے آرہی تھی لیکن اس اندھیرے کے پیچھے تھوڑا سا اجالا بھی تھا اور وہ نئے دور کا فکری اجالا تھا جو اقبال کے کلام سے اردو شاعری کو نصیب ہوگیا۔ علامہ اقبال سے جس سائنسی آگہی کا آغاز ہوتا ہے اس کی روش سے جوش ہی نہیں فیض اور احمد ندیم قاسمی بھی سرشار نظر آتے ہیں۔ ہر چند کہ ان تمام شعرا کے ساتھ ان کے روایتی ماضی کے مخصوص افکار بلکہ عقائد بھی جھلک دکھاتے رہتے ہیں مگر مجموعی طور پر شاعری کے فکری سفر کا رخ اب دوسری طرف ہوگیا ہے۔ اقبال نے جس گنبد آفاق کی وسعتوں سے اردو شاعری کو روشناس کرایا ہے وہ مذہبی عقائد میں بھی در آیا ہے۔ معراج کے واقعے کی روحانی تاویل کے بجائے ''علامہ'' سائنسی تشریح کرتے ہیں:

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

ان کا یہ نعتیہ شعر بھی معنی کی کتنی ابعاد رکھتا ہے:

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

ایسے ہی اشعار نے جوش صاحب کو بھی روایتی عقائد کے مخصوص و محدود دائرے سے نکال دیا۔ وہ فطرت کے آئینے میں حقیقت کو دیکھتے ہیں:

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لیے
اگر رسولؐ نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

اور احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں:

یہ زمیں، یہ خلا کی رقاصہ
آدم نو کے انتظار میں ہے

وہ آدم نو جو صدیوں کے اوہام سے نکل کر کسی حد تک نمایاں ہو رہا تھا، ابھی ہزار مسائل سے نبرد آزما بھی ہے۔

فیض، مخدوم، ندیم، علی سردار جعفری اور اس دور کا ہر باشعور شاعر اس مصرعے کا شعوری ادراک رکھتا ہے اور اپنے بعد آنے والے شاعروں کو اس کی عملی تعبیر سے بھی آشنا کر رہا ہے۔ حمایت علی شاعر اسی نسل کے نمایندے ہیں۔ ان کے عہد میں حقیقت اور بھی روشن ہوگئی ہے۔ انسان نے اس دور میں چاند پر قدم رکھ دیا ہے۔ سائنسی آگہی نے بہت سے بند دروازے کھول دیے ہیں۔ حمایت صاحب اور ان کے ہم عصر عقلیت پسند شاعر، جدیدیت کی یلغار کے باوجود حقیقت کی طرف کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں۔ شاعری میں سوچ کا وہ عنصر روشن سے روشن تر ہو رہا ہے جس کی بنیاد علامہ اقبال نے رکھی تھی۔ آئن اسٹائن کے نظریہ اضافیت کے بعد فکر کے نئے زاویے سامنے آگئے ہیں۔ گردوں ''بشریت'' کی زد میں آچکا ہے اور انسان انفس و آفاق کی بلندیوں پر پہنچ چکا ہے۔ شاعر صاحب کہتے ہیں:

اب آگہی کی زد پہ ہیں صدیوں کے واہمے
لاکھ آسماں اٹھائے ہوئے اپنی ڈھال ہو

لیکن اپنے عہد میں وہ ایسی مثالیں بھی دیکھتے ہیں کہ:

گنبد کی طرح دوش پہ رکھے ہوئے ہیں سر
جسموں کے مقبروں میں دریچے نہ جالیاں

چناں چہ اکثر اہل قلم پر یہ شعر بھی صادق آتا ہے:

بیٹھے ہوئے زمیں پہ جگالی میں ہیں مگن
وہ جانور جو چڑھ نہیں سکتے درخت پر

اسی خیال کو ایک اور غزل میں حمایت صاحب نے فیصلہ کن انداز میں لکھ دیا ہے:

یہ کہہ کر اڑ گئے ہیں پرندے درخت سے
کرتے رہو زمین پہ بیٹھے جگالیاں

حمایت صاحب کے اشعار اپنے عہد کی تنقید بھی ہے اور محاکمہ بھی۔ ان کے خیالات سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارے دور میں ایک مکتبۂ فکر ایسا بھی ہے جو شاعری کو کسی نظریے کا تابع نہیں سمجھتا بلکہ وہ شاعر یا ادیب کا رشتہ اس کی اپنی تحریر سے بھی کاٹ دیتا ہے اور اس کی تخلیقی باگ قاری کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ مثلاً ''ساختیات، پس ساختیات وغیرہ'' ابھی مجھے اس سے بحث نہیں ہے فی الحال میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ حمایت صاحب کی تخلیقات خود ان کے نظریات کی کتنی نمایندگی کرتی ہیں؟ انھوں نے اپنے عہد کے مسائل کا تجزیاتی مطالعہ کس انداز میں کیا ہے؟ اس کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا ہے؟ کس اسلوب سے ان کی شناخت متعین ہوتی ہے۔ ''واحد متکلم'' میں وہ لکھتے ہیں۔

''میری شاعری میں عہد پارینہ کی مخصوص حکایات اور ان کے مختلف کردار جو اپنی پرچھائیاں تلاش کرتے نظر آتے ہیں، ماضی و حال کے اسی جدلیاتی ربط کے آئینہ دار ہیں۔ میں اس آئینہ میں ان حکایات کا نیا روپ اور ان کرداروں کے نئے چہرے دیکھتا ہوں اور اس آگ کی روشنی میں جو میرے تخلیقی جوہر کی امین ہے۔ اپنے عہد کے ان پس پردہ محرکات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں جس کے سبب تاریخ کبھی اپنے آپ کو دہراتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور کبھی آگے بڑھتی ہوئی اور کبھی اس عالم میں جیسے اپنی جگہ ٹھہر گئی ہو۔''

یہ پیراگراف ایک کلیدی پیراگراف ہے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکی ہوں وہ عقلیت پسند ضرور ہیں مگر ماضی کے غیر عقلی فلسفیوں یا عقیدوں سے اپنا رشتہ بالکل توڑ بھی نہیں لیتے بلکہ عینی فلسفوں کو بھی وہ انسانی ارتقاء کے ایک مخصوص دور کی تخلیق سمجھتے ہیں۔ اس دور میں یہ مخصوص اندازِ فکر انسان کا مقدر تھا۔ انسان کا ذہنی سفر اسی منزل تک پہنچا تھا۔ یہ انسانی معاشرے کے بچپن کا دور تھا۔ مختلف

طلسمی حکایات اور طلسمی کردار اس دور کی فکری پہچان متعین کرتے ہیں۔ اس لیے انھیں انسانی تاریخ سے کاٹ کر پھینکا نہیں جا سکتا۔ انھیں ساتھ لے کر چلنے ہی سے ہمیں اگلی منزلوں کا حقیقی ادراک ہوگا۔

حمایت صاحب نے ان حکایات اور کرداروں کو نئے معانی دیے، انھیں اپنے عہد میں رکھ کر ان امکانات کا مطالعہ کیا کہ وہ کہاں تک انسانی ارتقاء میں اس کے ہم سفر ہو سکتے ہیں۔ چناں چہ ان کی شاعری میں یہ تمام چیزیں علامتیں اور استعارے بن جاتے ہیں اور ان کے زیر اثر وجود میں آنے والے واقعات، عقیدے اور تصورات سب اپنے مفاہیم بدلنے لگتے ہیں۔ ایک مذہبی حوالے کو ہی لیجیے۔ علامہ اقبال نے کہا تھا:

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ بندہ نواز

یہ ایک عہد کا ''ظاہر'' ہے۔ ''باطن'' اور ہے۔ کسی بڑی طاقت کے زیر اثر ''حاکم وقت'' بھی وقتی طور پر سرنگوں ہو جاتا ہے۔ مگر پھر؟ اس دور میں بھی اور آج کے دور میں بھی حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ حمایت صاحب اپنی نظم ''بنگال سے کوریا تک'' کے کلائمکس پر لکھتے ہیں:

کوئی محمود تو رہا محمود
ہم ایازوں کو کیا ملا آخر

یہ درست ہے کہ تاریخ میں اکثر ''ایازوں'' کو غصہ آیا ہے۔ انھیں بھی محمود کے استحصال کا احساس ہوا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ:

ہر ایک قلب میں ہے سرنگوں ''بت محمود''
کہاں پہنچ گیا ''دستِ ایاز'' یہ بھی تو دیکھ

(۸؍جنوری)

بلاشبہ زمانے نے وہ منظر بھی دیکھا اور بڑے بڑے انقلابات بھی دیکھے لیکن یہ بات اپنی جگہ غور طلب ہی رہی جیسا کہ انھوں نے خود اپنی ایک ثلاثی میں واضح کیا ہے:

زندگی بھر تو نہیں، ہاں مگر اک وقت نماز
اپنے ایماں کی سرعام نمایش کے لیے
''ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز''

مذاہب میں چوں کہ ''ایک بڑی طاقت'' کا تصور بھی ہوتا ہے اس لیے اس کی خوشنودی کے لیے ''حاکم وقت'' بھی یہ نمائشی کردار ادا کرتا ہے تاکہ اپنے عہد کے ''ایازوں'' کو قابو میں رکھا جائے۔
یہ سیاست ایک طرح کی منافقت ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان ایک سمجھوتہ ہے۔ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ آگے بڑھتی رہتی ہے اور پرانی زنجیریں ٹوٹتی جاتی ہیں۔ انسانی ذہن تجربوں کی روشنی میں بیدار ہوتا جاتا ہے۔ اور بالآخر وہ دور آتا ہے جسے ہم ''جمہوریت'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ انسانی معاشرہ جو غلام اور آقا کی بنیادوں پر ازل سے قائم ہے طاقت ور اور کم زور کے تعلق سے مرتب ہوا اور آگے بڑھتا رہا۔ لیکن مسلسل جدوجہد اور بغاوتوں کے بعد کم زور کو اس مقام پر لے آیا ہے جہاں اس کا لحاظ و احترام بھی کسی حد تک ضروری سمجھا جانے لگا ہے۔ عورت اور مرد کے حوالے سے بھی یہ بات سمجھی جا سکتی ہے۔ وہ مخلوق جسے مرد صرف اپنے مصرف کی شئے سمجھتا رہا ہے اور اسے اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے پر مجبور کرتا رہا، بالآخر وہ بھی اس مقام پر آ گئی کہ مذہبی نظام سے لے کر سماجی نظام تک سب اس کا لحاظ اور احترام کرنے پر مجبور ہو گئے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ نئے خیالات پیدا بھی اسی طرح ہوتے ہیں اور انسانوں کی رہنمائی بھی اسی طرح کرتے ہیں۔ انھیں ہر دور میں ایک جدوجہد ایک جنگ سے گزرنا پڑتا ہے۔ آخر فتح ان ہی کی ہوتی ہے۔ کسی حد تک ہی سہی۔
حمایت صاحب نے اس حقیقت کو جدلیات کی روشنی میں سمجھا ہے، ان کی شاعری میں جہاں کہیں بھی ایسے مسائل آئے ہیں، جہاں تاریخی حقیقتیں ان کے وجود کا باعث بنی ہوں حمایت صاحب نے عمل اور ردعمل کی روشنی میں انھیں سمجھا اور ان کا تجزیہ کیا ہے۔ ان کی شاعری میں جو تلمیحات ملتی ہیں وہ نئے معنی متعین کرتی نظر آتی ہیں۔

کھینچی تھیں جن کے خوف سے سد سکندری
سوئے نہیں ہیں آج وہ دیوار چاٹ کے

ہمارے معاشرے میں ''یاجوج ماجوج'' کی ایک کہانی ہے جو روایت بن گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ

زمین و آسمان کے درمیان جو دیوار کھڑی ہے وہ ''یاجوج ماجوج'' چاٹ رہے ہیں۔ رات کو جب وہ دیوار ''ورق'' کی مثال ہو کر رہ جاتی ہے تب وہ سو جاتے ہیں صبح اٹھ کر دیکھتے ہیں تو وہ دیوار پھر ویسی ہو جاتی ہے۔ جیسی پہلی تھی وہ پھر چاٹنے لگتے ہیں۔ رات پھر سو جاتے ہیں صبح پھر انھیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی محنت بے کار گئی۔ کہتے ہیں کہ جب وہ خدا کا نام لے کر سوئیں گے، تو صبح کو دیوار ''ورق'' کی مانند پتلی ہی ملے گی اور وہ اسے چاٹ کر دنیا میں داخل ہو جائیں گے اور پھر دنیا میں قیامت آ جائے گی۔ یعنی تمام ناانصافیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ پھر روز عدل ہوگا اور ظالموں کو ان کے کیے کی سزا ملے گی۔
اس کہانی کو کس انداز فکر اور کن جذبات نے جنم دیا؟ پرانے انسان کے لیے قیامت روز حشر اور انصاف ایک سہارا تھا تسکین قلب کا ایک ذریعہ۔ بہت سے مذاہب نے بھی اس حکایت کو اپنایا ہے۔ بعض مذاہب نے ان کرداروں کے بغیر بھی قیامت کی تصویر پیش کی ہے اور انصاف کی خوش خبری سنائی ہے۔
یونانی مائیتھالوجی[1] میں بھی ایک دیوتا ہے۔ ''پرامیتھس''۔ اس کا آدھا جسم انسانوں جیسا ہے، چناں چہ وہ آسمانوں کے خداؤں کے تصرف میں جو آگ ہے اس کا راز انسانوں پر ظاہر کر دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں خداؤں کا خدا (رب الارباب) اسے اس پہاڑی پر باندھ دیتا ہے، جہاں زمین اور آسمان ملتے ہیں اور ایک گدھ کو اس کا پیٹ نوچنے کے لیے مقرر کر دیتا ہے۔ گدھ دن بھر اسے نوچتا رہتا ہے اور رات کو جب پرامیتھس نڈھال ہو جاتا ہے تو گدھ، نوچنا بند کر دیتا ہے اور سو جاتا ہے۔ دوسرے دن گدھ پھر دیکھتا ہے کہ پرامیتھس ویسا ہی ہو گیا ہے جیسا وہ پہلے تھا، وہ پھر سے اسے نوچنا شروع کر دیتا ہے، یونانی متھ کے مطابق ایک دن ہرکولیس آئے گا اور پرامیتھس کو پیٹ کے اس عذاب سے نجات دلا دے گا۔
ایسی حکایات اکثر زبانوں اکثر قوموں اور اکثر ادب پاروں میں ملتی ہیں۔ ان کے پس منظر میں کہیں تاریخی حقیقتیں بھی ہوتی ہیں جو افسانوں کا روپ دھار لیتی ہیں۔ حمایت صاحب نے طالب علمی کے زمانے میں ایک بار علامہ نیاز فتح پوری سے ان کے رسالے ''نگار'' میں ''یاجوج ماجوج'' کے سلسلے میں فرضی نام سے ایک سوال بھی کیا تھا۔ نیاز صاحب نے سکندر ذوالقرنین کے حوالے سے ایک تاریخی واقعہ بیان کیا تھا کہ ''یاجوج ماجوج'' ایران کی سرحد کے پار دو قومیں تھیں جو اکثر

رات کو حملہ کر کے لوگوں کو لوٹ لیتی تھیں۔ سکندر نے ان سے بچنے کے لیے اپنے ملک کی سرحد پر ایک دیوار چنوادی تھی۔ اس وقت ایران کی سرحد چین تک پھیلی ہوئی تھی۔ چناں چہ دیوار چین اسی واقعے کی شہادت دیتی ہے۔ خدا جانے یہ بھی کوئی حکایت ہے یا تاریخی حقیقت۔ مگر اس واقعے کی روشنی میں کرداروں کی خصوصیات بدل جاتی ہیں۔ سکندر ذوالقرنین کا کردار۔ ایک ملک دوست اور رعایا پرور بادشاہ کا کردار بن کر سامنے آیا ہے۔ تاریخ اس قسم کے فرضی، مصنوعی اور بعض حقیقی واقعات سے بھری پڑی ہے۔ وقت تو گزر گیا لیکن حکایات رہ گئیں۔ آج جب ہم ان کی روشنی میں نئے امکانات کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم مثبت قدروں پر نظر رکھیں اور انھیں نئے معنی سے آباد کریں۔ حمایت صاحب نے یہی کیا ہے۔ ان کے شعر میں ''سدِ سکندری'' چاٹنے کے عمل میں یاجوج ماجوج منفی کردار نہیں بلکہ مثبت کردار ہیں۔ وہ ''آج'' سوئے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ سدِ سکندری کو توڑ کر قیامت برپا کر دیں گے اور انصاف حاصل کر لیں گے۔

حمایت صاحب کے اشعار میں ایسی متعدد تلمیحات ہیں جو اپنے دور کی ترجمان ہیں۔

نئے دور کی ابتدا کا پہلے ضامن
کہ دل آئینہ گوشۂ ثور کا ہے

ان کی نظر میں معاشرے کا ہر رخ ہے۔ روشن بھی تاریک بھی ہے۔

افسانہ یاد آگیا اصحابِ کہف کا
تاریخ لکھنے بیٹھا تھا میں اپنے دور کی
ہم بھی ہیں کسی کہف کے اصحاب کی مانند
ایسا نہ ہو جب آنکھ کھلے، وقت گزر جائے

☆☆

حیراں نہ ہو یہ زہر ہے اپنی ہی کشت کا
اک رشتہ سانپ سے بھی ہے باغ بہشت کا
جو آگ نہ تھی ازل کے بس میں
وہ آگ ہے میری دسترس میں

اس شعر کے پس منظر میں الہامی کتابوں کی ایک کہانی ''ابلیس'' کے حوالے سے درج ہے اور علامتی انداز میں بیان کی گئی ہے۔ حمایت علی شاعر نے اپنے شعر میں اسے نیا مفہوم دیا ہے۔

''جنت''.....قدرت کی تخلیق (جنگل لائف کا استعارہ)

''شیطان.....آگ کی مخلوق (جنگل میں پلے ہوئے وحشی انسان کی درندہ صفتی، جو اسے غیر مہذب بناتی ہے)

قدرت بھی جسے قابو میں نہ رکھ سکی۔ خدا کا نائب اشرف المخلوق ''انسان'' اسی پر قابو پانے کی کوشش میں مصروف ہے۔

آگ لاشوں کے قلب کی دھڑکن
آگ پیہم سکوت کا طوفاں
آگ محرومیوں کی تشنہ لبی
آگ غربت کا آخری ارماں
اور یہ آگ کر گئی روشن
مجھ پہ تاریخ کے مقدس راز
ہر گناہ عظیم کے پیچھے
کس خدا کا ہے دست، کار زار

وقت اور مسائل کے ساتھ مفاہیم بدلتے جاتے ہیں۔ مذکورہ دو بندان کی طویل نظم ''شعلۂ بے دود'' سے ماخوذ تھے۔ ان کی بیشتر نظمیں۔ گوسالہ، یدِ بیضا، نسبتِ خاک، مریم سے ایک سوال، پرانے سلسلے، نئے رابطے، موئین جوداڑو میں دوسرا آدمی، ہارون کی آواز اور یوسف ثانی وغیرہ بھی ان کے اس اسلوب کی نشان دہی کرتی ہیں، جو اسرائیلی، ہندوستانی، یونانی اور اسلامی حکایات کی مخصوص تلمیحات سے مرتب ہوتا ہے۔ جب وہ کہتے ہیں:

حد سے نکل نہ جائیں کہیں کم ترین لوگ
موسیٰ کے انتظار میں ہیں بے زمین لوگ

تو یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام صرف یہودیوں کے پیغمبر نہیں رہتے بلکہ وہ ہر بے زمین قوم کے پیغمبر بن جاتے ہیں۔

وہ جہاں فرعون کے مظالم سے مصر میں عبرانیوں کو بچاتے ہیں اور نہتے لوگوں کو محض ڈنڈے (عصا) کی مدد سے ہتھیار بند فوجوں سے لڑنا سکھاتے ہیں (تاریخ میں گوریلا جنگ کا آغاز حضرت موسیٰ سے ہوتا ہے) اور انھیں اپنی آبائی سرزمین (کنعان) میں پہنچا دیتے ہیں بلکہ موجودہ دور میں کیوبا سے ویت نام تک ایک نئے انقلاب کی علامت بن جاتے ہیں۔ وہ دنیا کے طبقاتی نظام کے خلاف صف آراء بغاوتوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔

مری ہتھیلی کہ جس میں روشن
وہ آگ بھی ہے وہ نور بھی ہے
جو دستِ موسیٰ ہے، طور بھی ہے
جو اُس عصا کی تلاش میں ہے
جو ہر تہی دست کی متاعِ گراں بہا ہے
جو کشتگانِ طلسمِ زر کی حیاتِ تازہ کا معجزہ ہے
جو عہدِ حاضر کے ساحروں
اور ان کے سانپوں کے واسطے
ضربتِ قضا ہے
(یدِ بیضا)

ایک شعر دیکھیے۔ آج کے نظامِ زر پہ کتنا شدید طنز ہے۔

یہ معجزہ بھی وقت کا کتنا عظیم ہے
اب دستِ سامری میں عصائے کلیم ہے

حمایت صاحب "گوسالہ" کی تاریخی حکایت کو بھی استعارہ بنا کر آج کے عہد پر منطبق کرتے ہیں اور "زر پرستی" کے بارے میں کہتے ہیں:

"گوسالہ" اب بھی زندہ ہے دولت کے روپ میں
بدلے نہیں ہیں آج بھی آداب بندگی
اک سامری کا خواب ہے ہر خواب بندگی
یہ رات سایہ سایہ ہے سورج کی دھوپ میں

ان علامتی نظموں میں ایک مختصر ترین نظم "تجدید" بھی ہے۔ یہ نظم جتنی مختصر ہے اس کے بجائے اتنے ہی طویل ہیں۔

عیسائیت میں "GOD FAHTER" کی مذہبی تاویل سے قطع نظر خدا اور انسان کی ہم رشتگی دریافت کی گئی ہے۔ یہ ہم رشتگی عورت کی مظلومیت اور خدا کی رحمانیت کے اتصال سے وجود میں آتی ہے اور ہر اُس انسان کو محترم بنا دیتی ہے جو عیسیٰ کی طرح دنیا میں آیا اور انسانیت کو ایک نیا درس دے گیا۔ جس نے مریم کو "خدا" کی طرح مقدس و محترم بنا دیا حتیٰ کہ الہامی کتابوں نے بھی تصدیق کر دی۔ "مریم سے ایک سوال" میں وہ اپنے عہد کے ایک اور عظیم المیے کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس انسان کا المیہ جسے زمین قبول نہیں کر رہی ہے۔

SON OF THE SOIL کی اصطلاح اسی دور کی پیداوار ہے، وہ لوگ جو اپنی زمینوں کو چھوڑ کر تلاشِ معاش میں دوسری زمینوں پر آباد ہو رہے ہیں اور زمین کی "مامتا" سے محروم ہوتے جا رہے ہیں حمایت صاحب ان کے مسائل اور دکھوں کا احساس دلا کر مریم سے کچھ سوال کرتے ہیں۔ اس نظم میں "مریم" زمین کا استعارہ ہے۔

تم تو زمین ہو، مرکزِ تخلیقِ زندگی

☆☆

تم نے تو آدمی کو کیا تھا خدا صفات
کیوں آج شرطِ رزق ہے یہ شجرۂ نسب
مریم کہو کہ جائے یہ لختِ جگر کہاں
اللہ کی زمین پہ ہے اس کا گھر کہاں

"SON OF THE SOIL" کے خلاف "بے زمین انسان" کے لیے انھوں نے اپنی ایک نظم "پرانے سلسلے نئے رابطے" میں کتنی بلیغ بات کہی ہے۔

مری زمیں ہے مری ماں، میں ابنِ مریم ہوں
تمھارا خوں سے ہے رشتہ تو میرا دودھ سے ہے

"موئن جوڈرو میں دوسرا آدمی" میں اسی نکتے کی توضیح دکھائی دیتی ہے۔ اس میں آدم کی وحدت سے رشتہ جوڑا گیا ہے۔ مذاہب، نسلوں اور زبانوں سے جو تقسیم عمل میں آتی ہے وہ اسے وقت کی زد

میں رکھ دیتے ہیں اور بنیادی حقیقت کو اولیت دیتے ہیں۔

لہو کا رشتہ ازل اور ابد کا رشتہ ہے
بصد تضاد سہی، خال و خد کا رشتہ ہے
یہ آدمی کی دوئی میں احد کا رشتہ ہے
میں سوچتا ہوں کہ میرے ہزار نام سہی
میں زندگی کی مسافت میں بے مقام سہی
یہ میرے حال سے ماضی کا انتقام سہی
میں آج اپنے کھنڈر میں ہوں اپنے گھر کی طرح
یہ میرے ساتھ رہا میرے بام و در کی طرح
یہ شہر مجھ میں تھا زندہ مرے ہنر کی طرح

حمایت صاحب کی فکر، اپنے ماضی سے نئے مفاہیم اخذ کرتی ہے اور آج کل کے مسائل کا حل دریافت کرتی ہے۔ وہ پرانے خیالات سے نئی فکر کو مربوط کر کے آگے بڑھتی ہے۔

اس سلسلے میں ان کی ایک نظم ''پا بہ گل'' بھی ہماری بڑی رہنمائی کرتی ہے۔ جنگل (بہشت) کی زندگی سے دنیا (تہذیب) کی زندگی اور پھر بہشت (جنگل) کی آرزو، ایک خاص نکتے پر روشنی ڈالتی ہے:

صدیوں کا فاصلہ ہے جنگل سے مرے گھر تک
شاخِ ثمر بکف سے تخلیق کے ہنر تک
اُس پایپادگی سے اِس برق پا سفر تک

☆

اب میری دسترس میں سورج بھی ہے ہوا میں
یہ پُرکشش زمیں بھی وہ بے کشش خلا بھی
اب تو ہے میری زد میں دنیائے ماورا بھی

ایسے نفسیاتی مسائل کے ساتھ فکری اعتبار سے جڑ کر تاریخ کے مطالعے کا انداز بہت کم شعرا کے پاس نظر آتا ہے۔ علامہ اقبال نے اسلام کے تاریخی پس منظر سے اپنے افکار کی جدتوں کو وابستہ کیا تھا

اور انھیں ایک نئی معنویت دی تھی۔ یہ اس عہد کا تقاضہ تھا تاکہ مسلمان نئے انداز میں سوچنے کے قابل بن جائیں۔ حمایت صاحب نے اپنی فکر کو مسلمانوں کی حد تک محدود نہیں کیا وہ انسان اور تاریخ کا مطالعہ متوازی خطوط پر کرتے ہیں۔ انسانی معاشرے کے ارتقائی ادوار میں جتنے بھی مقامات آتے ہیں، چاہے ان کا تعلق دیومالائی حکایات سے ہو یا الہامی روایات سے، وہ رنگ و نسل، جغرافیہ اور تاریخ حتیٰ کہ ماقبل تاریخ کے افسانوں کو بھی (انسانی رشتے سے) مقدم گردانتے ہوئے ان سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ ان کی چند نظمیں ایسی بھی ہیں جو زندگی کے اُن پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہیں جو انسان کے لطیف ترین جذبات سے متعلق ہیں مثلاً ایک نظم ''تسلسل'' کا یہ بند دیکھیں:

''تسلسل''

تم رابعہ پیکر ہو کہ میرا ہو کہ مریم
مجھ کو نہیں معلوم کہ تم کون ہو کیا ہو
ہر دور میں ہم تم تھے محبت کی علامت
رادھا کی طرح تم، تو کرشنا کی طرح میں
ہم میں وہی رشتہ ہے جو ہے ارض و سما میں
تم پاربتی جیسی ہو، شیوا کی طرح میں
اک موج نسیم سحری ہے کہ رواں ہے
جو آنکھ سے اوجھل سہی، نزدِ رگ جاں ہے

حمایت علی شاعر کے فکری پس منظر کی تلاش میں ہمیں ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جو خود کو دریافت کرتی نظر آتی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی نظم ''آئینہ در آئینہ'' جسے انھوں نے اپنی منظوم سوانح حیات کا ''حرف آخر'' کہا ہے قابل مطالعہ ہے۔

ان کی چند ایک نظمیں ایسی بھی ہیں جو اس اسلوب سے ہٹ کر راست گوئی کی تعریف میں آتی ہیں مگر ان کا انداز بیان تمثیلی ہے یا محاکاتی۔ یہ نظمیں اپنے بطن میں ایک خاص نکتہ رکھتی ہیں۔ ابتدا سے آخر تک بنیادی خیال پر ایک پردہ پڑا رہتا ہے۔ قاری جب آخری مصرعہ پر پہنچتا ہے تو پوری نظم کے

معنی روشن ہو جاتے ہیں۔ یہ مختصر نظمیں ہیں ان میں ندرتِ خیال بھی ہے اور ندرتِ بیان بھی۔ ایک مختصر ترین نظم ملاحظہ کیجیے:

سہمی سہمی کھل رہی تھی اک کلی
میں نے پوچھا کیا خزاں کا خوف ہے؟
جی نہیں اک دن خزاں تو آئے گی
پھر؟ سنا ہے! اس نے چپکے سے کہا
اس چمن کا باغباں گلچیں بھی ہے

ایک اور نظم دیکھیے۔ اس نظم کے محرکات میں علامہ اقبال کا ایک مصرعہ:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم

اور ٹیگور کی ایک نظم سورج اور چراغ کے حوالے ہیں۔ سورج جاتے ہوئے کہتا ہے اب کون اس گھر کو روشن رکھے گا چراغ دست بستہ کہتا ہے میں یہ خدمت انجام دیتا رہوں گا۔ چراغ کے لہجے میں احساس کمتری محسوس ہوتا ہے مگر علامہ اقبال کے مصرعے میں قدرت سے ''تقابل'' کا لہجہ ہے کیوں کہ چراغ ''انسانی تخلیق'' ہے۔ حمایت صاحب نے اپنی نظم ''جواب'' میں سورج کے غرور کو نیچا دکھایا ہے۔

سورج نے جاتے جاتے بڑی تمکنت کے ساتھ
ظلمت میں ڈوبتی ہوئی دنیا پر کی نظر
کہنے لگا کہ کون ہے اب اس کا پاسباں
میرے سوا ہے کون زمانے کا راہبر
میں تھا تو اپنی راہ پہ تھی گامزن حیات
اب میں نہیں رہوں گا تو یہ ساری کائنات
ظلمات میں بھٹکتی پھرے گی تمام رات
سورج یہ کہہ کے جا ہی رہا تھا کہ اک دیا
چپکے سے جل اٹھا اور اسے دیکھنے لگا

دیے کا اسے خاموشی سے دیکھنا اس کی خود اعتمادی اور احساس فخر کی علامت ہے۔ حمایت صاحب

کی نظم میں علامہ اقبال کا فیضان صاف جھلکتا ہے۔ ٹیگور کی نظم میں ''دیا'' سورج کے سامنے سر جھکا کے بات کرتا ہے۔ ''دیا'' انسان کی قابلِ فخر تخلیق محسوس نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ دونوں شاعر بڑے اور عہد آفریں شاعر ہیں۔ حمایت صاحب نے دونوں سے روشنی حاصل کی مگر ''چراغ آفریدم'' میں جو نکتہ پنہاں ہے اس نے ان کی نظم کو ایک خاص زاویہ دے دیا۔ یہ نظم ایک طرح سے ''انسانی عظمت'' کا قصیدہ ہے۔ حمایت صاحب کی شاعری میں انسان کی عظمت مختلف زاویوں سے نمایاں ہوتی رہتی ہے۔ ''سمندر انسان'' بھی اسی حقیقت کا آئینہ ہے لیکن وہ ''جبر'' جو فطرت کی طرف سے عائد ہوتا ہے وہ بھی اس کا مقدر ہے۔

میرے ماتھے پہ کتبۂ تقدیر
تری موجیں ترے لیے زنجیر

وہ ''جبر'' جو سماج اور معاشرہ عائد کرتا ہے وہ ایک نظم ''تضاد'' میں دیدنی ہے۔ ایک طرف تسخیر کائنات کا عمل یعنی سربلندی کا احساس:

نہ جانے میں کس خیال میں گم
کس ابر پارے میں اڑ رہا تھا
غرور سے سر بلند کر کے ہر اک ستارے کو دیکھتا تھا

اور دوسری طرف یہ مصرعے جو نظم کا نقطۂ عروج ہیں:

کہ ایک دلدوز چیخ گونجی
فضا کی خاموش وسعتوں میں
گلی سے اک ہڈیوں کا ڈھانچہ گزر رہا تھا
جو چیخ کر ایک اک سے کہتا تھا
ایک روٹی۔ خدا تمھارا بھلا کرے گا

طبقاتی سماج میں بلند و پست کے یہ مناظر انسانی معاشرے میں طنز بن کر رہ جاتے ہیں اور انسانی عظمتوں کے بلند مینار ایک جھٹکے میں زمین پر آ جاتے ہیں۔

حمایت صاحب کی نگاہ ہر معاشرتی تضاد پر رہتی ہے۔

آدمی کتنا عظیم ہے
آدمی کتنا حقیر ہے

یہ وہ نظمیں ہیں جن سے تاریخ کا شعور جھلکتا ہے۔انسان آج تک جنگل لائف سے باہر نہیں آسکا، آج تک مہذب نہیں ہو سکا، اس کا سبب کیا ہے؟ ان کی مختلف نظمیں ان وجوہ پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔

ایک نظم ''سنگِ میل'' میں کیسا خوب صورت اور معنی خیز اشارہ ہے۔

میں ہوں اس دشتِ طلسمات کا وہ شہ زادہ
جس کے سر پر ہے فلک، گنبد بے در کی طرح
میری منزل مرے سینے پہ لکھی ہے لیکن
اپنی ہی راہ میں حائل ہوں میں پتھر کی طرح
رہ نما ہوں، مگر اک گام نہیں چل سکتا
ایسی اک ضرب کہ ٹوٹے یہ مسلسل سکتہ

یہاں میں نے جن نظموں کے حوالے دیے ہیں ان میں معاشرے کی ہر وہ خامی نمایاں ہے جو ہمارے پاؤں کی زنجیر
بنی رہتی ہے۔ کہیں تقدیر، کہیں طبقات، کہیں ہوس، کہیں افلاس، ان تمام خامیوں پر قابو پانے کے لیے پھر کسی عیسیٰ کی ضرورت ہے:

آ کہ ہو پھر کسی عیسیٰ کا ورود

ممکن ہے آپ کا ذہن ''مسیحِ موعود'' کے عقیدے کی طرف چلا جائے۔ حمایت صاحب کسی بھی غیر عقلی بات کے طرف دار نہیں ہیں، وہ تاریخ کی جدلیات کی روشنی میں کسی انقلاب کے آرزومند ضرور ہیں۔ وہ انقلاب ماضی سے نہیں آئے گا وہ انقلاب مستقبل عطا کرے گا۔

☆☆

رومانی شاعری

حمایت صاحب کی رومانی شاعری پر بات کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ اردو شاعری میں رومانی

تحریک کا مختصر جائزہ لیا جائے۔ عام طور پر جنگ کا تصور تباہی اور بربادی کا نظارہ پیش کرتا ہے اور خاص طور پر دونوں عالمی جنگوں نے تو دنیا پر بہت دور رس اثرات مرتب کیے جن کی جھلکیاں آپ کو آج بھی اس ترقی یافتہ معاشرے میں بھی نظر آجاتی ہیں لیکن اردو ادب کے لحاظ سے ان دونوں جنگوں کا زمانہ دو بہت اہم رجحانات کی پرورش کا زمانہ ہے۔ جس میں ایک رجحان رومانیت کا عطا کردہ اور دوسرا ترقی پسند تحریک کی دین ہے۔ رومانیت بنیادی طور پر انگریزی تصور ہے اور اک منفی تصور ہے جو کلاسیکیت کے ردِّعمل کے طور پر انگریزی ادب میں ظہور پزیر ہوا۔ عقلیت، میانہ روی اور اصول پرستی کلاسیکیت کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن کے الفاظ میں ''رومانیت اس اصول پرستی، عقلیت اور میانہ روی کے خلاف صاعقہ بردوش بغاوت ہے۔ کلاسیکی انسان دنیا اس کی زندگی اور حسن جن خانوں میں بانٹ کر اور اصولوں میں تقسیم کر کے مطمئن ہو گیا تھا رومانیت نے اس پر کاری ضرب لگائی۔''[۱] انگریزی ادب کا مطالعہ یوں تو انیسویں صدی کے اواخر میں ہی شروع ہو گیا تھا لیکن یہ مطالعہ محدود تھا۔ البتہ بیسویں صدی کے اوائل میں نئی نسل کے بعض ذہین افراد نے باقاعدہ طور پر انگریزی ادبیات کا مطالعہ کیا۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان میں قومی تحریک بھی بڑے زور و شور سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اس تحریک نے قوم کے بخت خفتہ کو بیدار کر دیا اور اس اُبھرتی ہوئی قوم نے اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ دوسرے ممالک کی تحاریک آزادی کا مطالعہ کیا اور اس مطالعے سے اسے ہمت حوصلہ اور امید کی دولت نصیب ہوئی انگریزی کے علاوہ دوسری زبانوں کے ادبیات کے مطالعے پر توجہ دی گئی اور ان سے استفادہ کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو نثر میں رومانیت کی ابتدا انگریزی کے بجائے تراجم سے ہوتی ہے۔ سجاد حیدر یلدرم نے ترکی ادبیات پر خصوصی توجہ دی اور ترکی میں رومانیت کا اچھا خاصا اثاثہ موجود تھا۔ اسے اردو میں منتقل کیا گیا۔ نئے خیالات، نئے اسالیب اور نئے الفاظ و تراکیب نے ذہن کی ساخت پر اثر ڈالا۔ یہ نوساختہ اور ولولہ انگیز ذہن رومانیت کو فروغ دینے میں بڑا معاون ثابت ہوا۔

ادھر بعض لوگوں نے جدید تہذیب کی تشکیل کے لیے ماضی کی شاندار روایات کے احیاء تحفظ پر زور دیا۔ ماضی پرستی ایک غالب رجحان بن کر اُبھری اور اس دور کا شاید ہی کوئی بڑا شاعر اس رجحان سے بچ سکا ہو۔ ماضی پرستی رومانیت کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ آگے چل کر رومانی شعرا نے اس

سے بڑے کام لیے۔ جنگ عظیم کے فوراً بعد رومانی تحریک کے فروغ پانے کی ایک اہم وجہ دورانِ جنگ کی خوں ریزی اور تباہ کاری بھی تھی۔ ان حالات نے زندگی سے فرار اور ذہنی سکون کی تلاش شروع کی ادب میں یہ رجحان رومانیت کے فوری فروغ کی صورت میں نظر آتا ہے پہلی جنگ عظیم کے فوراً بعد رومانی رجحانات پیدا ہوئے اور چند سالوں میں پوری ادبی دنیا پر رومانوی فن کار قابض ہو گئے۔ اس کی وجہ یہی حرماں نصیبی تھی۔

ڈاکٹر محمد حسن[1] کا خیال ہے کہ ''اردو ادب میں رومانی تحریک کو کئی غیر متوقع وسائل سے مدد ملی۔ اس سلسلے میں ٹیگور کی ماورائیت، اقبال کی روایت شکنی اور ابوالکلام کی انفرادیت خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔'' جہاں تک شاعری کا تعلق ہے رومانی اثرات سب سے پہلے اقبال کے ہاں نظر آتے ہیں۔ اقبال کی شخصیت اور ان کی شاعری واقعتاً اتنی ہمہ گیر ہے کہ اس پر کسی خاص رجحان کا لیبل لگانا بہت مشکل ہے۔ پھر بھی ان کے کلام میں بعض ایسی نمایاں خصوصیات موجود ہیں جو ان کی رومانیت کو بے نقاب کرتی ہیں۔

اقبال[2] کے بعد رومانی رجحانات کو فروغ دینے میں جوش ملیح آبادی پیش پیش نظر آتے ہیں خواہ موضوع کچھ بھی ہو ان کا رومانی نقطۂ نظر ہر موضوع پر حاوی دکھائی دیتا ہے۔ جوش کے بعد رومانیت کے میدان کے بہت بڑے علمبردار اختر شیرانی ہیں ان کے بعد حفیظ اور عظمت اللہ خان کے نام آتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض اور شعرا نے بھی رومانی سرمائے میں اضافے کی کوشش کی لیکن صرف رومانیت کے دور انحطاط کی یادگار بن کر رہ گئے لیکن پھر بھی ان کی خدمات کے پیش نظر ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان شعرا میں روش صدیقی، ساغر نظامی، اختر انصاری، احسان دانش، حامد اللہ افسر، کنیز فاطمہ حیا اور عزیز جہاں بیگم ادا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔''

اردو شاعری میں رومانیت کا خصوصی مطالعہ کرنے کے دوران یہ بات سامنے آتی ہے کہ رومانیت کی بنیادی خصوصیات کو جس طرح اختر شیرانی نے اپنی شاعری میں سمویا اور ان سے استفادہ کیا اس کی دوسری کوئی مثال اردو شاعری میں ہمیں نظر نہیں آتی اختر شیرانی کو بلاشک و شبہ رومانی شاعری کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے بلکہ ڈاکٹر محمد حسن نے تو اس حوالے سے دوٹوک فیصلہ سنایا ہے۔ ''اختر یا رومانی شاعر ہیں یا کچھ نہیں۔''

یورپ[3] میں رومانیت کی ابتدا تحریک اصلاح کے بعد ہوتی ہے اور ۱۷۸۰ء سے ۱۸۳۰ء تک جاری

رہی مغرب میں رومانیت کلاسیکیت کے ردِ عمل کی صورت میں پیدا ہوئی اس لیے کلاسیکیت کے بغیر رومانیت کا تصور بے معنی ہے۔ اردو شاعری میں بلاشبہ ایسا سرمایہ موجود ہے جس کو رومانی شاعری کہا جا سکتا ہے اور اس سلسلے میں ابتدائی طور پر مثنویوں کے نام لیے جا سکتے ہیں کیوں کہ ان میں عشق کی عموماً سچی اور معروف داستانیں ہی نظم کی گئی ہیں۔

گو کہ بعض فارسی مثنویوں کو بھی اردو کے قالب میں ڈھالا گیا لیکن ان کا مقصد بھی دراصل داستان سرائی اور ذہنی کیف و سرور کے جذبات کی عکاسی کرنا تھا اور زندگی کی تلخیوں اور زیست کرنے کی جدوجہد سے نبرد آزما ہونے کے لیے ذہن و دل کو وقتی ہی سہی لیکن سہارا مل جاتا تھا۔

اردو[4] ادب میں داستانوں کا ایک قابل فخر سرمایہ ایسا موجود ہے جس میں رومانی فکر نمایاں طور پر کارفرما نظر آتی ہے۔ اردو ہی میں رومانی تخیل کو جلا بخشنے والا ایک اور طاقت ور عنصر جنت کا تصور بھی ہے اور چونکہ اردو پر مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا گہرا اثر رہا ہے اس لیے اس تمدن کی فلسفیانہ بنیادیں بھی ادب کا جزو بن گئی ہیں مسلم تہذیب کی بنیاد جنت کے تصور پر استوار ہے اور جنت کا تصور خالص رومانی تصور ہے جو رومانی فن کار کے اس خواب کی تعبیر ہے جو وہ عرصہ دراز سے دیکھتا رہا ہے جس کی جستجو میں وہ اضطراب آشنا رہا ہے اور جس کو نہ پانے سے اس کی زندگی سراپا کرب و الم بن گئی ہے۔ مندرجہ بالا حوالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو ادب میں ایسے عناصر موجود تھے جو رومانی کہے جا سکتے تھے۔

حسن و عشق اور ہجر و وصال کے مضامین سے اردو شاعری، (بالخصوص غزل اور مثنویاں) بھری پڑی ہے۔ مثنویوں میں فرضی کہانیوں اور خیالی کرداروں کی معرفت حقیقت حال کا بیان ہوتا ہے، مگر غزلوں میں صنفی اختصار کے سبب کوشش کی جاتی ہے کہ بڑی سے بڑی بات کم سے کم الفاظ میں بیان کر دی جائے۔ غزل زندگی کے متنوع تجربات کی عکاسی کرتی ہے، مگر زیادہ تر وہی موضوعات ہوتے ہیں جو حسن و عشق کے معاملات اور ہجر و وصال کے کرب و انبساط کے آئینہ دار ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ جب حقیقت واقعہ نگاری کی سطح پر آگے بڑھنے لگتی ہے تو ہمارے تہذیبی حجابات آڑے آجاتے ہیں اور شعرائے کرام عشق مجازی کو عشق حقیقی کی منزلوں میں پہنچا کر تصوف کی معرفت خدا اور بندے کے تعلقات دریافت کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

ہندوستان میں تصوف اور ویدانت زندگی کے بنیادی عقائد میں شامل ہیں اس لئے شاعری میں بھی

انھیں اولیت حاصل ہے۔ ولی اور میر سے لے کر غالب اور مومن تک عشقیہ جذبات کے ساتھ ساتھ صوفیانہ فکر بھی متوازی انداز میں چلتی نظر آتی ہے۔ غالب کے اشعار میں البتہ روایتی فکر کے خلاف جھنجھلاہٹ اور غصہ بھی نمایاں ہوتا ہے اور مومن کے یہاں عشق قدرے حقیقت آشنا نظر آتا ہے۔ لیکن پورے معاشرے پر تہذیبی حجابات کے دبیز پردے پڑے ہونے کے باعث شاعرانہ اظہار اپنی مخصوص حدود سے باہر نہیں نکل سکا۔ محبوب کا ذکر ''صیغۂ تذکیر'' میں ہوتا رہا اور زندگی کی سچائیاں پس پردہ ہی رہ گئیں۔ یہاں تک کہ اقبال جیسا شاعر بھی یورپ میں تعلیم پانے کے باوجود جب اپنے محبوب کی گود میں بلّی دیکھتا ہے تو اپنی نظم میں صرف اتنا لکھ کر رہ جاتا ہے کہ:

''.....کی گود میں بلّی دیکھ کر'' (بانگ درا)

فرضی نام رکھنے کا حوصلہ بھی پہلی بار اختر شیرانی کو ہوا وہ ''سلمیٰ'' کے نام سے اپنی محبوبہ سے مخاطب ہوئے۔ اردو شاعری میں حقیقت نگاری کی یہ کوشش ابتدائی کہی جا سکتی ہے جو عشق کو تصورات سے نکال کر زمین پر پاؤں رکھنے پر آمادہ کرتی ہے۔ حسن بھی اپنے انسانی روپ میں نظر آتا ہے اور حسن و عشق کے معاملات بھی انسانی سطح پر طے پاتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اختر شیرانی کی شاعری اپنے جذبات و محسوسات کے اظہار میں اتنی ہمہ گیر اور شعری کیفیات کی حامل نہیں جتنی غزل کے ادب عالیہ میں ہم دیکھتے ہیں۔ مگر یہ شاعری تصوف میں پناہ نہیں لیتی بلکہ زمینی سطح پر اپنی سچائیوں کا اظہار کرتی ہے۔

اختر شیرانی کے بعد یہ روایت سنور کر فیض احمد فیض، مجاز اور مخدوم کی شاعری میں نمایاں ہوتی ہے اور پھر ساحر لدھیانوی سے لے کر احمد فراز تک نکھرتی ہی چلی جاتی ہے۔ حمایت علی شاعر، احمد فراز کے ہم عصر ہیں۔ فراز کو تو غزل نے اپنا لیا اور وہ ہمارے عہد کے ایک خوب صورت شاعر بن گئے مگر صرف غزل کی حد تک۔ حمایت صاحب نے نظم میں اپنا سفر جاری رکھا وہ ''غم دوراں'' سے نکل کر جب ''غم جاناں'' کی طرف آئے تو فیض صاحب کے الفاظ میں۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

اور

تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے

جیسے محسوسات اور زندگی کے حقائق جو ان کے تحت الشعور میں بسے ہوئے تھے اپنے پیشروؤں کی

طرح ان کی رومانی شاعری میں بھی در آئے۔ ''آگ میں پھول'' (۱۹۵۶ء) کے آغاز میں حمایت علی شاعر نے جو شعر لکھا ہے اسی سے ان کی شعری فکر کا اندازہ ہو جاتا ہے:

فکر معاش کھا گئی دل کی ہر اک امنگ کو
جائیں تو لے کے جائیں کیا حسن کی بارگاہ میں

ان کی رومانی نظمیں بھی مسائل حیات سے آلودہ ہیں مگر وہ نظمیں جو نوجوانی کے اولین خوابوں میں آباد تھیں، بلاشبہ بہت خوب صورت نظمیں ہیں اور ایسے محسوسات اور جذبات کی ترجمان ہیں جن سے انسان پہلی بار آشنا ہوتا ہے۔ جن سے انسان کا ''اندرونی وجود'' جھلکتا ہے جو:

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

کے مصداق گرد و پیش سے بے نیاز صرف اپنی ذات میں گم رہتا ہے، جو ایک بے نام شے سے سرشار ہوتا ہے اور جس کے بیان کے لیے صرف ایک شاعر کا دل اور ایک شاعر کی زبان درکار ہوتی ہے۔ ''آگ میں پھول'' کی پہلی رباعی ہے:

یوں کتنی نگاہوں کا سندیسہ نہ ملا
دل ایسا تھا پتھر کہ کسی کا نہ ہوا
اب حال مگر یہ ہے کہ دھڑکن نہ سکوت
کیا جانیے اُس اک نظر میں کیا تھا

جب میں نے یہ رباعی پڑھی تو میرا جی بے اختیار چاہا کہ میں اس ''نظر'' کی کھوج لگاؤں جواب سے نصف صدی قبل اس لمحے کی محرک بنی اور ایک تصور کو حقیقت کا روپ دے دیا۔ ایک بار میں نے حمایت صاحب سے اس بارے میں پوچھا بھی تو وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے پھر میرے بہت اصرار پر کہنے لگے۔

''شعر اسے پس منظر نہیں پوچھا جاتا۔ اس کے پیچھے جو افسانہ ہے اسے افسانہ ہی رہنے دو ورنہ وہ محدود ہو جائے گا۔ شاعری کا تو کمال ہی یہ ہے کہ

جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

اسے آئینہ در آئینہ اور عکس در عکس ہی دیکھتی رہو تو اچھا ہے۔''

حمایت صاحب کی رومانی نظموں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کچھ سچائیاں بھی پوشیدہ ہیں۔

اس رباعی کے بعد پہلی نظم ''جنت نگاہ'' جس کیفیت کا آئینہ دکھاتی ہے وہ خود اس کا ثبوت ہے:

آج یہ کس سرزمیں کا آسماں آنکھوں میں ہے
جو کبھی دیکھا نہیں تھا وہ سماں آنکھوں میں ہے
اب سے پہلے تو کبھی اتنی حسیں دنیا نہ تھی
آج کس کا حسن، زیرِ آسماں آنکھوں میں ہے
خواب میں بیدار ہوں یا ہے یہ بیداری کا خواب
روح میں حسنِ یقیں، حسنِ گماں آنکھوں میں ہے
دل کی دھڑکن میں ہے رقصِ بے خودی کی کیفیت
آنکھ سے اوجھل تھا جو، وہ جانِ جاں آنکھوں میں ہے

یہ سماں بتدریج ان کی نظموں میں اپنا عکس نمایاں کرتا جاتا ہے۔ دوسری نظم ''حسن بے نام'' کا پہلا اور آخری شعر بھی یہی گواہی دیتا ہے کہ دیکھنے والے پر کیا گزر رہی ہے:

آنکھوں میں بسا رہتا ہے وہ پھول سا چہرہ
وہ پیکرِ گل جس کا کوئی نام نہیں ہے

اور آخری بند بھی پڑھ لیجیے:

یہ خدوخال ہیں میرے لیے اتنے مانوس
جیسے خود میرے تصور نے تراشا ہے انھیں
حسن کے جتنے مقامات ترے جسم میں ہیں
اپنے ہاتھوں تیرے پیکر میں سجایا ہے انھیں

شاعر بھی ایک تخلیق کار ہوتا ہے، بقول حمایت علی شاعر ''وہ اپنی ذات میں اپنے خلاق کا ہمزاد ہوتا ہے۔''

اپنی تخیل میں آباد ہوں میں
اپنے خلاق کا ہمزاد ہوں میں
(اقبال اور میں)

حمایت علی شاعر کی نظم ''پیکر خیال'' اس شعر پر ختم ہوتی ہے:

اب تو جی چاہے کہ بس تیرا سراپا لکھوں
جب بھی لکھوں ترے پیکر کا قصیدہ لکھوں

حمایت صاحب کی ساری عشقیہ شاعری اسی ''پیکر کا قصیدہ'' ہے۔ انھوں نے اپنے محبوب کو جب جب، جس جس زاویے سے دیکھا، اس سے ملے یا اس کے بارے میں سوچا مختلف نظموں کی صورت میں اسے لکھتے رہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک حقیقت پسند شاعر ہیں۔ ان کی ایک نظم کا عنوان ہے ''حسرتِ قرب'' اس کا آخری شعر یہ ہے:

ایسے کافر سے تو ایمان ہے بیعت کرنا
خلوتِ خاص اس بُت کی عبادت کرنا

اس شعر سے ان کے ''ایمان'' کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور ان کے ''کفر'' کا بھی۔ اسی طرح ایک نظم کا عنوان ہے ''تیری آنکھیں'' اس نظم میں انھوں نے عشق کی ہر کیفیت، ہر آرزو نظم کر دی ہے۔ آپ بھی دیکھیے:

تو ساتھ ہو کہ نہ ہو زندگی کی راہوں میں
رہیں ہمیشہ مری ہم سفر تری آنکھیں
طلوع ہو تری پلکوں کے سائے میں ہر صبح
جھکی رہیں مری ہر شام پر تری آنکھیں
خدا کرے میں بس جاؤں تیری آنکھوں میں
کیے رہیں مری آنکھوں میں گھر تری آنکھیں

آپ حمایت صاحب کی کوئی نظم اٹھا کر دیکھیے۔ پرتو، سکوت مضطرب، تشنگی کا سفر، بہروپ، ان کہی، تیری باتیں تیرے خواب، بازگشت۔ ان کی ہر نظم ایسی ہی کیفیتوں کی آئینہ دار ہے۔ وہ قرب میں دوری اور دوری میں قرب کی تصویر بن جاتی ہیں۔ کہیں خود فریبی کا احساس ہوتا ہے، کہیں حسن نظر کا اور حقیقت بول اٹھتی ہے۔ چند اشعار آپ بھی ملاحظہ کیجیے:

گرچہ آئینہ در آئینہ ہے ہر سو رخ دوست
ایسی تنہائی کا عالم ہے کہ جی جانتا ہے
(سکوت مضطرب)

کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ حسن دلدار
میری تخیل کے پرتو کے سوا کچھ بھی نہ ہو
اضطراب اور سکوں کی یہ کشاکش یہ ستیز
خود فریبی کی تگ و دو کے سوا کچھ بھی نہ ہو

(پرتو)

یہی تو رات تھی جب ہم ملے تھے پہلے پہل
سکوتِ دل میں نہاں تھے ہزارہا طوفاں
نظر نظر سے عیاں تھا، حجاب کیف نہاں
لرزتے ہونٹ تھے چپ چاپ محوِ ناز و نیاز
نفس کی آنچ میں پگھلے ہوئے تھے جسم و جاں
نہ فکر دوش نہ اندیشۂ غم فردا
نشاطِ قرب نے پہنچا دیا تھا جانے کہاں
اور ''ان کہی'' تو ان کی معرکۃ الآرا نظم ہے:
تجھ کو معلوم نہیں تجھ کو بھلا کیا معلوم

(بازگشت)

اس نظم میں جو حسرت ہے، جو امید و یاس ہے، نشاط اور کرب کی جو ملی جلی کیفیت ہے اسے سن کر اکثر دلوں نے دعا مانگی کہ خدا ان کی آرزو پوری کردے۔ جس کو معلوم نہیں اسے معلوم ہو جائے کہ کوئی اسے کتنا چاہتا ہے۔ خدا کرے اس کے دل میں بھی ایک چراغ روشن ہو جائے۔ اس کا دل بھی محبت کی خوشبو سے مہک اٹھے اور وہ ہوا کے دوش پر اڑتے ہوئے وہاں پہنچ جائے جہاں اس کی منزلِ مقصود ہے۔ میں نے جب بھی اس نظم کو پڑھا مجھے حمایت صاحب ہی کا ایک شعر یاد آیا۔

جب بھی ملتے ہیں کہیں دو دل بہت ہی پیار سے
مسکرا اٹھتی ہیں آنکھیں اور بھر آتا ہے دل

یہ شعر اپنے اندر ایک بڑی عجیب کیفیت رکھتا ہے۔ اس میں دو محبت بھرے دلوں کے ملنے کی مسرت بھی ہے اور اپنی محرومی کا احساس بھی۔ سچا عشق انسان کو اعلیٰ ظرف بنا دیتا ہے فیض صاحب تو رقیب

سے بھی محبت کرنے لگتے ہیں۔ حمایت صاحب کے عشق میں ایسا ''سانحہ'' تو خیر نہیں ہے لیکن وہ فیض صاحب کی طرح سب سے محبت کرنے لگے ہیں۔

انھوں نے جس سے بھی محبت کی ہے وہ ایک خوش نصیب انسان ہے اور جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے کہ یہ نظمیں پڑھ کر دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ ان کے پس منظر سے آگاہی حاصل ہو۔ جب ان کی منظوم سوانح حیات ماہنامہ ''افکار'' میں قسط وار چھپنے لگی (اگست ۱۹۹۵ء سے ستمبر ۱۹۹۹ء تک) تو میں ہر ماہ بڑی پابندی سے ''افکار'' پڑھتی رہی۔ آخر قسط نمبر ۸ میں مجھے ''وہ صورت'' نظر آ گئی جو ان کی اولین رباعی اور ان تمام نظموں کی محرک تھی۔ اس وقت تک حمایت صاحب کو میں اپنے ملک کے ایک مشہور شاعر کی حیثیت سے جانتی تھی۔ میرے افسانے اور مضامین بھی مختلف اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے تھے، ان میں بھی حمایت صاحب کی کوئی غزل، نظم یا کوئی مضمون چھپا ہوتا، یوں وہ مسلسل میرے مطالعہ میں رہتے تھے۔ ایک روز میں نے دوران گفتگو اپنے والد اطہر ضیائی صاحب سے حمایت صاحب کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا ارے بھئی وہ تو بہت مقبول شاعر ہیں اور خصوصاً نوجوانوں میں تو بہت پسند کیے جاتے ہیں، ماشاء اللہ انھوں نے خوب نام پیدا کیا ہے۔ ان کا بڑا بیٹا روشن خیال تو خالد کا قریبی دوست ہے۔ واضح رہے کہ میرے بڑے بھائی خالد اطہر بھی صحافی ہیں اور ان کی دیگر کتابوں کے علاوہ مضامین اور انٹرویوز کی کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں جن میں حمایت صاحب کے حوالے سے بھی تحریریں شامل ہیں جو میں نے پڑھی ہیں، والد صاحب سے اس گفتگو کے بعد مجھے حمایت صاحب اور بھی قریب محسوس ہونے لگے۔ آج لکھنے بیٹھی ہوں تو بہت کچھ ذہن میں تازہ ہو گیا۔ ان کی کچھ غلاطیاں بھی یاد آ گئی ہیں، غلاطی حمایت علی شاعر کی ہی ایجاد ہے۔ اس کے بارے میں آگے چل کر تفصیل سے لکھوں گی۔ فی الحال زیر گفتگو موضوع سے متعلق کچھ غلاطیاں ذہن میں ہیں۔

جب بھی دیکھا اسے تو یاد آئے
چاند کے گرد گھومتے تارے
دھوپ کے پیچھے بھاگتے سائے

☆☆

میں ہوں اپنے نشے میں کھویا ہوا
آنکھ کیسے کھلے کہ میٹھی نیند
زیرِ مژگاں ہے کوئی سویا ہوا

☆☆

دیکھ کر اس کو اور کیا دیکھوں
اب تو یوں بس گیا ہے وہ مجھ میں
جب بھی دیکھوں تو آئینہ دیکھوں

ایسی شخصیت کو دیکھنے کو کس کا جی نہ چاہے گا۔ جب میں نے ''آئینہ در آئینہ'' کی آٹھویں قسط پڑھی تو یوں لگا جیسے دریا کے پار اتر گئی۔ دراصل اس قسط میں حمایت صاحب نے اورنگ آباد کے قریب ایک چھوٹے سے شہر جالنہ کا ذکر کیا ہے جہاں ان کے دور کے عزیز رہتے تھے۔ لکھتے ہیں:

میں ان کے گھر میں بہت کم ہی آتا جاتا تھا
دراصل ان سے مرا دور ہی کا ناتا تھا
مگر جو اب کے گیا تو عجب ہوا احساس
کہ جیسے ایک اجالا ہوا ہے دل کے پاس
کھڑی تھی سامنے اک خوش جمال دوشیزہ
سلیقہ مند، بڑی خوش خصال دوشیزہ
یہ ان کی بیٹی تھی، ''معراج'' نام تھا اس کا
مصورانہ شغف صبح و شام تھا اس کا
نظر نظر سے ملی اور جھک گئی چپ چاپ
جہاں رکی تھی، وہیں آپ رک گئی چپ چاپ
بس اتنا یاد ہے، اک زیر لب تبسم تھا
درون دل، کوئی خاموش سا ترنم تھا
ادب کے ساتھ، جب اس نے مجھے سلام کیا
اور اس کے بعد جو ہم نے بہم کلام کیا

نہ جانے کتنے ہی اشعار جاگ اٹھے مجھ میں
جو صف بہ صف پئے اظہار جاگ اٹھے مجھ میں
مگر میں چپ رہا، اک شعر بھی سنا نہ سکا
اشارتاً بھی اسے رازِ دل بتا نہ سکا

یہ حمایت علی شاعر کی رومانی شاعری کا آغاز ہے۔ سوانح حیات میں انھوں نے اپنی مختلف کیفیات کا ذکر تفصیل کے ساتھ بہ تسلسل کیا ہے۔ اس قسم کے واقعات میں ایک ایک لمحہ ایک ایک نظم کے مترادف ہوتا ہے۔ ہر لمحہ ایک نیا زاویہ، ایک نیا تصور، ایک نیا جذبہ اور ایک نئی دنیا لیے آتا ہے اور انسان کو ایک نئی مسرت سے آشنا کر دیتا ہے۔ اس عالم میں جو غم بھی ملتے ہیں وہ بھی مسرتوں سے بھرپور ہوتے ہیں۔ ان لمحوں میں کیا کچھ ہوتا ہے، یہ وہی لوگ جانتے ہیں جو عشق کرتے ہیں اور مجسم ''دل'' بن جاتے ہیں۔ حمایت صاحب کی تمام کتابوں میں ایسی نظمیں اور ایسے اشعار بکھرے پڑے ہیں جو محبت بھرے دلوں کے ترجمان ہیں، ان میں اس دور کا کلام خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہے جس میں کورے اور کھٹکتے جذبات کی غنائیت اور حرارت، دل کی دھڑکن بن گئی ہے۔ اس سلسلے کی کچھ مثالیں میں دے چکی ہوں کچھ آئندہ پیش کی جائیں گی لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ آپ ان لمحات سے بھی واقف ہو جائیں جو ان کی زندگی میں اوّلین تجربے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ جس کشمکش سے گزرے، جس کیفیت کو سمجھنا چاہا اور پھر ایسے سرشار ہوئے کہ آج تک اس کا نشہ ان پر طاری ہے، وہ سب انھوں نے اپنی سوانح میں بہت تفصیل سے لکھا ہے، میں یہاں کچھ جھلکیاں آپ کو دکھا رہی ہوں۔ جالنہ سے جب وہ چلے تو ان کی کیفیت کیا تھی یہ ملاحظہ فرمائیے:

میں جب وہاں سے چلا تو عجیب عالم تھا
کہ دل میں پھول کھلے تھے اور آنکھ میں نم تھا
قدم قدم پہ یہ لگتا، قریب تر ہے کوئی
ہوا کی طرح یہ ہر گام ہم سفر ہے کوئی

حمایت علی شاعر نے اپنی محبت کو کامیابی کی منزل تک کس طرح پہنچایا وہ تو ان کی منظوم سوانح حیات پڑھ کر ہی آپ کو معلوم ہوگا، میں صرف وہ منظر آپ کو دکھانا چاہتی ہوں کہ جب وہ کامیاب تو ہو گئے مگر ایک کرب انگیز مسرت کے ساتھ۔ انھوں نے اپنے خاندان سے بغاوت کر کے یہ مسرت

حاصل کی تھی۔ (ان واقعات کی ترجمان ان کی نظم ''ادھوری کہانی'' ہے) اب وہ منظر دیکھیے جو بظاہر بہت حسین ہے لیکن:

وہ رات، ہاں وہ مری سب سے خوب صورت رات
وہ میرے کلبۂ ویراں میں نور کی برسات
خزاں میں جیسے وہ ایک کھلتے پھول سی ساعت
خوشی لٹاتی ہوئی وہ ملول سی ساعت
ملول یوں کہ نہ والد نہ والدہ موجود
عجب نصیب تھا میرا کہ بود بھی نابود
بس ایک حضرت مسلم ضیائی کا سایہ
خدا کی طرح تھا میرا تمام سرمایہ
اگرچہ دوست تھے اور اقربا بھی تھے موجود
اداس اداس سی لگتی تھی ساعت مسعود

یہ منظوم سوانح حیات چوں کہ اردو شاعری میں پہلی بار لکھی گئی ہے اس لیے میں آگے چل کر اس پر تفصیل سے لکھوں گی کہ یہ صرف ایک فرد کی آپ بیتی نہیں ہم سب کی کہانی ہے۔ اس میں ہمارے مشترکہ دکھ سکھ بھی ہیں اور وہ مسائل بھی جو ہر لمحہ ہمیں دعوت فکر دیتے ہیں۔ جہاں تک ان کی عشقیہ شاعری کا تعلق ہے انھوں نے خود بھی اعتراف کیا ہے۔

میں خوش نصیب ہوں کتنا کہ جس سے عشق کیا
بہ فیض جذبۂ دل اس کو میں نے پا بھی لیا
مرے کلام میں جو ہے اسی کا پرتو ہے
اسی کے نکہت و رنگ اور اسی کی اک ضو ہے
لکھا ہے جو بھی وہ اپنے ہی واسطے سے لکھا
غم جہاں بھی غم دل کے راستے سے لکھا
میں اپنے عشق میں ثابت قدم رہا کتنا
اور اپنی ذات میں ''خود محترم'' رہا کتنا

ملیں گی اس کی مثالیں یہاں مگر کم کم
کہ لوگ ہوتے ہیں دنیا میں بخت ور کم کم

اس آپ بیتی کے آخر میں ایک طویل نظم ''حرف حرف روشنی'' کے عنوان سے بھی شامل ہے، یہ اپنے بچوں کے نام ایک نصیحت ہے۔ یہ نصیحت جسے حمایت صاحب نے ''وصیت'' سے موسوم کیا ہے، ترک وطن کرنے والے ''مہاجرین'' کی نسلوں کے نام بھی ہے اس میں تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے ماضی کا تجزیہ ہے اور مستقبل کے لیے ایک لائحہ عمل بھی..... نظم یوں شروع ہوتی ہے:

مرے لہو کے چراغو، مرے جگر پارو
سنو یہ میری نصیحت بھی ہے، وصیت بھی
میں آج تم میں ہوں موجود کل نہیں ہوں گا
مگر جو تم ہو تو میں ہوں سدا سلامت بھی
تم اپنا نقطۂ آغاز ہی سہی لیکن
تمھارے ساتھ رواں ہے مری روایت بھی
میں اپنے ماضی مرحوم کی امانت تھا
سو آج تم سے ہے منسوب یہ امانت بھی

حمایت علی شاعر کے کلام میں اپنی اولاد سے متعلق مخصوص نظمیں بھی ملتی ہیں۔ ان کے گھر جب پہلی بیٹی پیدا ہوئی تو انھوں نے اس کا نام ''جاوداں'' رکھا۔ وہ پہلی بار ''باپ کے رشتے'' سے آشنا ہوئے تھے اس نظم کے کچھ اشعار یہاں لکھتی ہوں تاکہ ان کے طرز فکر کا اندازہ کیا جا سکے:

یہ میری بیٹی یہ زندگی کے حسین خوابوں کی ایک منزل
مری محبت بھری رفاقت کا، میرے عہد وفا کا حاصل
یہ ننھی سی شمع جس کی لو میں، مرا لہو سانس لے رہا ہے
مری نگاہ و خرد کو رازِ بقا کا عرفان دے رہا ہے
میں سوچتا ہوں کہ فرد کی زندگی بھی کتنی جماعتی ہے
اک آدمی کے جسد میں اک کائنات خاموش سو رہی ہے

اور آخری تین شعر بھی قابل مطالعہ ہیں:

میں دیکھتا ہوں کہ میں تاریخ کے اک عمل سے گزر رہا ہوں
میں اپنے انجام تک پہنچ کر پھر اپنا آغاز کر رہا ہوں
مری شریک حیات اور میں، جو دو تھے اب ایک ہو گئے ہیں
ہمارے عہد وفا کے لمحات آج سب ایک ہو گئے ہیں
نئے خدوخال سے ہمارے جسد کی تشکیل ہو رہی ہے
ادھورا پن ختم ہو رہا ہے، ہماری تکمیل ہو رہی ہے

انھوں نے اپنے دو سالہ بیٹے روشن خیال کے حوالے سے بھی ایک نظم اپنی بیگم کو مخاطب کر کے لکھی تھی۔ اس کا عنوان تھا ''غم فردا'' اس میں ایک اور ہی زاویہ ملتا ہے:

اداس بیٹھی ہو کس لیے تم!
سنو! ذرا اس طرف تو دیکھو
تمھارا ننھا سا بچہ تم کو
اداس سا دیکھ کر تمھیں کن عجیب نظروں سے تک رہا ہے
تمھارے پیہم سکوت پر اس کا ننھا سا دل دھڑک رہا ہے
کوئی تبسم! کوئی تکلم!!

اور آخری بند یہ ہے:

زمانہ جوں جوں گزر رہا ہے
ہر ایک زنجیر کٹ رہی ہے
بساط عالم الٹ رہی ہے
یہ بات ممکن ہے اپنی آنکھیں نہ دیکھ پائیں وہ صبح فردا
مگر یہ ننھا سا بچہ جس نے ابھی ابھی پاؤں چلنا سیکھا
تمھارے چہرے سے ڈر رہا ہے

اس نظم کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا کے تاثرات بھی پڑھ لیجیے۔ لکھتے ہیں۔ ''مختصر نظموں میں ''غم فردا'' اور ''مژدۂ نو'' بہت اچھی نظمیں ہیں، مجھے یاد ہے۔ غالباً ۱۹۵۵ء کے بہترین ادب کا انتخاب

کرتے وقت اس نظم یعنی ''غم فردا'' نے مجھے اپنی تازگی اور نکھار کے باعث بہت متاثر کیا تھا اور میں نے اس نظم کو انتخاب میں شامل کر لیا تھا''۔

حمایت صاحب نے ایک اور روایت تازہ کی ہے۔ اردو شاعری میں اب اس شاعری کا رواج نہیں رہا جو غم و خوشی سے متعلق عام انسانی رشتوں کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ سہرے، وداعیاں (رخصتی)، تہنیت نامے اور مبارک بادیاں لکھی جاتی تھیں۔ اردو کے پہلے شاعر حضرت امیر خسرو نے ان موضوعات پر بہت لکھا ہے۔ ان کے گیت اب بھی شادی بیاہ کے موقعوں پر گائے جاتے ہیں۔ کچھ بزرگ شعراء نے بھی ایسی نظمیں لکھی ہیں مگر ہمارے ہم عصر شعری ادب میں ان کی مثالیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ حمایت علی شاعر کے کلام میں کچھ ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں مگر یہ کلام ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ (نہ جانے کیوں؟)

شاید ایسی ہی نظمیں پڑھ کر پروفیسر ممتاز حسین کو حمایت علی شاعر کا کلام ان کی ''آپ بیتی'' نظر آیا اور صہبا لکھنوی نے انھیں منظوم سوانح حیات لکھنے کی دعوت دی اور بقول ڈاکٹر اسلم فرخی ''شاعر نے یہ پہاڑ ہتھیلی پر اٹھا لیا''۔

حمایت صاحب کا ایک شعر جو انھوں نے اپنی بیٹی کی شادی پر لکھا تھا لوگوں کو اتنا پسند آیا کہ اکثر شادی کارڈوں میں استعمال ہونے لگا۔

خدائے برتر ہمارے بچوں کو اپنی رحمت سے شاد رکھنا
یہ گھر جو آباد ہو رہا ہے، سدا اسے بامراد رکھنا

ان کی غزل بھی محبت کے ان جذبات سے آباد ہے۔ محبت کا ہر وہ پہلو جو ان کی نظموں میں نظر آتا ہے، غزلوں میں بھی جھلکتا ہے۔

حمایت صاحب کے یہاں ایسے موضوعات بھی ہمیں ملتے ہیں جو غزل کی روایت سے قدرے مختلف ہیں۔ مثلاً یہ اشعار:

جوڑے میں جو پھول تھا کل اب گود میں ہے
دیکھ کے اس کو بیتے دن یاد آئے ہیں
شاخ سے شاخ لپٹ کر روئے، بین کرے
گل دانوں کی خاطر گلشن اجڑا ہے

سلوٹوں کے سانپ لہراتے رہے پھولوں کے بیچ
رات بھر ڈستا رہا مہکا ہوا بستر مجھے

حمایت صاحب غزل کو محدود کرنے کے قائل نہیں ہیں لیکن اظہار میں غزل کی تہذیب کے طرف دار بھی ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے:

چہرے کی خاموش لکیریں کہتی ہیں
شرط سخن ہے، کہنے کے پیرائے بہت

اسی غزل کے مطلع میں انھوں نے ایک سچی بات یہ بھی کہہ دی ہے:

شاعر جس کو دیکھ کے تم للچائے بہت
اس میں بھی تھی روشنی کم اور سائے بہت

ایک اور بات۔ حمایت صاحب نے اپنے کسی مضمون میں اردو غزل کے اس محبوب کی تکذیب کی تھی جس کا تذکرہ ''صیغۂ تذکیر'' میں کیا جاتا ہے۔ وہ اسے غیر فطری سمجھتے ہیں مجھے یہ بھی یاد ہے کہ اس سلسلے میں انھوں نے ولی دکنی کی غزلوں سے کچھ مثالیں بھی دی تھیں اور خود میں نے اس کی تصدیق کے لیے ولی کا کلیات نکال کر مطالعہ کیا تھا۔

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کو جلاتی جا
نک مہر کے پانی سوں یہ آگ بجھائی جا

☆☆

ہوش کھوتی ہے نازنین کی ادا
سحر ہے سرو گل جبیں کی ادا

یہ اور بات ہے کہ خود حمایت صاحب کی غزلوں میں محبوب کا ذکر کہیں ''صیغۂ تذکیر'' میں بھی آ گیا ہے مثلاً یہ شعر کہ:

وہ جل رہا تھا کڑی دھوپ کی تمازت میں
ملا جو اب تو اوڑھا دوں گا اپنی چھاؤں اسے

شاعر کتنا ہی جدت پسند ہو اگر اس کی تربیت روایت کی آغوش میں ہوئی ہے تو لاشعوری طور پر اس کی تخلیقات میں وہ عنصر بھی در آتا ہے جسے وہ ''بدعت'' سمجھتا رہا۔ حمایت صاحب کے ان اشعار

میں کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ ان کا یہ شعر بھی غور طلب ہے۔

وہ اپنے خواب میں شاید مجھی کو دیکھتا ہو
میں تشنہ لب سہی، سوتے میں کیا جگاؤں اسے

ولی دکنی کے جن اشعار کا میں نے حوالہ دیا ہے ان کی روشنی میں ہندوستان کی دوسری زبانوں کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں روایت قدرے مختلف تھی۔ ان کی شاعری میں تذکیر اور تانیث کے صیغے فطرت کے مطابق ہوتے تھے۔ میرابائی کا ایک دوہا ہے:

لکڑی جل بھئی کوئلہ، کوئلہ جل بھئی آک
میں پاپن ایسی جلی، کوئلہ بھئی نہ راکھ

ہماری شاعری نے مقامی زبانوں کی شاعری سے بالکل فائدہ نہیں اٹھایا۔ دوہا بھی لکھا تو غلط لکھا۔ دوسری اصناف سخن مثلاً ماہیا، ٹپہ، وائی، کافی، سورٹھا اور ہیر (جو ایک خاص بحر میں لکھی جاتی ہے) کبھی لکھنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ گیت بھی باضابطہ نہیں لکھے بلکہ اسے بھی ''نغمہ'' کر دیا۔ نتیجتاً ان کی خوبیوں سے ہم محروم ہی رہے۔ اردو کی پہلی شاعرہ مہ لقا بائی چندا سے لے کر پچھلی نصف صدی تک خواتین نے بھی جو شاعری کی وہ بھی مردانہ لہجے میں کی ہے۔ ایسی فضا میں کہنہ روایت سے نکلنا اکثر مشکل ہوتا ہے۔

حمایت صاحب کی شاعری کا آغاز ویسے بھی نظم سے ہوتا ہے۔ انھوں نے ''مشق سخن'' کے طور پر بھی غزل نہیں کہی۔ اپنے ایک مضمون میں انھوں نے علامہ اقبال کے ایک جملے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غزل کے بارے میں ایک خاص بات کہی تھی۔ علامہ اقبال کا یہ جملہ فقیر وحید الدین نے ''روزگار فقیر'' میں نقل کیا ہے۔ ''قرآن کریم اس اعتبار سے بڑا ہی مظلوم صحیفہ ہے کہ جسے دنیا میں اور کوئی کام نہیں ملتا وہ اس کے ترجمے اور تفسیر میں مصروف ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ یہ نہایت نازک اور محتاط ذمہ داری ہے۔''

حمایت علی شاعر صاحب لکھتے ہیں:

''شاعری میں غزل ایسی ہی مظلوم صنف سخن ہے۔ ہر وہ شخص جو موزوں طبع ہوا اس پر مشق ستم شروع کر دیتا ہے۔ اس کے لیے نہ تعلیم کی ضرورت ہے نہ شعور کی۔''

حمایت صاحب نے غزل پاکستان آ کر کہی تھی غالباً ۱۹۵۳ء میں۔ ان کی غزلیں بھی ایک طرح

سے نظم ہی ہوتی تھیں اور نظموں میں ان کی محبوب جیتی جاگتی عورت ہی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری میں غم دوراں اور غم جاناں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلتے ہیں۔ بیشتر رومانی نظمیں بھی مسائل حیات کی ترجمان ہیں۔ ایسی نظموں میں سب سے اہم نظم جوان کی کامیاب محبت کا ناتمام افسانہ ہے۔ ادی سے پہلے اور شادی کے بعد جو کچھ زندگی میں ناتمام رہ گیا تھا وہ اس نظم کا موضوع ہے۔ اس کے کچھ بند لکھ رہی ہوں:

کیسی کیسی نہ امنگیں تھیں، تمنائیں تھیں
تو دلہن بن کے جب آئی مرے غم خانے میں
کہکشاں وسعت گردوں سے اتر آئی تھیں
میری آنکھوں کے چھلکتے ہوئے پیمانے میں
ایک جنت تھی پشیماں مرے ویرانے میں

☆☆

تیرے ملبوس پہ پیوند ابھی ہیں کہ جو تھے
رنگ کجلائے چلا جاتا ہے چولھے کا دھواں
آنکھ کے گرد سیاہی سی بڑھے جاتی ہے
کھا گیا تیری جوانی کو ترا سوز نہاں
کتنا بے رحم ہے، بے درد نظام دوراں

ایک نظم ''غم حاصل'' بھی قابل مطالعہ ہے۔ اس نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

اُس کو پا کر بھی دل افسردہ رہا کرتا ہے
اُس کو پا کر بھی کسی شئے کی کمی ہے شاید
چشم خنداں کی چمک دیکھ کے آتا ہے خیال
یہ تبسم نہیں، اشکوں کی نمی ہے شاید
جسم اک برق کا پیکر ہے، نظر کو تسلیم
دل کو ہر دم یہ گماں، برف جمی ہے شاید

ایک نظم ملازمت سے ہٹائے جانے پر لکھی تھی۔ اس میں اپنے محبوب (بیگم) سے یوں مخاطب

ہوتے ہیں:

تم خلاؤں میں نظر گاڑ کے کیا دیکھتی ہو
ان خلاؤں میں بجز حسنِ نظر کچھ بھی نہیں
اپنی دنیا کا خداوند تو ہے سکۂ زر
اپنی دنیا میں بجز سکۂ زر کچھ بھی نہیں
یہ جہاں ایک دکاں ہے کہ جہاں صبح و مسا
آدمی بکتے ہیں نیلام کی چیزوں کی طرح
شب کی تاریکی ہو یا دن کا اجالا ہر وقت
راحتیں بٹتی ہیں، محلوں میں کنیزوں کی طرح

ایک نظم ''وحشت بام و در'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے کچھ شعر ملاحظہ کیجیے:

جب بھی گھر کا خیال آتا ہے
قبرستان کی ویرانی سی
قلب و نظر پہ چھا جاتی ہے
گرد و پیش کے ہنگاموں کو
روح کی وحشت کھا جاتی ہے

ایک نظم ''چل خسرو گھر اپنے'' کے عنوان سے بھی ہے ایک بند اس کے بھی دیکھیے:

تھک چکے پاؤں، بس اب اے دل ناداں چل بھی
چاند پہرے کے سپاہی کی طرح استادہ
سوچ میں ہے کہ جو تو جائے تو وہ بھی چل دے
رہ گزر ایک طوائف کی طرح، واماندہ
ایسے لیٹی ہے کہ کون آئے گا اب رات گئے

حمایت علی شاعر صاحب کی رومانی شاعری ایسی ہے جیسے پھولوں کے ساغر میں کوئی زہر بھر دے اور پینے والا پیتا جائے اور اپنی تشنگی بجھاتا جائے۔ اس میں ''لذت کام و دہن'' ہی کچھ ایسی ہے۔ غالب نے کہا تھا:

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے

حمایت صاحب کی محبت اس مصرعے کے مطابق ''ایمان'' کی حد تک استوار نظر آتی ہے۔ ''آگ میں پھول'' کا پہلا شعر اپنے ذہن میں پھر تازہ کر لیں۔

فکرِ معاش کھا گئی دل کی ہر اک امنگ کو
جائیں تو لے کے جائیں کیا حسن کی بارگاہ میں

حمایت صاحب نے حسن کی بارگاہ میں محبت کی سوغات پیش کی۔ محترمہ معراج نسیم نے انھیں رفاقت کا اعزاز دیا اور اس رفاقت نے دونوں کی زندگی کو سنوار دیا۔ ۱۴ر فروری (ویلنٹائن ڈے) ۱۹۴۹ء کو جو سفر بلکہ ''محبت کا سفر'' ہاتھ میں ہاتھ ڈالے شروع ہوا تھا۔ نصف صدی گزرنے کے بعد ۲۱ر نومبر ۲۰۰۲ء کو کینیڈا جا کر ختم ہو گیا۔

یہ نظمیں حمایت علی شاعر کی رومانی شاعری کا حرفِ آخر ہیں۔ تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ حمایت علی شاعر ایک ایسی کتاب بھی مرتب کر رہے ہیں جس میں وہ تمام نظمیں اور غزلیں ہوں گی جو انھوں نے اپنی محبوب، اپنی بیگم کے بارے میں لکھی ہیں اور اس کتاب کا نام رکھا ہے ''کہی اَن کہی''۔

اس کتاب کے آخری حصے میں وہ تمام نظمیں ہوں گی جو معراج بھابی کے انتقال کے بعد حمایت صاحب نے مسلسل کہیں... ''غمِ معراج۔ معراجِ غم'' شاید ہی کسی شاعر نے اپنی رفیقۂ حیات کے غم میں اتنے آنسو بہائے ہوں اُسے اتنا یاد کیا ہو کہ وہ ''زندۂ جاوید'' ہو جائے۔

حمایت صاحب کا گھر... بالخصوص اُن کا کمرہ، معراج بھابی کی مختلف تصاویر سے آباد ہے۔ رفاقت کی نصف صدی کو انھوں نے اس طرح محفوظ کر رکھا ہے کہ سارا ماضی آنکھوں میں روشن ہو جاتا ہے۔ خدا کرے ایسی محبت ہر ''اہلِ دل'' کو نصیب ہو۔

مسائلی شاعری

مسائل کس کے ساتھ نہیں، فرد ہو کہ قوم، ملک ہو کہ دنیا۔ ہزار مسائل سبھی کے اطراف ہیں اور ادب میں ان کا اظہار بھی ہوتا رہا ہے۔ کبھی شعوری طور پر اور کبھی لاشعوری انداز میں۔ آدمی کتنا ہی حقیقت سے دور بھاگے، شعر و ادب اور فن کے مختلف گوشوں میں پناہ ڈھونڈے اور آرٹ کو سنگین

حقائق سے دور رکھنے کی کوشش کرے زندگی اپنے لوازمات کے ساتھ در آتی ہے۔ حقیقتیں فنونِ لطیفہ کے رنگین آئینوں سے بھی جھلک ہی جاتی ہیں۔

اردو شاعری میں غزل ایسی صنف ہے، جو عرصہ دراز تک عورت سے گفتگو تک محدود رہی ہے، جو صرف حسن و عشق کے معاملات کی ترجمان رہی ہے اور ہجر و وصال کے کرب اور انبساط کو موضوعِ سخن بنائے رہی۔ آخر وہ بھی مسائلِ حیات میں ملوث ہو گئی۔ پہلے کم کم، پھر مسلسل آخر ولی دکنی کے الفاظ میں کہنا پڑا:

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

اور میر صاحب تو یہاں تک کہہ گئے:

نہ مل میر اب ان امیروں سے تو
ہوئے ہیں غریب ان کی دولت سے ہم

غالب تک آتے آتے بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے:

کوہ کن گر سنہ مزدور طرب گاہ رقیب
بے ستوں آئینہ خواب گران شیریں

ترقی پسند تحریک تو بہت بعد میں وجود میں آئی۔ ۱۹۳۶ء سے بہت پہلے علامہ اقبال بہت کچھ کہہ چکے تھے۔ داغ کے لہجے میں تربیت پائی ہوئی ان کی غزل جب خود اپنے تخلیق کار کی فکر سے آشنا ہوئی تو ''نظم'' کے لباس میں نظر آنے لگی۔ ''بانگ درا'' اور ''بالِ جبریل'' کی غزلوں کا فرق اس تغیر کی وضاحت کر دیتا ہے:

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

کہنے والا شاعر ''بالِ جبریل'' میں یہ لہجہ اختیار کر لیتا ہے:

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

اردو غزل کا لہجہ، غالب سے ہی بدلنے لگا تھا اور اقبال تک آتے آتے ساری حدود توڑ گیا۔ فیض

میں بھی وہی آنچ سلگ رہی تھی۔ یہ اور بات کہ ان کے مزاج کی نرمی نے غزل کو نرم گفتار بنا دیا۔ اگر وہ یگانہ کی روش پر چل پڑتی تو اقبال سے زیادہ سخت کلام ہو جاتی۔ اردو شاعری جن جن ادوار سے گزری ہے اس میں غزل کے ساتھ دوسری اصناف بھی اپنا رنگ اور موضوع بدلتی رہی ہیں۔ مسائل نے بہت سر اٹھایا تو ''شہر آشوب'' لکھے گئے۔

مرثیوں میں، ظالم اور مظلوم کے مذہبی اور تاریخی پس منظر میں شعرا نے اپنے عہد کا بھی آئینہ دکھایا اور یوں تسکین قلب حاصل کر لی۔ نظیر اکبر آبادی کی حقیقت نگاری نے جوش جیسے شاعر کو جنم دیا جس نے انیس سے روشنی لے کر اپنے عہد کی منفی قوتوں پر ضرب لگائی۔ غالب کی شاعری میں روایتی عقائد کے خلاف جو غصہ اور جھنجھلاہٹ تھی وہ اقبال کی فکر میں ڈھل کر ایک انقلابی نظریہ بن گئی۔ ''اقبال کو اپنے جدِ اعلیٰ'' سے جو قوتِ انکار ملی تھی (ان کے جد اعلیٰ کشمیری برہمن تھے اور مسلمان ہو گئے تھے) اس نے ابلیس کے انکار میں ''عشق الٰہی'' کا اقرار کارفرما دیکھا۔ اور اسے ''سید العاشقین'' کہہ دیا، اور اس کے عشق کو جبرئیل سے آگے بڑھا دیا۔

آہ اے جبرئیل تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو

وہ کتنے فخر سے اپنے بارے میں کہتے ہیں:

مرا بینی کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ راز آشنائے رومؔ و تبریزؔ است

پرانی قدریں بدل رہی تھیں اور روایتوں کے مثبت پہلوؤں سے توانا جدتیں وجود میں آ رہی تھیں۔ ترقی پسند ادبی تحریک دراصل علامہ اقبال کی فکر سے جنم لیتی ہے اور فیض، مخدوم، علی سردار جعفری اور احمد ندیم قاسمی سے حمایت علی شاعر کے ہم عصر اہل قلم تک اس تحریک سے فیض یاب ہو جاتے ہیں۔ ''آگ میں پھول'' حمایت صاحب کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ جو اپنے نام ہی سے ایک خاص طرز فکر کی نمایندگی کرتا ہے۔ فیض کے الفاظ میں:

یوں ہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

حضرت ابراہیم سے لے کر آج تک یہ استعارہ اپنی معنوی وسعتوں میں ہمیں انسان کے کردار کا

آئینہ دکھا تا رہا ہے۔ حمایت صاحب نے اپنی کتاب کا یہ نام رکھ کر اپنے ''ترقی پسند شعور'' کا آئینہ دکھایا ہے۔ اس میں ہمیں ورق ورق وہ شاعری ملتی ہے جو اپنے عہد کے زندہ حقائق کی ترجمان ہے۔ حمایت صاحب صدقِ دل سے انھیں اپناتے نظر آتے ہیں۔ پہلا قطعہ ملاحظہ فرمایئے:

حقیقتیں تو ہزاروں ہیں تشنۂ اظہار
مگر وہ ایک حقیقت جو میرے لب پر ہے
جو اشک اشک کہیں ہے تو زخم زخم کہیں
وطن کے قرض کی صورت مرے ادب پر ہے

اس کتاب میں ان کی ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۵ء تک کی شاعری کا انتخاب ہے۔ رومانی شاعری کا تجزیہ میں کر چکی ہوں۔ زندگی کے مسائل ان میں بھی اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ لیکن وہ نظمیں جو ملک کی تقسیم کے مسائل سے وجود میں آئی تھیں، جو پوری ایک نسل کا آئینہ دکھاتی ہیں اور ایک عہد کی تاریخ بن جاتی ہیں، اس کتاب میں بڑی تعداد میں ہیں اور ساتھ ساتھ ایسی نظمیں، غزلیں اور رباعیات بھی ہیں جو شاعر کے فکری پس منظر پر روشنی ڈالتی ہیں۔

حمایت صاحب کا فکری پس منظر ایک الگ باب کا متقاضی ہے۔ لیکن اس کی پرچھائیاں جوان کی مختلف نظموں میں جھلکتی ہیں فی الحال میں ان کا مطالعہ کروں گی۔

تقسیم ہند سے پہلے جو مذہبی نفرتیں پورے ملک میں بیدار تھیں یا جنھیں برطانوی سامراج نے گزشتہ دو سو سال میں بیدار کر دیا تھا۔ بالآخر ایسے نتائج سامنے لے آئیں کہ صدیوں کی اکائی پارہ پارہ ہو گئی۔ ''ایشور اللہ تیرو نام'' کہنے والا معاشرہ۔ ''دیر و حرم'' میں بٹ گیا۔ کفر و اسلام کی تفریق نے دنیا ہی میں دوزخ اور جنت کی تخصیص کر دی اور جن ''بتوں کو کعبے کی پاسبانی'' پر ناز تھا وہ سیاہ و سفید کی طرح ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ اہلِ طریقت اور بھگتی تحریک کی صدیوں کی تگ و تاز، برسوں کی تعلیم اور قرآن کریم کی سورۃ الکافرون کی روشنی جو دل و دماغ میں وسعتوں کی ضامن تھی، دیکھتے دیکھتے تنگ نظری میں بدل گئی۔ صوفیائے کرام کے مقبرے مٹی کا ڈھیر ہو گئے اور تمام عقیدت و احترام کے باوجود ان کی کتابیں طاقوں پر رکھ دی گئیں۔ ''فصوص الحکم'' (محی الدین ابن العربی) سے لے کر ''کشف المحجوب'' (داتا گنج بخش) تک سب کتابیں اپنے معانی سے محروم ہو گئیں۔ تاریخ کا تسلسل ٹوٹ گیا اور کچھ نئی بنیادیں ڈال دی گئیں۔

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے کے گہر ہونے تک

حمایت صاحب نے جو ہندوستان میں دیکھا تھا وہی نقشہ پاکستان میں نظر آنے لگا صرف عنوانات بدل گئے تھے۔ اپنے آبائی شہر اورنگ آباد پر انھوں نے ایک نظم ۱۹۵۰ء میں لکھی تھی۔ تخاطب ان لوگوں سے تھا جو 'اجنتا اور ایلورہ' پر ایک فلم بنانا چاہتے تھے۔ حمایت صاحب کہتے ہیں:

اجنتا کا نظارہ کرنے والو — ادھر بھی اک نگاہ طائرانہ
صنم خانے یہاں بھی کچھ ملیں گے — ذرا ذوق تجسس آزمانا

اور پھر وہ اپنے شہر کا تعارف کراتے ہیں:

یہ شاہوں اور راجاؤں کی بستی — گناہوں کی کمیں گاہ مقدّس
محل زادوں کے حق میں خلد ساماں — رعایا کے لیے تاریک محبس

یہ نظم کافی طویل ہے اور اس بند پر اس کا اختتام ہوتا ہے:

اجنتا کا نظارہ کرنے والو — اجنتا کے بتوں میں کیا رکھا ہے
اجنتا پتھروں کی زندگانی — یہ بستی زندگی کا بت کدہ ہے

یہ نظم 'ادب لطیف' لاہور میں اکتوبر ۵۱ء میں شائع ہوئی تھی اور پھر مرزا ادیب نے ۵۱ء میں 'بہترین ادب' میں بھی اسے شامل کیا۔ (فرقہ وارانہ) 'فسادات کی ایک رات' کا نقشہ بھی شاعر نے بہت المناک انداز میں کھینچا ہے۔

یہ بھیانک تیرگی پر ہول رات — سہمی سہمی سی ستاروں کی بارات
دم بخود، خاموش ساری کائنات
راستے ملبوں سے پر، سنسان چپ — شہر جیسے کوئی قبرستان چپ
تک رہا ہے آسماں حیران چپ

اسی طرح سے نظم آگے بڑھتی جاتی ہے اور انسانیت پر آنسو بہاتی ہوئی اس بند پر ختم ہوتی ہے:

تم کو ہے جس 'خواب فردا' کی تلاش — ایسا ہر اک خواب ہے اب پاش پاش
وہ پڑی ہے اس کی جھلسی جھلسی لاش

رفتہ رفتہ ان کے لہجے میں تلخی آتی جاتی ہے ان کی ہر نظم سے اک دردانگیز طنز ابھرنے لگتا ہے، وہ آزادی کا جشن بھی مناتے ہیں تو اس طرح:

ناچو گاؤ دھوم مچاؤ — آزادی کا جشن مناؤ
ہم اُس قوم کے لختِ جگر ہیں — جس کا ہم سر کوئی نہیں ہے
ساری دنیا جس کا وطن ہے — جس کا گھر در کوئی نہیں ہے
دنیا مانے یا نا مانے — اپنی عظمت کے گن گاؤ
یہ دنیا دو روز کی دنیا — اس میں الجھ کر کیا کر لو گے
راز کے اندر راز نہاں ہے — سوچ سمجھ کر کیا کر لو گے
اصلی دنیا اور کہیں ہے — اس دنیا کی دھن اپناؤ
بھوک لگے تو روٹی کھا لو — پیاس لگے تو پانی پی لو
اور اگر یہ بھی نہ ملے تو — رب سے دھیان لگا کر جی لو
خلد بریں کے خواب سجا کر — اپنی قبروں میں سو جاؤ
ناچو، گاؤ، دھوم مچاؤ

اس اقتباس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ان کے دل میں کتنا زہر بھر چکا تھا۔ حمایت صاحب جب تک ہندوستان میں رہے، ان کا انداز شعر گوئی یہی رہا۔ یوم آزادی پر ایک نظم 'پھر یوم بہار آیا' کے عنوان سے انھوں نے لکھی تھی جس میں ایک تلخ طنز مسکرا رہا ہے۔ پوری نظم ایک 'خندۂ استہزا' ہے۔ دیکھیے یہ اس دن کا کس طرح استقبال کر رہے ہیں:

تم تو ہر سال ہی آجاتے ہو
آؤ اک اور عنایت کر جاؤ
کچھ نمک اور چھڑک دو ان پر
بھر نہ جائیں مرے رستے ہوئے گھاؤ
ضرب اک اور لگاتے جاؤ

حمایت صاحب نے یہ لہجہ کیوں اختیار کیا اس کا جواز بھی ملاحظہ فرمائیے:

کتنی دل کش ہے یہ تصویر بہار
ایک اک نقش ہے ایک اک شہکار
یہ ہر اک گام پہ تاحدِ نظر

میرے خس پوش محلوں کی قطار
سانس لیتی ہوئی لاشوں کے مزار

''آگ میں پھول'' کے دوسرے ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۸۱ء) میں حمایت صاحب نے ''مادر ہند'' کو ''مادر پاک'' سے بدل دیا تھا۔ یہ نظم پہلے ''ادب لطیف'' (لاہور) میں فروری ۵۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ پھر ۱۴/اگست کو روزنامہ ''کلیم'' (سکھر) میں چھپی اور دونوں ملکوں کی ترجمان بن گئی۔

۱۹۵۱ء میں جب حمایت صاحب پاکستان آئے تو انھیں دونوں ملکوں میں کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ صرف ایک بات مختلف محسوس ہوئی وہ یہ کہ آزاد ہندوستان کا دستور ۵۲ء میں بن گیا تھا اور پاکستان میں ۱۹۳۵ء کا انڈیا ایکٹ ابھی تک جاری تھا۔ ۵۶ء میں ایک خاص ضرورت کے تحت دستور بنا بھی تو ۵۸ء میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے مارشل لا نے اسے توڑ دیا۔ ۱۴/اگست ۴۷ء سے ۵۸ء میں پہلا مارشل لاء لگنے تک (نام نہاد جمہوری حکومتیں ہونے کے باوجود) لکھنے اور بولنے کی ویسی آزادی نہیں تھی جو ہندوستان میں تھی۔ وہاں کا شاعر سرِ عام ایسے مصرعے کہہ دیتا تھا۔

دیکھو وہ دم توڑ رہی ہے نہرو کی سرکار

حمایت صاحب کے بقول یہ مصرعہ کیفی اعظمی یا نیاز حیدر نے کہا تھا۔ یہاں ۵۲ء میں ہی ترقی پسند مصنفین کی انجمن کو سیاسی انجمن قرار دے دیا گیا۔ ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کے لیے سرکاری ملازمت کے دروازے بند تھے۔ آئے دن ادیب، شاعر اور صحافی جیلوں میں بند کر دیے جاتے تھے۔ ہر شخص خوف زدہ رہتا تھا۔ ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجرین روزگار کے مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ ملک میں وڈیروں، زمین داروں اور سرمایہ داروں کا راج تھا۔ فیض صاحب، سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں کو راولپنڈی سازش کیس کے سلسلے میں ۱۹۵۱ء ہی میں چار سال کی سزا ہو چکی تھی۔ بات بات پر اخبارات اور رسالے بند کر دیے جاتے تھے۔ اس عالم میں حمایت صاحب کیا لکھتے۔ یہ ان کی نوجوانی کا دور تھا۔ جو آگ ان کے دل میں ہندوستان ہی میں بھڑک چکی تھی، وہ یکا یک کیسے بجھ جاتی۔ یوں بھی جوانی تو بے پروا ہوتی ہے۔ جب تک ان کی بیگم پاکستان نہ آئیں وہ یوں ہی بے باکانہ لکھتے گئے اور ریڈیو سے نکالے جاتے رہے۔ اس دوران انھوں نے ایک قلمی نام یہاں بھی اختیار کر لیا تھا۔ احتیاطاً وہ اپنے اس قلمی نام ''ابن مریم'' سے

''افکار'' کراچی اور ''لیل ونہار'' (لاہور) میں لکھتے رہے اور بڑی مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

نواب زادہ لیاقت علی خاں کے زمانے میں پاکستان کے امریکہ سے تعلقات استوار ہو چکے تھے۔ پاکستان اپنے بے شمار اندرونی مسائل میں بھی الجھا ہوا تھا۔ اسمبلی کی سازشوں سے حکومتیں بدل جایا کرتی تھیں۔ ''مشرقی بنگال'' ابھی مشرقی پاکستان نہیں بنا تھا لیکن لسانی مسائل چھڑ چکے تھے۔ کرنا فلی پیپر ملز کے فسادات اس کے گواہ ہیں۔

حمایت صاحب نے اس دور میں جو نظمیں لکھیں وہ بھی قابل مطالعہ ہیں۔ ایک نظم کا عنوان تھا۔ ''مزار قائد پر'' یہ نظم ۱۹۵۲ء میں لکھی گئی تھی۔ (اس وقت تک ''مقبرہ'' نہیں بنا تھا)۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

ترے دیار کو ہم ظلمتوں کے ماروں نے — بڑے ہی پیار سے ارمان سے سنوارا تھا
قدم قدم پہ چھڑک کر جوانیوں کا لہو — ترے افق کو بڑے چاؤ سے نکھارا تھا
بچھا کے راہ میں کتنے ہی چاند تاروں کو — نئی سحر کے لیے راستہ ابھارا تھا

یہ نظم بھی خاصی طویل ہے، میں چیدہ چیدہ اشعار لکھتی ہوں۔ اس وقت مزار کے اطراف حد نظر تک جھونپڑیاں ہی جھونپڑیاں تھیں۔ قائد آباد، اسلام آباد (کشمیر روڈ کا پہلا نام) اور حیدر آباد کالونی کے بیشتر حصوں سے ہوتی ہوئی ان جھونپڑیوں کا سلسلہ سینٹرل جیل تک چلا گیا تھا۔ چناں چہ آپ کو اس نظم میں ایسے اشعار بھی ملیں گے۔

ذرا نگاہ اٹھا کر یہ زندگی تو دیکھ
ترا مزار، مزاروں کے بیچ ہے کہ نہیں

یہ بند بھی دعوت فکر دیتا ہے۔

ابھر کے شرق سے مغرب کی سمت جو ہے رواں
اس آفتاب کا انجام سوچتا ہوں میں
ترا خلوص، ترا پیار، معتبر ہی سہی
ترا مآل ..... بہ ہر گام سوچتا ہوں

میرے بزرگ یہ بھی بتاتے ہیں کہ ۵۳ء میں حمایت صاحب کا یہ شعر بہت ہی مشہور ہوا تھا:

راہ زن کے بارے میں اور کیا کہوں کھل کر
میرِ کارواں یارو، میرِ کارواں یارو

میں کچھ اور اشعار بھی پیش کرتی ہوں جو حمایت صاحب کی اُس وقت کی سوچ اور ان کے انداز فکر کو ظاہر کرتے ہیں:

اہل دل، اہل خرد، اہل نظر سب سو گئے
سب کو بیداری کا دعویٰ تھا مگر سب سو گئے

☆☆

نعرہ نہ سہی، چیخ سہی، کچھ تو ہو یارو
بیٹھے ہیں بڑی دیر سے اربابِ وطن چپ

☆☆

بجا کہ اپنی دسترس میں لوح بھی قلم بھی ہے
مگر جو کھل کے دل کی بات کہہ سکے، وہ دم بھی ہے؟

۱۹۵۳ء میں طلبا پر فائرنگ کی گئی۔ کراچی میں کئی طلبا شہید ہو گئے۔ حمایت صاحب نے اس المیے پر دو نظمیں لکھیں۔ ''۸ر جنوری'' اور ''دیوانی''۔ اپنی سوانح حیات میں وہ اس حوالے سے لکھتے ہیں

یہ سانحہ جسے اک جرمِ شرمناک کہیں
کہ اوّلین، گناہِ دیارِ پاک کہیں
مری نگاہ میں اب بھی ہے فلم کی صورت
یہیں سے بگڑی ہے مکتب کی علم کی صورت
میں ان دنوں بڑے بے باک شعر کہتا تھا
مری رگوں میں لہو، آگ بن کے بہتا تھا

اور نظم ''دیوانی'' کی محرک دراصل اخبار ''جنگ'' کی یہ خبر تھی۔

''کراچی۔ ۸ر جنوری۔ طلباء پر فائرنگ کے دوران ایک بوڑھی عورت لاشوں کے درمیان سڑکوں پر دیوانہ قہقہے لگاتی ہوئی ''پاکستان زندہ باد'' کے نعرے لگا رہی تھی۔

ان کی نظم ''۸ر جنوری'' کا یہ بند بھی دعوتِ فکر دیتا ہے:

تیرا چٹان سا بیٹا، زمیں میں گڑ تو گیا
ہوئی ہیں کتنوں کی عمریں دراز یہ بھی تو دیکھ
ہر ایک قلب میں ہے سرنگوں ''بت محمود''
کہاں پہنچ گیا ''دستِ ایاز'' یہ بھی تو دیکھ

حمایت صاحب نے پاکستان کے ہر مسئلہ پر خلوص دل سے سوچا اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ۱۹۵۳ء میں امریکہ کے وزیر خارجہ فوسٹر ڈلس پاکستان آئے تو انھوں نے اس ''اجنبی مہمان'' کا جس انداز میں استقبال کیا۔ ملاحظہ کیجیے:

اک نئے دوست آئے ہیں گھر میں — دوستو کوئی اہتمام کرو
نفرتوں کے جلال کے باوصف — اپنے مہماں کا احترام کرو
بھیگی آنکھوں میں، خشک ہونٹوں پر — مسکراہٹ کا انتظام کرو
اپنی آزادیوں پہ ناز کرو — اپنی قبروں میں جشنِ عام کرو
کھل کے نعرے لگاؤ گام بہ گام — اور اونچا وطن کا نام کرو

نظم طویل ہے، لیکن اس دور میں ہر مشاعرے میں حمایت صاحب سے یہ نظم بہ اصرار سنی جاتی تھی۔

''مہاجرین'' کی بڑی تعداد کراچی میں جس طرح آباد ہوئی تھی اس کا ذکر مزار قائد کے حوالے سے میں کر چکی ہوں۔ حمایت صاحب نے ان پر بھی ایک نظم ''مہاجر بستیاں'' کے عنوان سے لکھی تھی۔ جو ''آگ میں پھول'' میں شامل ہے۔ مگر جب اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اس نظم کا عنوان بدل کر ''غریب بستیاں'' رکھ دیا گیا، اس عرصے میں حمایت صاحب مقامی لوگوں کی زندگی بھی دیکھ چکے تھے۔ عوام کوئی ہوں سب کی حالت ایک سی ہوتی ہے۔ مہاجرین تو ترکِ وطن کے سبب مصائب اٹھا رہے تھے۔ مقامی لوگ اپنے وڈیروں اور زمین داروں کے ظلم کا شکار تھے خصوصاً سندھ میں ہاریوں کی حالت بہت خراب تھی۔ اس نظم کا ہر شعر ملک کے سارے غریبوں کا ترجمان ہے:

صبح ہوتے ہی چیخ پڑتے ہیں قبروں کے دہن
اپنے مسکن سے نکل آتا ہے لاشوں کا ہجوم
مادرِ پاک کے خوابوں سے تراشے ہوئے جسم

عقل مجہول، نگہہ کور، زباں بے مفہوم
اپنے امروز کا کچھ علم نہ فردا کی خبر
اپنی ہستی کی حقیقت ہی نہیں ہے معلوم
کچھ نہیں فکر، بجز نانِ جویں، نانِ جویں
اور ہوگی بھی تو کیا حاجت قلبِ مرحوم

نظم اسی طرح پاکستانی عوام کی تصویر کھینچتی ہوئی، اس شعر پر ختم ہوتی ہے:

اپنے سینے سے لگائے ہوئے ایمان کی لاش
زندگی موت کی گودی میں سمٹ جاتی ہے

میں نے جب یہ نظم پڑھی تو حمایت صاحب سے ایک روز دورانِ گفتگو میں نے کہا کہ مجھے آخری شعر سے اختلاف ہے، ہمارے عوام کے پاس ایک ''ایمان'' ہی تو رہ گیا ہے جس کے سہارے وہ جی رہے ہیں۔ میرا خیال ہے اس مصرعے کو یوں ہونا چاہیے:

اپنے سینے سے لگائے ہوئے ''اک خواب'' کی لاش

وہ اس لفظ پر چونک پڑے اور مجھ سے کہا:

''ہاں، علامہ اقبال کا خواب''

''آپ نے تو اپنی سوانح حیات کا اختتام بھی اس پر کیا ہے''۔ میں نے جلدی جلدی ''آئینہ در آئینہ'' کے صفحات الٹے اور صفحہ (۳۳۶) پر جو اشعار تھے انھیں سنائے:

جب ایک قوم کا ماضی و حال ایسا ہو
عروج بھی ہو کبھی تو زوال جیسا ہو
تو ایسی قوم میں اک انقلاب لازم ہے
کسی عظیم تغیر کا باب لازم ہے
وہ انقلاب جو اقبال کی نگاہ میں تھا
جو ایک ''خواب'' کی صورت وطن کی چاہ میں تھا

''ہاں۔ وہ خواب ابھی تک ادھورا ہے۔ نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا۔'' میں حمایت صاحب سے اکثر ایسی گفتگو کر جاتی ہوں۔ میں نہیں جانتی کہ اس کتاب کا جب نیا ایڈیشن شائع ہوگا

تو وہ اس نظم میں کوئی تبدیلی کریں گے یا نہیں۔ لیکن فیض صاحب کا یہ مصرعہ اکثر ان کی وردِ زبان رہتا ہے:

''جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں''

حمایت صاحب واقعی ''کشادہ دل'' انسان ہیں۔ چند حضرات نے انھیں روحانی تکلیف پہنچائی (کچھ غلط فہمیوں کی بناء پر) ان کے دیرینہ دوست قمر جمیل بھی ان کے دشمنوں کے ہم نوا ہو گئے۔ بات ادب کے دائرے سے نکل کر ذاتیات تک پہنچ گئی تو حمایت صاحب کے بعض ہم خیال ساتھی مثلاً حسن حمیدی اور شیخ ایاز جو ایڈووکیٹ تھے، انھوں نے قانونی کارروائی شروع کر دی۔ قمر جمیل کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا انھوں نے اخبارات میں حمایت صاحب سے معافی مانگ لی، حمایت صاحب نے اپنے دوست کو پھر گلے سے لگا لیا۔ پھر سلیم احمد نے شمیم احمد کی سفارش کی اور اپنی دوستی کا واسطہ دیا تو حمایت صاحب نے انھیں بھی معاف کر دیا۔ لو دوستی نباہنے میں بھی حمایت صاحب کا جواب نہیں۔ ریڈیو پاکستان کی سروس کے زمانے میں انھوں نے اپنے ایک ناراض دوست کو کس محبت سے منایا ہے۔ پڑھیے:

کیوں مجھ سے بدگماں ہو اے میرے یار ''صوفی''
رہتے ہو اس طرح کیوں بے گانہ وار ''صوفی''

ایک دوست کے نام کا قافیہ ذہن میں رکھ کر اسے ''صوفی'' لکھ دیا جو اس نظم میں بہت بامعنی ہو گیا ہے۔ ان دنوں وہ ریڈیو پر اسٹاف آرٹسٹ تھے اور صدا کاری کے ساتھ مسودہ نگاری بھی کرتے تھے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس طرح کی بالکل ذاتی نظمیں بہت کم شعرا کے پاس مل سکیں گی۔ بظاہر یہ معمولی موضوعات ہیں مگر دل کی دنیا میں ان کی بڑی اہمیت ہے۔ اسی سے انسان کی اور اس کے کردار کی شناخت ہوتی ہے۔ حمایت صاحب نے انسانی رشتوں کا ہمیشہ احترام کیا ہے وہ دوسروں کے غموں میں بھی شریک رہے ہیں (چند مثالیں تو میں پیش کر ہی چکی ہوں) ان نظموں کو آپ (شاعری کی دنیا میں) کوئی مقام دیں یا نہ دیں لیکن بقول ڈاکٹر وزیر آغا انھیں ''دل گدازی'' کی سند تو عطا کر ہی دیں گے۔ شاعر جب تک دل گداز نہ ہو ''بڑا شعر'' نہیں کہہ سکتا۔ اب یہ فیصلہ وقت کرے گا کہ حمایت علی شاعر ''شعر و ادب'' کی دنیا میں کیا مقام رکھتے ہیں۔ غم جاناں تو ہر دل میں ہوتا ہے لیکن غم دوراں اپنانے کے

لیے اپنے دل میں اپنی خود پسندی کو کم کرنا پڑتا ہے اور اس کی جگہ دوسروں کو دینی پڑتی ہے۔ مزید برآں شاعر جتنا باشعور ہوگا وہ اتنا ہی دوسروں کے غم کو سمجھے گا۔ بڑے شاعروں کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں:

جو اس طرح اے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

نظیر اکبر آبادی ہوں یا انیس و دبیر سب نے انسانی مسائل کی شاعری کی ہے۔ غالب کہتے ہیں:

عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

اور علامہ اقبال تو ان مسائل سے نمٹنے کے لیے انقلاب پر اکساد یتے ہیں:

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

چناں چہ وہ کارل مارکس سے لے کر لینن تک سبھی کے ہم نوا ہیں:

آں کلیم بے تجلی، آں مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

(کارل مارکس)

حمایت صاحب ان سوڈو انٹلکچولز، پر بھی طنز کرتے ہیں جو کافی ہاؤس میں تو بہت بولتے ہیں لیکن جہاں بولنا ہوتا ہے وہاں خاموش رہتے ہیں۔ ان کی نظمیں ''کافی ہاؤس'' اور ''لاشوں کی بستی'' انھی حقیقتوں کی آئینہ دار ہیں:

یہ وہ مقام ہے جس جا عوام کے فن کار — غمِ عوام میں دن رات ایک کرتے ہیں
جو ایک گھونٹ اترتا ہے حلق سے نیچے — تو ذہن عرش کے اسرار فاش کرتے ہیں
اس فضا میں کوئی کیا نغمے بکھیرے خوں جلائے — جس فضا میں ''حرف غم'' کا کوئی بھی محرم نہیں

حمایت صاحب کا دوسرا شعری مجموعہ ''مٹی کا قرض'' ہے۔ اس کتاب میں ان کی شاعری اس جذباتیت سے نکل گئی ہے جو ''آگ میں پھول'' میں نظر آتی ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اس دوران میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دو ہولناک جنگیں ہو چکی تھیں۔ ایک ۱۹۶۵ء میں اور دوسری ۱۹۷۱ء میں۔ پہلی جنگ کے دوران فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں ملک کے سربراہ تھے۔ ابتدا میں کشمیری علاقوں ''چھمب اور جوڑیاں'' میں باہم کچھ جھڑپیں ہوئیں پھر

یکا یک سیالکوٹ اور لاہور کی سرحد پر انڈیا نے باضابطہ حملہ کر دیا۔ اس جنگ کے سیاسی محرکات میں کشمیر کا مسئلہ ہی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ ہماری فوج نے بھی جم کر مقابلہ کیا۔ لیکن اصل لڑائی وہ تھی جو ''ادب'' میں لڑی گئی۔ ملک کے تقریباً سارے ادیب و شاعر تحریری طور پر اس میں شریک نظر آتے ہیں۔ جن شعرا کی نظمیں اور نغمے بہت مقبول ہوئے ان میں حمایت صاحب کا نام بھی شامل ہے۔ ان کے بعض جنگی ترانے جو فلموں کے لیے لکھے گئے تھے، خاص طور سے فلم ''مجاہد'' اور ''جہاد'' کے نغمے۔ حالاں کہ ان فلموں کا کشمیر کے مسائل سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ دونوں فلمیں مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کے تاریخی پس منظر میں بنائی گئی تھیں۔ ان میں ''مجاہد'' تو ریلیز ہو گئی مگر ''جہاد'' ادھوری ہی رہ گئی۔ ''مجاہد'' کا ایک ترانہ تھا:

جاگ اٹھا ہے سارا وطن.....ساتھیو.....مجاہدو.....

(گلوکار: مسعود رانا اور ساتھی)

یہ ترانہ ایک طرح سے ہمارا قومی ترانہ بن گیا تھا۔ دن میں کئی کئی بار مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہوتا۔ اسی طرح سے ''جہاد'' کے دو نغمے بھی خاصے مشہور ہوئے تھے:

مرے بہادر بھیا.....تجھ پر ناز کرے تری بہنا
سینہ سپر رہنا

(گلوکار، مالا)

اور دوسرا ترانہ

اے دشمن دیں تو نے کس قوم کو للکارا
لے ہم بھی ہیں صف آرا

(گلوکار: شوکت علی)

جنگ کے دوران حمایت صاحب نے ایک نظم ''لہو'' کے عنوان سے بھی لکھی تھی۔ یہ نظم ان سے ہر مشاعرے میں سنی جاتی اور وہ خوب داد پاتے تھے۔

لہو جو سرحد پہ بہہ رہا ہے — لہو جو سرحد پہ بہہ چکا ہے
ہم اس لہو کا خراج لیں گے

اس دور کے دیگر شعرا میں رئیس امروہوی، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، صفدر میر، احمد فراز، جمیل

الدین عالی، صہبا اختر مسرور انور اور نفیس فریدی کی نظمیں، گیت اور ترانے بھی بہت مقبول ہوئے۔ مثلاً:

۱۔	۶ ستمبر	(احمد ندیم قاسمی)
۲۔	میں کیوں اداس نہیں	(احمد فراز)
۳۔	سیالکوٹ کی فصیل	(صفدر میر)
۴۔	خطہ لاہور تیرے جاں نثاروں کو سلام	(رئیس امروہوی)
۵۔	اے وطن کے سجیلے جوانو	(جمیل الدین عالی)
۶۔	میں بھی پاکستان ہوں	(صہبا اختر)
۷۔	اپنی جاں نذر کروں	(مسرور انور)
۸۔	پاکستانی بڑے لڑیا	(نفیس فریدی)

ان کے علاوہ صوفی تبسم اور چند دوسرے شعرا کے پنجابی نغمے بھی بہت مشہور ہوئے۔ اس جنگ کے دوران جو کچھ لکھا گیا وہ دوسری عالمی جنگ کے دوران (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) لکھی جانے والی مختلف زبانوں کے عالمی ادب کی یاد دلاتا ہے۔ روس، امریکہ، برطانیہ اور فرانس میں فسطائی قوتوں کے خلاف جو کچھ لکھا گیا وہ تاریخ ادب کا ایک الگ باب ہے۔ یہ خونی باب ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانے تک چلتا ہے اور پھر کوریا کی جنگ (۱۹۵۰ء) ایک نئے اندازِ فکر کو جنم دیتا ہے۔ اس تباہی نے دنیا کے سبھی انسانوں کی آنکھیں کھول دی تھیں اور جنگ سے ایک عمومی نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ خود امریکہ کے بہت سے اہل قلم نے حکومت کے خلاف آواز اٹھائی۔ اسی طرح فرانس اور برطانیہ میں بھی جنگ کے خلاف بہت لکھا گیا۔ پھر عالم گیر امن تحریک چلی جس سے عالمی انسانیت کا ضمیر جاگ اٹھا اور امریکہ کو اپنی سیاسی حکمت عملی بدلنا پڑی۔ لیکن ہندوستان اور پاکستان نے ۱۹۶۵ء کی جنگ سے کچھ نہ سیکھا دونوں ملک خود کو حق بجانب سمجھتے رہے۔ پاکستان کے اندر ایک اور سیاسی خلفشار نے سر اٹھایا مشرقی پاکستان نے اپنے حقوق کا مطالبہ کیا۔ جنرل یحییٰ خان نے جو ایوب خان کو ہٹا کر اقتدار میں آئے تھے انھوں نے (۱۹۷۱ء میں) مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کی فوج بھیج دی۔ اس نے وہاں جو کچھ کیا، وہ تاریخ کا بدترین باب ہے۔ ۱۹۷۱ء میں مسلمانوں ہی نے مسلمانوں کو مارا اور لاکھوں مسلمان

''شہید'' ہو گئے۔ (اس لڑائی میں کس ''قاتل'' کو ''غازی'' کا درجہ ملے گا اور کس ''مقتول'' کو ''شہید'' کا، روزِ حساب اس کا فیصلہ ہوگا)۔

مشرقی پاکستان کے باغیوں نے ہندوستان میں ''جلاوطن حکومت'' بنالی اور ہندوستان سے مدد کے طلب گار ہو گئے۔ جنگ ہوئی پاکستان ٹوٹ گیا اور بنگلہ دیش بن گیا۔ ہماری ۹۳ ہزار فوج ہندوستان کی قیدی بن گئی۔ ذوالفقار علی بھٹو صاحب جو ایک عوامی رہ نما تھے، ایک سویلین تھے مگر مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے اور باقی ماندہ ملک کی باگ دوڑ سنبھال لی۔ حمایت صاحب نے مشرقی پاکستان پر مغربی پاکستان کے فوجی اقدام کے حوالے سے ایک نظم لکھی تھی۔ ''مارچ پاسٹ ۱۹۷۱ء''۔ یہ نظم ایک نئے انداز کا ترانہ ہے۔[1] میں یہاں صرف ایک بند لکھتی ہوں:

مارچ پاسٹ ۷۱ء

سپاہی جنگ پر چلے ہیں کتنی آن بان سے
بدن پہ وردیاں سجائے کس عجیب شان سے
تڑپ کے دیکھتی ہے صبح جھک کے آسمان سے
جوان جا رہے ہیں آج آپ اپنی جان سے
نبرد آزما ہے کون پردۂ مجاز میں
نہ جانے کتنے راز ہیں نہاں اس ایک راز میں

یہ نظم حمایت صاحب کی سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' میں بھی شامل ہے۔ جس کے خلاف ایک سال تک لکھے جانے والے مراسلے اور مضامین، میں نے مختلف اخبارات اور رسائل سے لے کر ''بارش سنگ سے بارش گل تک'' کے نام سے ایک کتاب میں مرتب کر دیے ہیں۔ اس کتاب میں اہل فکر و نظر کے بے شمار تاثرات اور تجزیے بھی شامل ہیں (مطبوعہ ۲۰۰۲ء) مطالعہ فرمالیں۔ ساری حقیقت کھل جائے گی۔

اس نظم کے علاوہ ''آئینہ در آئینہ'' میں کراچی کے ''لسانی فسادات'' پر بھی ایک نظم ''پس دیوار حرف'' کے عنوان سے ہے جو روزنامہ ''جنگ'' میں رئیس امروہوی کی اس نظم کی اشاعت کے بعد برپا ہوئے تھے، جس کا پہلا مصرعہ کسی قدیم اردو شاعر کے مشہور مصرعے میں، ایک لفظ ''عاشق'' کو بدل

کر لکھا گیا تھا۔ یعنی:

''اردو'' کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اس کا سیاسی پس منظر یہ تھا کہ سندھ اسمبلی میں سندھی زبان کو صوبہ سندھ کی سرکاری زبان بنانے کا بل پاس ہوا تھا اور اردو جو پاکستان کی ''قومی زبان'' ہے اور آج تک ''سرکاری زبان'' نہیں بنائی گئی۔ ظاہر ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق مرکزی حکومت سے تھا مگر چوں کہ اس وقت بھٹو صاحب ملک کے وزیر اعظم تھے اس لیے اردو کے پرستاروں نے سندھ اسمبلی کے فیصلے کو ''مورِ دالزام'' ٹھہرایا اور سندھ میں بے شمار لوگ شہید ہو گئے۔ لیاقت آباد (سابقہ لالو کھیت) نمبر ۱۰ کے چوراہے پر ''اردو کے شہدا'' کے مزار اس بدترین سانحے کی یادگار کے طور پر آج بھی موجود ہیں۔ حمایت صاحب کی نظم تو طویل ہے میں صرف دو بند لکھتی ہوں، آپ کو انھی سے ان کے نقطۂ نظر کا علم ہو جائے گا۔

کس کو قاتل کہوں، کس کو بسمل کہوں — یہ میرا دوست ہے، وہ مرا بھائی ہے
اپنی تاریخ سے گر اسے پیار ہے — اپنی تہذیب کا وہ بھی شیدائی ہے
بے زبانی کا ہے یہ بھی مارا ہوا — وہ بھی اپنی زباں کا تمنائی ہے

ملک میں جب ایسے حالات ہوں، نت نئے مسائل چھڑے ہوئے ہوں تو شعرا اور ادیب کیسے خاموش رہ سکتے ہیں۔ نتیجتاً وہ شاعری جنم لیتی ہے جس پر ''صحافتی'' اور ''وقتی'' ہونے کا الزام رکھا جاتا ہے۔ ایسا ادب ہر ملک اور ہر زبان میں تخلیق ہوا ہے۔ اگر اہلِ قلم ان حالات پر نہ لکھیں اور شعر و ادب کی ابدی قدروں کے عشق میں ملک و قوم سے بے نیاز رہیں تو ان پر بے حسی کا الزام آ سکتا ہے۔ ان کا ضمیر خود انھیں ملامت کرنے لگتا ہے۔ ایسے دور میں کوشش ہوتی ہے کہ وہ لکھا جائے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کی سمجھ میں آئے اور ان کی رہ نمائی کرے جیسا کہ حمایت صاحب کی ایک نظم ''لمحۂ فکر'' سے واضح ہوتا ہے:

تم بھی فریب خوردہ ہو ہم بھی تھے بے خبر — دونوں ہی باشعور نہ تھے قصہ مختصر
تاریخ ہر قدم پہ دکھاتی تھی آئینہ — تاریخ کا مذاق اڑاتے تھے دیدہ ور
اب زخم سر کھلا تو ملا سنگ کا سراغ — پتھر سے بے نیاز تھا ہر ایک شیشہ گر

بعض ایسے بھی اہلِ قلم ہیں جو خارجی مسائل سے دل چسپی ہی نہیں رکھتے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ

صرف اپنے لیے لکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ خود فریبی ہے۔ انسان اپنی ذات میں بھی ایک انجمن ہوتا ہے اور تنہا ہو کر بھی تنہا نہیں ہوتا۔ وہ علامتوں اور استعاروں میں بھی وہی کہتا ہے جو اس کے شعور کا تقاضہ ہوتا ہے۔ ہر چند وہ اپنی تحریر کو ''لاشعور'' سے تعبیر کرتا ہے مگر وہ بھول جاتا ہے کہ جن الفاظ میں وہ اپنے ''لاشعور'' کی تصویر کھینچتا ہے وہ اس کا شعور ہی فراہم کرتا ہے۔ یہ ادیب عموماً ''جدیدیت'' کے طرف دار ہوتے ہیں جو اردو میں ترقی پسند تحریک کے بعد انتقاماً وجود میں آئی ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس کے مخالف وہ ہیں جو کبھی ترقی پسند نہیں رہے بلکہ اس کے شدید مخالفین میں شمار ہوتے رہے۔

خیر یہ ایک الگ مسئلہ ہے جو اس مقالے میں کہیں زیر بحث بھی آ جائے گا فی الحال تو میں حمایت صاحب کی اس شاعری کا جائزہ لے رہی ہوں جو مختلف مسائل سے جنم لیتی رہی ہے۔ ''مٹی کا قرض'' کا بیشتر کلام فکری شاعری کی تعریف میں بھی آتا ہے (ان کی فکر اور ان کے مخصوص خیالات اور نظریات کا میں اگلے باب میں تجزیہ کروں گی) وہ ''مخصوص فکر''، ہر چند ان کی مسائلی شاعری میں جھلکتی ہے۔ مثلاً ''وفاداری بشرطِ استواری''، ''بابائے اردو'' اور خاص طور پر ''چاند''، ''خورشید کا رازداں''، اور ''منظر اور پس منظر'' (۱۹۵۹ء) علامتی ہونے کے باوجود ایک وقتی پس منظر رکھتی ہیں۔

پاکستان بے شمار مسائل کا ملک ہے۔ ابھی تک اس کی بنیادیں استوار نہیں ہوئیں کہ اہلِ فکر و نظر کو اس کے وجود کی طرف سے بے نیاز کر دیں۔ مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے سے مسائل اور بھی گھمبیر ہو گئے ہیں۔ ''موجودہ پاکستان'' بھی مختلف خدشات اور اندیشوں کی زد میں ہے۔ خود اردو زبان بھی اس ملک میں اپنے پاؤں نہیں جما سکی۔ پنجاب جو برصغیر میں اردو کی ''آخری پناہ گاہ'' ہے آج تک اس کے تحفظ کا یقین نہیں دلا سکا۔ وہاں اردو یونیورسٹی تو کجا کوئی اردو کالج تک قائم نہیں ہوا۔ اردو جب تک ملک کی تعلیمی اور سرکاری زبان نہیں بن جاتی اس کا مستقبل غیر محفوظ ہے۔ وہ ''بڑی زبان'' نہیں بن سکتی۔ خاص طور پر سائنسی علوم تو اردو میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ خیر..... یہ بھی ایک بحث طلب مسئلہ ہے۔

حمایت علی شاعر کی شاعری ''مٹی کا قرض'' سے آگے بڑھنے کے باوجود ''ہارون کی آواز'' میں بھی اکثر مقامات پر وہی روش اختیار کرتی نظر آتی ہے جو ایک طرح سے جذباتی اور مسائل پسندانہ

ہے۔ ان کے اشعار میں نت نئی علامتیں بھی آتی ہیں اور ان کا کینوس بھی وسیع ہوا ہے مگر وہ ہیں مسائلی نظمیں۔ جہاں وہ ''یوم مئی'' جیسی نظمیں لکھتے ہیں۔ وہیں جدیدت پر بھی تنقید کرتے نظر آتے ہیں۔ اس حوالے سے اپنی سوانح حیات میں بھی انھوں نے بہت واضح الفاظ میں لکھا ہے۔ جدیدیت کے بارے میں ان کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے:

جدیدیت بھی اسی جستجو کا ہے اک نام — ابد کی بات ہو لیکن بہ صورت ابہام
درون لفظ ہو معنی کی شکل تجریدی — جو بات ہو وہ نہ تائیدی ہو نہ تردیدی
خیال و خواب کا ہو اک جہانِ پراسرار — علامتوں میں ہو پوشیدہ زیست کی پیکار
ہو تجزیہ کسی موہوم داخلیت کا — پڑے نہ عکس کہیں سے بھی خارجیت کا

حمایت علی شاعر ادب کی اعلیٰ اور ابدی قدروں کا بھی علم رکھتے ہیں۔ میں ان کی فکری شاعری کے باب میں اس کا بھی جائزہ لوں گی۔ مگر وہ روزمرہ کے مسائل سے غافل کبھی نہیں رہے۔ بقول ایلیا اہرن برگ۔

''ادیب یا شاعر کو اس لمحے پر بھی اختیار ہونا چاہیے جس لمحے میں اس کے ملک یا اس کی قوم کا فیصلہ ہونے والا ہے۔''

وہ لمحات کے باطن میں بھی سفر کرتے رہے ہیں اور وقت کی ابدیت میں بھی۔ ان کا ادب کسی مخصوص ''پلاننگ'' کا کبھی اسیر نہیں ہوا۔ ادب کی ''اکائی'' میں وہ کئی ''دہائیاں'' بھی دیکھتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی ایک صنف پر قانع نہیں رہے اور ہر صنفِ ادب میں خود کو آزماتے رہتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا مقصد ''اظہار'' ہے۔ جیسے قدرت ہزار آئینوں سے جھانکتی ہے اور اپنی وحدت کا یقین دلاتی ہے۔ ان کے خیال میں ایک تخلیق کار یا فن کار کا بھی یہی منصب ہوتا ہے۔

پچھلے برسوں میں جب کراچی میں زندگی غیر محفوظ ہو کر رہ گئی تھی۔ صبح و شام خون بہنے لگا تھا۔ حمایت صاحب نے ایک بڑی کربناک نظم لکھی تھی:

''وطن کی فکر کر ناداں .....''

علامہ اقبال کا ایک مشہور شعر ہے:

وطن کی فکر کر ناداں قیامت آنے والی ہے

تری بربادیوں کے تذکرے ہیں آسمانوں میں

حمایت صاحب نے لکھا:

ابھی تو کچھ نہیں ہوا، ابھی تو ابتدا ہے یہ
اور اب وہ وقت آئے گا کہ ساری قوم روئے گی
اور اپنے دل کے داغ اپنے آنسوؤں سے دھوئے گی
یہ سرزمینِ پاک ہے کہ ارضِ کربلا ہے یہ
یہ لوٹ مار، قتل و خون، ڈکیتیاں، تباہیاں
بموں کی زد پہ ہنستی گاتی جگمگاتی بستیاں
بہشت میں کہاں سے اک جہنم آ گیا ہے یہ

یہ نظمیں ایک دردمند دل ہی لکھ سکتا ہے۔ ایسے حالات میں ''ادب کی ابدیت'' کے بارے میں سوچنا ''خود غرضی'' ہے۔ ایسے وقت میں حقیقت کے ادراک کا تقاضا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنایا جائے اور ملک و قوم کی حفاظت کی جائے۔

نوحے اور مرثیے

حمایت علی شاعر نے بعض شخصیتوں، کچھ رشتہ داروں اور دوستوں کے نوحے اور مرثیے بھی لکھے ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں انسانی رشتوں کا کتنا احترام ہے۔ گاندھی جی، سعادت حسن منٹو (دو نظمیں)، فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، سکندر علی وجد، سرور بارہ بنکوی، حسن ناصر، سلیم احمد، لطیف ساجد، بینش سلیمی، مظہر اکبر، عبدالماجد (ریڈیو آرٹسٹ)، اسمٰعیل اور جولیس روزن برگ، عزیز قیسی، مہر الٰہی شمس (ایڈیٹر۔ روزنامہ ''کلیم'' سکھر)، اپنے پھوپھی زاد بھائی قاضی شفیع کے والد، اپنی ننھی بیٹی آسماں اور اب اپنی شریک حیات محترمہ معراج نسیم جن کا انتقال حال ہی میں کینیڈا میں ہوا ہے۔ ان تمام حضرات کا غم آنسو بن کر ان کے اشعار میں ڈھل گیا ہے۔ اپنی بیگم کی وفات پر تو انھوں نے بیس پچیس نظمیں لکھی ہیں۔

ہماری شاعری میں انسانی رشتوں کے ٹوٹنے کا غم اور ظالم کے ہاتھوں مظلومین کا قتل اور ان کی بے گور و کفن شہادت کے المیے صرف ان مرثیوں میں ملتے ہیں جو کربلا میں امام حسینؓ اور ان کے رفقا

کو پیش آئے تھے، ایسے المناک واقعات، ایسے قتل وخون کی وارداتیں جو ''ہمارے عہد کا المیہ'' بن جاتی ہیں۔ خون کے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ دل کے ٹکڑے بکھر جاتے ہیں، ہماری عزیز ترین ہستیاں خاک میں مل جاتی ہیں۔ اب ان پر عموماً کم لکھا جاتا ہے یا اگر لکھا بھی جاتا ہے تو اسے بھی ''مرثیے'' کا نام ہی دیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہے۔ مجھے بھی حمایت صاحب کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ اب مرثیہ کربلا سے منسوب ہو کر رہ گیا ہے۔ ہمیں اپنے غموں کے لیے کوئی اور ''اصطلاح'' وضع کرنی چاہیے۔ جیسے مذہبی حوالے سے ''تعریف'' کے لیے حمد، نعت اور منقبت جیسے الفاظ مخصوص کر دیے گئے ہیں۔ اردو شاعری میں بعض اصناف سخن موضوعی اور بعض ہیئتی ہیں۔ موضوعی اصناف سخن میں حمد، نعت، منقبت کے علاوہ مرثیہ، مثنوی، قصیدہ اور شہر آشوب وغیرہ ہیں جو کسی بھی ہیئت میں کہے جا سکتے ہیں۔ جبکہ ہیئتی اصناف میں غزل، مثلث، ثلاثی، مربع، رباعی، مخمس، خماسی، مسدس اور سداسی وغیرہ ہیں۔ (خماسی صرف قتیل شفائی نے لکھی اور سداسی ابھی تک کسی نے نہیں لکھی۔ یہ صنفی نام بھی ثلاثی کی طرح ''تجویز کے طور پر'' حمایت صاحب ہی نے رکھے ہیں) اب تازہ ترین صنف ''ترونی'' گلزار نے اختیار کی ہے۔

مرثیہ دکنی شاعری میں عموماً غزل کی ہیئت میں لکھا گیا۔ میر تقی میر اور سودا نے مربع کی ہیئت میں تحریر کیا یعنی چار چار مصرعوں کے بند کی صورت میں۔ انیس و دبیر سے ذرا پہلے اور بعد میں مسدس میں لکھا جانے لگا۔ کچھ مرثیے مخمس میں بھی ملتے ہیں لیکن اب مرثیے کے لیے ''مسدس کی ہیئت'' مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ ان ہیئتی اصناف میں دوسرے موضوعات بھی اپنائے جا سکتے ہیں اگر مرثیہ بھی لکھا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

حمایت صاحب نے اپنی ثلاثیوں کو بھی مرثیے کے لیے استعمال کیا ہے۔ انھوں نے تین مصرعوں کی وحدت سے وہی کام لیا جو مسدس کے ایک بند سے لیا جاتا ہے۔ میر انیس نے مسدس کو تسلسل کے ساتھ واقعات کے بیان کا وسیلہ بنایا اور ایسی تکنیک استعمال کی جو عموماً رباعی میں نظر آتی ہے۔ دونوں اصناف میں آخری مصرعہ ایسی ضرب لگاتا ہے کہ پورا خیال چمک اٹھتا ہے۔ حمایت صاحب ''ثلاثی'' میں یہی تکنیک استعمال کرتے ہیں۔ مرثیے کے سلسلے میں ان کی کچھ ''ثلاثیاں'' اور پھر ایک مختصر نظم ''کربلا'' دیکھیے جو مخمس میں ہے۔ پہلے امام حسینؓ کے تعارف میں کچھ ''ثلاثیاں''۔

حق کا عجب قرینۂ اظہار تھے حسینؓ
مسجد کے واسطے سے جو سوچا تو یہ کھلا
گنبد نبیؐ کی ذات تو مینار تھے حسینؓ

☆☆

یہی نہیں کہ جگر پارۂ بتولؓ تھا وہ
عمل تھا، علم تھا، کردار تھا، اصول بھی تھا
علیؓ کے بعد نمائندۂ رسولؐ تھا وہ

ہر ''ثلاثی'' ایک الگ وحدت بھی رکھتی ہے اور تسلسل کے ساتھ پڑھی جائے تو واقعات کی ترجمان بھی ہے۔ نظم ''کربلا ایک طرح سے ''جدید مرثیے'' کی تعریف میں آتی ہے۔ جدید مرثیہ رثائی سے زیادہ رجائی خیالات کا ترجمان ہوتا ہے۔ یہ وصف انیس اور دبیر کے مرثیوں میں بھی ہے مگر صرف ان مقامات پر جہاں ظالم و مظلوم کے درمیان جنگ کا بیان ہو یا حق و باطل میں تقابل کیا جا رہا ہو۔ تمام مرثیوں کا اختتام نوحے اور بین پر ہوتا ہے۔ یعنی رثائی کیفیت مقدم رکھی جاتی ہے۔ جوش صاحب پہلے شاعر ہیں جنھوں نے مرثیے سے رجائیت کا تصور ابھارا اور اسے فوقیت دی۔ ان کی نظم ''حسینؓ اور انقلاب'' اس سلسلے میں حرف اول قرار دی جاتی ہے۔ بقول میر تقی میر:

یہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

جدید مرثیے کی اب یہی روایت بن گئی ہے حمایت صاحب نے بھی اسی روایت کو اپنایا ہے۔ کہتے ہیں:

کربلا تیرے شہیدوں کا لہو بہہ تو گیا
اس لہو سے زندگی کا ایک نیا جوہر کھلا
آدمی جو پیکر خاکی تھا ایک ذرہ ہی تھا
اپنے خوں میں تپ کر ہر اک ذرہ سورج بن گیا
اب یہ سورج ہے زمیں کا رہنما..... اے کربلا
ظالم و مظلوم کی جب بھی چھڑی دنیا میں جنگ
کربلا کے ان شہیدوں کا لہو لایا ہے رنگ

مقتلوں میں زندگی کی اس طرح جاگی اُمنگ
آئینوں کی جرأتوں پر ہوگئے پتھر بھی دنگ
حق پرستوں کو ہے یہ تیری عطا، ..... اے کربلا
کربلا میں دین کے سردار نے سر تو دیا
ماں نے بیٹا، بھائی نے اپنا برادر تو دیا
بہر ناموس وفا بیوی نے شوہر تو دیا
ظالموں نے خوں کے رشتوں کو جدا کر تو دیا
تو نے ان رشتوں کو محکم کر دیا..... اے کربلا
کربلا تو زندگی کی آخری تصویر ہے
آدمیت کے سنہرے خواب کی تعبیر ہے
بندگی کی سربلندی، عشق کی تقدیر ہے
تو زمیں پر آسماں کی وہ ان مٹ تحریر ہے
جس کو دل کے خون سے لکھا گیا..... اے کربلا

یہ تو ہیں وہ مثالیں جو کربلا کے حوالے سے مرثیے کے مخصوص موضوع پر حمایت علی شاعر کے کلام میں ملتی ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ انھوں نے اپنے عہد کی شخصیتوں اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کا غم بھی منایا ہے۔ حمایت صاحب ہوں یا کوئی اور شاعر ان صدموں سے تو دوچار ہوتا رہے گا۔ زندگی کے ساتھ موت لازمی ہے جو شخص پیدا ہوا ہے اسے ایک دن مرنا بھی ہے اور یہ دکھ ہر زندہ انسان کے لیے ''موت'' سے کم نہیں۔ وہ اپنے غم کا اظہار کر کے ایک طرح سے نئی زندگی پاتا ہے۔ اس کا غم کسی حد تک ہلکا ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا اور لکھنے والے لکھتے بھی رہیں گے۔ اس صورت میں ان کے شعری اظہار کو کس صنفی نام سے موسوم کیا جائے گا؟ یہ کام شعراء کا ہے یا شاعری کے ناقدین کا۔ فی الحال تو میں اس موضوع پر لکھے جانے والے کلام کو نوحہ یا مرثیہ ہی کہوں گی۔ حمایت صاحب نے ۱۹۵۲ء میں اپنی ننھی بیٹی ''آسماں'' کی وفات پر جو اشعار لکھے تھے ان کو ڈاکٹر وزیر آغا نے ''نوحہ'' کہا تھا۔ جب کہ حمایت علی شاعر نے طنزاً اس نظم کا عنوان ''مژدۂ نو'' رکھا تھا۔ اس عنوان سے غم کی اس شدت کا اندازہ ہو سکتا ہے جو

ہمارے معاشرے کے مخصوص حالات میں ہمارے سیاست دانوں کی سنگ دلی کا مظہر ہیں۔ وہ خندۂ استہزا جو ان اشعار میں پوشیدہ ہے ہمارے پورے عہد کے کرب کا عکاس ہے۔ چھوٹی سی نظم ہے اس لیے پوری نقل کرتی ہوں:

لو یہ ایک مژدۂ نو بھی سن لو — میرے زنداں کے نئے دربانو
میرے محبوب سیاست دانو — لو یہ ایک مژدۂ نو بھی سن لو
آج اک اور ستارہ ٹوٹا — زندگی کا کوئی پھوڑا پھوٹا
ایک انسان سے بیچھا چھوٹا

ڈاکٹر وزیر آغا اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''مژدۂ نو'' جتنی مختصر نظم ہے اتنی ہی پر تاثیر بھی۔ اس میں طنز کی آمد بے محابا ہے۔ اردو ادب میں نوحوں کا مطالعہ کریں تو اس نظم کو ایک مقام امتیاز حاصل ہو''۔

ویسے تو ان کی ایک نظم ''۸ر جنوری'' اور دوسری ''دیوانی'' بھی ہے جو کراچی میں طلباء کو گولی مارنے کے المیے سے متعلق ہیں۔ لیکن ان میں صدمے اور تعزیت کے ساتھ ایک تنقید بھی ہے اور تاریخ کے ایک عمل اور ایک تغیر کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ وہی انداز فکر جو ان کی نظم ''کربلا'' میں ہے۔ ان نظموں میں بھی کارفرما نظر آتا ہے۔

حمایت صاحب کی ہر ایسی نظم میں آپ کو رثائی احساس کے ساتھ رجائی احساس بھی ملے گا خواہ انداز بیان میں تلخی ہو یا طنز۔ یا وہ کرب، جو ہر ایسے واقعے سے ایک حساس دل کو تڑپا دیتا ہے۔ اینتھل اور جولیس روزن برگ کی موت کا تو انھوں نے عالمی پس منظر میں غم منایا ہے اور تجزیہ کیا ہے۔ اس جوڑے کی قربانی سے عالمی جنگ کے خلاف ایک مثبت خیال بھی نمایاں ہوتا ہے۔ نظم کے دو طویل بند ہیں۔ ایک بند کا اختتام یہ ہے:

نئے جہاں کے نئے خداؤ — نہ جانے ان پستیوں کی تہہ میں
بلندیاں کس قدر نہاں ہیں — کہ کل ہی تم ایک ہیروشیما
زمیں میں دفن کر کے اٹھے — اور آج ایک چین ابھر گیا ہے

ایسی نظمیں ''حسین اور انقلاب'' کی یاد دلاتی ہیں۔ لیکن انسان پتھر نہیں ہوتا۔ غم کی شدت میں وہ بھی رو پڑتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خون بھی اتر آتا ہے مگر اپنی بے بسی کا احساس اسے کچھ کرنے

نہیں دیتا۔ جو نظمیں اس عالم میں لکھی گئی ہیں ان میں حمایت علی شاعر کا لہجہ کچھ اور ہے۔ وہ اپنے کرب کے ساتھ پورے عہد کا کرب سمیٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً سعادت حسن منٹو پر ان کی دو نظمیں ہیں۔ ایک نظم ''ابن مریم'' کے قلمی نام سے ہے۔ نظم کا عنوان ''منٹو'' (ایک سرکش دماغ تھا۔ نہ رہا) ہے

خوش ہو اے سرزمین موت پناہ
تیرا اک بارِ دوش اتر ہی گیا
تیرے فیض کرم سے اک فن کار
آخر کار آج مر ہی گیا

یہ نظم ''آگ میں پھول'' کے پہلے ایڈیشن میں نہیں ہے۔ دوسرے ایڈیشن ۱۹۸۱ء میں اس کا عنوان ''زہر خند'' رکھا گیا اور اشعار میں بھی کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ سعادت حسن منٹو پر دوسری نظم ذرا طویل ہے۔ اس میں شاعر نے اپنے ذاتی محسوسات کا ذکر کیا ہے۔ کچھ متفرق اشعار ملاحظہ کیجیے:

یوں دل دھڑک کے ہو گیا خاموش یک بہ یک
جیسے خود اپنے گھر کا کوئی فرد مر گیا
کس کو خبر اِس ایک جنازے کے ساتھ ساتھ
قبروں تک اپنی، کتنے جنازے گئے ہیں آج

اسی طرح ایک اور شخصیت (حیدر آباد دکن کے ایک شاعر) لطیف ساجد کی وفات پر بھی ایک چھوٹی سی نظم ''سکوت مضطرب'' کے عنوان سے ہے:

دل میں ایک حشر سا برپا ہے جو خاموش بھی ہے

یہی ''خاموش حشر''، ''لاشوں کی بستی'' میں بھی محسوس ہوتا ہے جو اپنے ملک کی مجموعی بے حسی کا آئینہ ہے:

کوئی منٹو چل بسے، حسرت بچھڑ جائے کوئی
لیلیٰ شام و سحر کی زلف تک برہم نہیں
کیسے کیسے لوگ دنیا سے چلے منہ موڑ کر
اور دنیا کا یہ عالم فرصتِ ماتم نہیں

زندگانی اک مسلسل موت ہو کر رہ گئی
اس قدر خاموش ہیں سب جیسے کوئی غم نہیں

حمایت صاحب نے ایک نظم حسن ناصر جیسے انقلابی کی موت پر بھی لکھی تھی جسے فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے دور میں لاہور کے قلعہ میں اذیتیں دے کر قتل کیا گیا تھا:

آج اخبار کی سرخی پہ نظر پڑتے ہی
میرے اندر سے کوئی مہر بہ لب چیخ پڑا
میرے جذبات کی غیرت، میرے ہونٹوں کا سکوت
میرا فن چیخ پڑا، میرا ادب چیخ پڑا
یہ زمیں حق کی پرستار ہے؟ باطل باطل
سینۂ حق سے صدا آتی ہے قاتل قاتل

عبدالماجد ریڈیو پاکستان کراچی کے ایک بڑے فن کار تھے صداکار، ڈرامہ نگار اور حمایت صاحب کے دکن ریڈیو کے ساتھی۔ ان کی وفات حمایت صاحب کا ذاتی غم بھی تھا اس نظم کا آخری بند دیکھیے:

اے دل رو لے، یا چپ ہو لے اور کرے گا بھی تو کیا
اس غم کے آگے تیری آہیں کیا ہیں، آنسو کیا
یہ وہ غم ہے جن کے لیے الفاظ کا دامن بھی ہے تنگ
ان لفظوں سے نکلیں گے، تسکینِ دل کے پہلو کیا

اس طرح سرور بارہ بنکوی کی موت پر ان کی نظم ''تیسری ہجرت'' بھی طنز میں ڈوبا ہوا ایک تاثر رکھتی ہے:

سرور! تم بھی چلے گئے ہو
خدا کی یہ سرزمیں تمھیں بھی نہ راس آئی؟

نظم کا یہ حصہ پڑھیے:

یہ زہر غم جس کو پی کے تم نیل کنٹھ کی طرح جی رہے تھے
(کسے خبر تھی) تمھیں اس ایثار کا وہ اجر عظیم دے گا

کہ تم وطن در وطن نئی ہجرتوں کے پیہم عذاب کی اک مثال بن کر
ہماری تاریخ کے لیے ایک سوال بن کر
خدا کی اس سرزمین کا احساں اتار دو گے

یہ نظم ایک خاص زاویے سے لکھی گئی ہے جس میں مشرقی پاکستان کا المیہ بھی سمٹ گیا ہے۔ پھر ایک بہت ہی قریبی دوست منظر اکبر کے انتقال پر ایک نظم ''چراغ بجھ گیا'' لکھی۔ اس کے دو تین شعر دیکھیے:

لوگ ملتے ہیں سر راہ بچھڑ جاتے ہیں
لیکن اک دوست جو دل میں رہا دھڑکن بن کر
وادی جاں میں رہا، روح کا مسکن بن کر
ایسا انسان جدا ہوا یہ غضب ہے کہ نہیں
اپنے اللہ کی رحمت بھی عجب ہے کہ نہیں
لوگ ملتے ہیں سر راہ بچھڑ جاتے ہیں
جیسے ہم اجڑے ہیں کب ایسے اجڑ جاتے ہیں

سلیم احمد، حمایت صاحب کے ہم عصروں میں ایک خاص نقطۂ نظر کے آدمی تھے۔ ان کی شاعری میں جدید و قدیم ادوار گلے ملتے نظر آتے ہیں۔ وہ کہیں بہت روایت پسند نظر آتے ہیں اور کہیں اتنے جدید کہ ''جدیدیت'' منہ دیکھتی رہ جاتی ہے۔ حمایت صاحب کے ان سے نظریاتی اختلافات بھی تھے۔ سلیم احمد کا جھکاؤ ''جماعت اسلامی'' کی طرف تھا۔ جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں وہ ایک جماعتی وزیر محمود اعظم فاروقی (وزیر اطلاعات) کے مشیر بھی بنائے گئے تھے۔ ان کی طویل نظم ''مشرق'' (جو ان کے انتقال ۱۹۸۳ء کے چھ سال بعد ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی) جو ہندوستان سے ہجرت اور پاکستان میں آباد ہونے کے بعد کراچی کے حالات، ریڈیو پاکستان اور کراچی کے بے شمار احباب سے متعلق ہے۔ سلیم احمد نے اپنے اشعار میں سب دوستوں کی تصویریں کھینچی ہیں۔ یہ طویل نظم کہیں آزاد ہے اور کہیں پابند۔ اس نظم سے بھی سلیم احمد کے مخصوص خیالات کا سراغ ملتا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ''اختلاف'' کو ''مخالفت'' کا رنگ نہیں دیتے تھے۔ ان کی دوستیاں سبھی سے تھیں۔ اپنی تحریروں میں بھی وہ بڑے متنوع نظر آتے ہیں۔ جہاں انھوں نے

خالص ادب لکھا وہاں فلم کے لیے بھی لکھا۔ ریڈیو اور ٹی وی ڈراموں کے علاوہ مختلف ایسے اسکرپٹ بھی لکھے جو حکومت وقت کی پالیسی کی حدود میں رہ کر لکھے جاتے تھے۔

سلیم احمد کی غزلوں میں ایسی غزلوں کی بھی کمی نہیں جنھیں ''جنسی شاعری'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان پر اوروں نے بھی اعتراض کیا اور حمایت علی شاعر نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان اختلافات کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے دوست بھی تھے۔ سلیم احمد نے ''مشرق'' میں جہاں اور دوستوں کا نقشہ کھینچا، وہیں حمایت صاحب کے بارے میں بھی اپنے انداز میں لکھا۔

یہ اصلی بھی شاعر ہیں اور نام کے بھی — یہ حیرت کہ ہیں آدمی کام کے بھی
ترقی پسندی پہ منڈلا رہے تھے — یہ بنگال سے کوریا جا رہے تھے
کہ رستے میں ایک پھیرا ایسا بھی آیا — کہ امریکیوں کا پڑا ان پہ سایا
بظاہر تو ہیں انقلابی جواں سے — یہ پیسہ وصولا ہے ایوب خاں سے
نظریوں میں ہے میری ان کی لڑائی — یہ ان کو سمجھتا ہوں سوتیلا بھائی
یہ گانے بھی لکھیں، فسانے بھی لکھیں — ڈرامے بھی لکھیں ترانے بھی لکھیں
ٹھکانا نہیں ہے کوئی آدمی کا — یہ خود ایک کردار ہیں زندگی کا
بہرحال شہرت کے جنگلے میں پہنچے — سڑک سے چلے اور بنگلے میں پہنچے
لگائی تھی شاید یہ حضرت نے بازی — سو پیشہ ہے اب آپ کا فلم سازی

اس حوالے سے جب حمایت صاحب سے میری گفتگو ہوئی تو انھوں نے کہا کہ سلیم احمد نے ''مشرق'' کے اکثر حصے دوسرے دوستوں کے ساتھ انھیں بھی سنائے تھے۔ مگر حمایت صاحب سے متعلق حصہ کبھی نہیں سنایا۔ یہ حصہ انھوں نے کتاب شائع ہونے کے بعد ہی پڑھا تھا۔

بہرحال اس نظم سے کتاب کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان اور امریکہ کے حوالے سے جو الزامات انھوں نے حمایت صاحب پر لگائے ہیں حمایت صاحب نے کہیں ان کا جواب بھی دیا ہے (ان کی کتاب ''شخص و عکس'' (۱۹۸۴ء) میں بعض متنازعہ مضامین کے جوابات بھی شامل ہیں) اور ''آگ میں پھول'' پر صدارتی ایوارڈ کے سلسلے میں بھی جمیل الدین عالی صاحب کے ایک خط کے جواب میں حمایت علی شاعر نے اپنی منظوم سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' کے ''اشاریہ'' صفحہ ۳۷۲ اور ۳۷۳ پر وضاحت سے لکھا ہے۔ ''شخص و عکس'' جب مرتب ہو رہی تھی سلیم احمد کا انتقال ہو

گیا۔ حمایت صاحب نے ان کے انتقال پر ایک مضمون بھی لکھا ہے جو اس کتاب میں شامل ہے بلکہ حمایت صاحب نے اس کتاب کا انتساب بھی سلیم احمد ہی کے نام کیا ہے۔ (ایک ثلاثی)

وہ ایک شخص کہ سایہ بھی تھا، اجالا بھی
ہر اختلاف کا مرکز رہا مگر برسوں
رقابتوں میں محبت کا تھا اجالا بھی

حمایت صاحب انسانی رشتوں کے بڑے قدرداں ہیں۔ ان کی وہ نظمیں جو احباب کے انتقال پر ان کے تاثرات کی آئینہ دار ہیں پُر اثر ہی نہیں بلکہ ان کی کشادہ دلی اور اعلیٰ ظرفی کی بھی دلیل ہیں۔ ادب کی بڑی شخصیتوں کے انتقال پر ہماری ادبی دنیا میں جس ذہنیت کا مظاہرہ کیا جاتا ہے وہ بعض اوقات بہت ہی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اتفاق سے حضرت جوش، حضرت فراق اور حضرت فیض کے انتقال کے بعد ''جانشینی'' کے موضوع پر جو باتیں ہوتی رہیں وہ مخصوص لوگوں کی تنگ نظری کی بھی دلیل ہیں۔ ان بحثوں میں خودغرضی کا ہی مظاہرہ ہوا ہے، میرا خیال ہے کہ یہ ذہنیت ہماری قوم میں ''بادشاہوں'' کی زیرنگرانی زندگی گزارنے کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ اگر مسلمان حکومتوں میں ''خلافت'' (جمہوریت کی طرف پہلا قدم) کا راج ہوتا تو آج ہم بھی کچھ اور ہوتے۔

حمایت صاحب نے جوش، فراق اور فیض کے بچھڑنے پر اپنے ادبی ماحول کا جائزہ جس نظم میں پیش کیا وہ اسی ذہنیت کی تنقید ہے۔

اک پہاڑ ڈھ گیا
بگولے ناچ اٹھے کہ خاک سربلند ہوگئی
اک جہاز غرق ہو کے رہ گیا
ہر اک موج اچھل پڑی کہ فتح مند ہوگئی
ایک آفتاب شب کی ظلمتوں میں گہنا گیا
ستارے ہنس پڑے کہ روشنی دوچند ہوگئی
چھلک رہا ہے ظرف ظرف
آئینہ ہے حرف حرف
تماشا یہ بھی ہو رہا ہے شعر کی بساط پر

فراق اور جوش اور فیض کی وفات پر

فراق صاحب کے انتقال پر ان کی نظم ''آج فراق بھی گئے'' قابل مطالعہ ہے:

جوش کو رو رہے تھے ہم آج فراق بھی گئے
خون رو میری چشم نم آج فراق بھی گئے

اس نظم میں فراق صاحب کی پوری شخصیت سمٹ آئی ہے۔ ان کی تمام کتابوں کے نام، غزل میں ان کا مقام اور جو بھی ان کی خوبیاں تھیں حمایت صاحب نے سب اس میں رقم کر دی ہیں۔ آخری دو شعر اور پڑھ لیجیے آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا:

''شعلۂ ساز'' بجھ گیا سو گئی ''روحِ کائنات''
''روپ'' سنوارے کیا صنم آج فراق بھی گئے
جوش کے بعد کون ہے ''نغمہ نما'' کہیں جسے
ایک فراق کا تھا دم آج فراق بھی گئے

حمایت صاحب بلاشبہ دوستوں کے دوست ہیں اور قابل قدر انسانوں کے بہت ہی قدرداں۔ چاہے وہ کوئی مشہور آدمی ہو یا گمنام۔

سکھر کے ایک دوست مہر الٰہی شمسی جو روزنامہ ''کلیم'' (سکھر) کے ایڈیٹر بھی تھے۔ ان کا پُرسہ سکھر کے تمام دوستوں کو دیا۔ اس مرثیے میں نکہت بریلوی، حسن حمیدی، آفاق صدیقی، خالد علیگ، مظہر جمیل، مسلم شمیم، ن م نیازی اور نجم الحسن رضوی سبھی کو مخاطب کیا گیا ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں:

اب گرد و پیش رات کا ڈیرا ہے اور ہم
کچھ روشنی تھی دل میں تو شمسی کے نام سے
اب بزم دوستاں ہے، اندھیرا ہے اور ہم

انھوں نے شمسی صاحب کے انتقال پر قطعۂ تاریخ بھی لکھا تھا:

تھا شعلہ بجاں، مہر الٰہی شمسی
بے فکر زیاں، مہر الٰہی شمسی
ہم سب کی نظر میں تھا بہ عنوان ''کلیم''
سکھر کا نشاں، مہر الٰہی شمسی

۱۴۰۸ھ

اسی طرح انھوں نے اپنے بچپن کے دوست سیّد شاہ عزیز الدین کا قطعہ تاریخ وفات بھی کتنا خوبصورت لکھا ہے۔ دیکھیے:

زیر سایۂ پاک فلک، زیر سایہ پاک زمیں
محوِ خواب ہیں آج یہاں، راہی راہِ خلد بریں
نام و صفات سے نکلی ہے، اس کی یہ تاریخ وفات
حق بیں، ہم دم، نیک، متین، سید شاہ عزیز الدین

۱۴۰۸ھ

بظاہر ایسے قطعات اور نظمیں لمحاتی اور وقتی محسوس ہوتی ہیں۔ مگر لکھنے والے کے مزاج کی ملائمت، اس کے دماغ کی وسعت اور اس کی کشادہ دلی کا سراغ دیتی ہیں۔ ان کے ایک دوست عزیز قیسی بھی تھے۔ بہت اچھے شاعر اور ہندوستان کی کئی فلموں کے کہانی نویس۔ حمایت صاحب نے ان کے انتقال پر ۱۹۹۶ء میں ایک نظم لکھی۔

وہ دوست میرا وہ یار میرا عزیز قیسی
وہ شاعر طرح دار میرا عزیز قیسی

اسی طرح سکندر علی وجد جو مخدوم کے ہم عصر تھے ان پر بھی حمایت صاحب کی نظم خوب ہے۔[۲]

ایک شاعر جو بہت خوب تھا مخدوم کے بعد
وجد تھا اور مجھے محبوب تھا مخدوم کے بعد

اس نظم میں وجد صاحب کی پوری شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے حمایت صاحب نے اس شعر پر اپنی نظم ختم کی ہے:

اس کے الفاظ میں ہر نقش کہن زندہ ہے
اس کے اشعار میں ہر صاحب فن زندہ ہے

وجد کے علاوہ بینش سلیمی کے انتقال پر بھی حمایت صاحب نے لکھا حالاں کہ وہ کوئی مشہور شاعر نہ تھے۔ حیدرآباد سندھ میں بھی انھیں کم ہی لوگ جانتے تھے۔ دو تین شعر اس نظم کے بھی پڑھ لیجیے:

رفیق تھا، غم گسار تھا وہ اک آدمی دوست دار تھا وہ

بہت کم آمیز و کم سخن تھا پہ شاعر طرح دار تھا وہ
میں اس کا افسانہ کیا سناؤں یہی کہ بس میرا یار تھا وہ

ایسا آدمی جس سے بھی محبت کرتا ہے ٹوٹ کر کرتا ہے۔ انھیں اپنی بیگم سے بھی ایسی ہی محبت تھی۔ ''آئینہ در آئینہ'' میں آپ نے ان کی محبت کا احوال پڑھا ہوگا۔ پہلی ملاقات، عالم فرقت، گھرانے سے بغاوت، شادی اور پھر وہ نعمتیں جو فراق صاحب کے اس مصرعے کے مصداق ہیں:

تو ایک تھا، میرے اشعار میں ہزار ہوا

ان کی پوری زندگی ایک بھرپور محبت سے آباد رہی ہے۔ اس محبت نے انھیں جو حوصلہ بخشا کہ بقول علی سردار جعفری:

دامن جھٹک کے منزل غم سے گزر گیا
اٹھ اٹھ کے دیکھتی رہی گرد سفر مجھے

''غم دوراں'' منہ دیکھتا رہ گیا اور حمایت صاحب ہر کٹھن منزل سے آگے نکل گئے۔ انھوں نے جو کچھ حاصل کیا اسی محبت کے طفیل حاصل کیا۔ ان کی رفیق حیات محترمہ معراج نسیم کا یک ان سے بچھڑ گئیں اچانک ہی یہ انکشاف ہوا کہ وہ جگر کے سرطان میں مبتلا ہیں۔ ان کے ڈاکٹر بچوں نے پاکستان، امریکہ اور کینیڈا کے ہر بڑے اسپتال، بڑے سے بڑے ڈاکٹر سے ان کا علاج کرایا۔ مگر ''وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے'' کے مصداق وہ ان سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئیں۔ نصف صدی کا ساتھ اچانک چھوٹ گیا۔ کینیڈا ہی میں محترمہ کی تدفین عمل میں آئی۔ حمایت صاحب پر جو گزری اس کا اندازہ ہر صاحب دل کر سکتا ہے۔ میں یہاں دو نظمیں نقل کر رہی ہوں۔ پہلے وہ، جب کینیڈا میں محترمہ کی تدفین ہوئی اور حمایت صاحب پاکستان واپس آنے لگے۔

غمِ معراج.....معراجِ غم

اے کینیڈا کی خاک، امانت ہے تیرے پاس میری متاعِ عشق، مری دولتِ ثبات
میری بہشتِ خواب، مری کائناتِ دل میری تمام عمر، مرا حاصلِ حیات
آیا تھا میں یہاں کہ مسیحا نفس ہے تو دنیائے معجزات تری دسترس میں ہے
اک سرزمین علم ہے مغرب کی ہر زمیں ''آبِ حیات'' آج فقط تیرے بس میں ہے

لیکن وہ زندگی، جو مری زندگی بھی تھی — اُس کو بچا سکی نہ مسیحائی بھی تری
سائنس کے تمام کرشموں کے باوجود — دیکھی ہے اپنی آنکھ سے پسپائی بھی تری
میری دعائیں بھی نہ کسی کام آسکیں — یہ اعتقاد بھی فقط اک اعتقاد تھا
در پردہ اور ہی ہے کوئی ناخدائے وقت — بختِ رسا بھی میرا بہت کم سواد تھا
موت آئی اور لے گئی سب کچھ سمیٹ کر — میں دیکھتا ہی رہ گیا پتھر بنا ہوا
میرا تھا کیا قصور جو یہ دی گئی سزا — کیوں ڈھا دیا خدا نے مرا گھر، بنا ہوا
کہنے کو سقف و بام بھی دیوار و در بھی ہیں — لیکن جسے مکان کہیں، وہ مکاں نہیں
ایسے میں زندگی کا تصوّر کروں تو کیا — اب وہ مری زمین نہیں آسماں نہیں
تادور، اک خلاء ہے، اندھیرا نہ روشنی — ٹھہرا ہوا ہے وقت، نہ دن ہے نہ رات ہے
اک چہرہ غم میں ڈوبا ہوا، روبرو، خموش — اک قبر کا نشان، متاعِ حیات ہے
میں اپنے دل کا حال بیاں کس طرح کروں — آنکھوں سے اشک، لفظ سے معنی بچھڑ گئے
سب مجھ کو دیکھیں اور میں ''پکرنگ'' کی طرف — دوگز زمیں میں میرے سبھی خواب گڑ گئے
معراج تیری قبر کی مٹی ہے میرے ساتھ — کیا جانے کب، کہاں مرا دل ساتھ چھوڑ دے
کیا جانے کب یہ خاک ملے میری خاک سے — کیا جانے کب یہ ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑ دے

پکرنگ ٹورنٹو (کینیڈا) کے ایک قبرستان کا نام ہے جہاں حمایت علی شاعر کی محبت محوِخواب ہے، جو ان کی رفیقۂ حیات کی آخری آرام گاہ ہے۔ (اس آخری آرام گاہ کی تصویریں میں دیکھ چکی ہوں۔ حدِنظر تک پھول ہی پھول ہیں اور یہ میں ذاتی طور پر جانتی ہوں کہ محترمہ کو پھول بے انتہا پسند تھے) اس نظم کی خاطر جب میں حمایت صاحب سے ملی اور دوسری نظمیں پڑھنے کی بھی خواہش ظاہر کی تو انھوں نے صرف اتنا کہا۔ ''کہاں تک پڑھو گی۔ پوری زندگی کا المیہ ہے یہ''۔ (لہجہ کا درد صرف سننے والا ہی محسوس کرسکتا تھا) میرے بے حد اصرار پر ایک نظم اور میرے حوالے کردی ''تاریخ وفات''۔

۲۱ر نومبر ۲۰۰۲ء

۲۱ر نومبر ہے وہ تاریخ کہ جس دن — دنیائے محبت مری برباد ہوئی تھی
آباد مجھے دیکھ کے تقدیر کے ہاتھوں — مجھ پر کسی بے درد کی بیداد ہوئی تھی

دنیا کے دہکتے ہوئے دوزخ سے بچانے — مائل بہ کرم جنتِ شدّاد ہوئی تھی

اس عمر اس شخص کو چھینا گیا مجھ سے — جو مجھ میں مری روح کی مانند مکیں تھا
جو اپنا جواب آپ تھا جو اپنی مثال آپ — اس جیسا تو کوئی بھی زمانے میں نہیں تھا
میں آئینہ اس کا تھا وہ آئینہ تھا میرا — میرے لیے قدرت کا وہ انعامِ حسیں تھا

''معراج'' وہ اک نام بلندی کی علامت — جس نام نے مجھ خاک نشیں کو کیا اعلیٰ
جو شمع کی مانند رہا مجھ میں فروزاں — جس نے مجھے مایوس اندھیروں سے نکالا
اک منزلِ بے نام کی جانب تھا رواں میں — نام اُس کا رکھا اس نے، محبت کا شوالہ

اے قادرِ مطلق، تجھے معلوم ہے سب کچھ — اس دہر میں کس کس طرح مرمر کے جیے ہم
اس ملکِ خداداد میں کیا دکھ نہ اٹھائے — جو تو نے دیے، ہم نے وہ ہنس ہنس کے سہے غم
تجھ سے بھی کبھی بھیک نہ مانگی گئی ہم سے — اونچا ہی رکھا ہم نے ترے نام کا پرچم

تو نے جو صلہ ہم کو دیا، یاد رہے گا — وہ قرب، یہ دوری، یہ کرم ہے کہ ستم ہے
میں بھی یہاں تنہا ہوں، وہ ''پکرنگ'' میں تنہا — اس کو بھی وہی غم ہے، یہاں، جو مجھے غم ہے
جو اس پہ گزرتی ہے تجھے علم ہے اس کا — تو دیکھ رہا ہے کہ مری آنکھ بھی نم ہے

حمایت صاحب نے اپنی شریکِ حیات کے انتقال پر بیس پچیس نظمیں کہی ہیں جو مختلف رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔ اور ان کی بیٹی جاوداں میر کی مرتب کردہ کتاب ''معراجِ نسیم'' (ہماری امی جان) میں خاندان کے مختلف افراد کے تاثرات کے ساتھ شامل کردی گئیں۔ اس کتاب میں بھابی معراج نسیم کے افسانوں کا انتخاب بھی ہے جو ۵۰ء سے ۵۵ء کے دوران ہند و پاک کے مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ حمایت صاحب نے جو نظم اپنے پھوپھی زاد بھائی قاضی شفیع (افسانہ نگار) کے والد کی وفات پر کہی تھی (۱۹۵۴ء میں) اس کا عنوان ہے ''دلاسہ''۔ میں بھی خلوصِ دل سے انھیں کے الفاظ میں انھیں دلاسہ دینا چاہتی ہوں۔

نہ رومیرے بھائی۔ یہ دنیا یہی ہے

یہ دنیا جہاں عرصۂ زندگی بھی   ہمارے لیے موت سے کم نہیں ہے
ہر اک پل میں اک عمر کا طول پنہاں   تمام عمر اک پل بھی ہم دم نہیں ہے
کلی کی چٹک سے گلوں کی پھبن تک   کوئی لمحۂ زیست محکم نہیں ہے
سحر کا تبسم ہو یا شب کی سج دھج   کہاں وقت کی آنکھ پرنم نہیں ہے

مرے دوست اس اشک پرور جہاں میں   ہمیں ہنس کے ہر اشک پینا پڑے گا
بہ ہر گام دامانِ دل چاک ہو گا   بہ ہر طور ہر چاک سینا پڑے گا
بہ ہر جرعہ زہر ہلاہل ملے گا   مگر ہم کو ہر جام پینا پڑے گا
بدل جائے جب تک نہ یہ نظم گیتی   ہمیں موت کی زد میں جینا پڑے گا

طویل تمثیلی نظمیں

حمایت علی شاعر کی ابتدائی شاعری کے باب میں مختلف محرکات شعری کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے عالمی سیاسی مسائل کی روشنی میں کوریا کی جنگ کا بھی ذکر کیا تھا۔ اس جنگ کا آغاز ۱۹۵۰ء میں ہوا تھا۔ ساری دنیا میں امن تحریک جاری تھی۔ پکاسو کی فاختہ عالمی امن کی علامت کے طور پر ہر پرچم پر اڑ رہی تھی۔ انھی دنوں حمایت صاحب نے ''کوریا'' کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھی تھی جو ایک جوشیلی نظم تھی۔ ان دنوں وہ نظم حمایت صاحب سے مشاعروں میں بہت سنی جاتی تھی۔[1] دراصل وہ دور ہی ایسی نظموں کا تھا۔ علی سردار جعفری کی نظمیں۔ ''امن کا ستارہ'' (مثنوی) ''جمہور اور ایشیا جاگ اٹھا''۔ کیفی اعظمی کی مثنوی ''خانہ جنگی'' مخدوم کی ''تلنگانہ'' نیاز حیدر کی ''سے بڑا گمبھیر''۔ پاکستان میں ظہیر کاشمیری کی نظم ''ایشیا'' اور اسی طرح کی دوسری نظمیں شدت سے لکھی جا رہی تھیں۔

حمایت صاحب ان دنوں انڈیا میں تھے۔ پاکستان سے بھی نہ صرف ظہیر کاشمیری بلکہ احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، احمد ریاض، ظہور نظر، جمیل ملک، فارغ بخاری، رضا ہمدانی اور احمد فراز کی ایسی

ہی نظمیں رسائل میں چھپتی تھیں اور سارا ہندوستان و پاکستان ایک ہی صف میں نظر آتا تھا۔ حیدرآباد دکن میں حمایت صاحب کے ساتھ سلیمان اریب، قمر ساحری اور عزیز قیسی بھی جوش و خروش سے بھرپور نظمیں لکھتے تھے اور مشاعروں میں ان تمام شعرا کو بہت ذوق وشوق سے سنا جاتا تھا۔ میں یہ بات پہلے کہیں تحریر کر چکی ہوں کہ یہ نظم حیدرآباد دکن کے رسالے ''آدمیت'' میں چھپ چکی تھی لیکن حمایت صاحب کی کسی کتاب میں ہے نہ کسی بیاض میں۔ لیکن چوں کہ یہ ان کی پہلی طویل نظم تھی اس لیے اس کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھا۔ اس کے کچھ اشعار جو مجھے حمایت صاحب نے سنائے لکھ رہی ہوں تا کہ اُن کے (اُس وقت کے) اندازِ نگارش کا اندازہ ہو جائے۔

جو بازو سوکھ کر کانٹا ہوئے تھے، اب ہیں تلواریں   جو سینے کھوکھلے تھے، آج ہیں لوہے کی دیواریں
برہنہ پاؤں کی ٹھوکر میں ہیں زورتار دستاریں   نہ ہوگا بال بھی بیکا، نہ بچے لاکھ سر ماریں

☆

جو تم بڑھتے ہو آگے، دل ہمارے بڑھتے جاتے ہیں   ہمارے دل میں بھی جذبات پیچ وتاب کھاتے ہیں
تمھاری طرح لو ہم بھی قدم آگے بڑھاتے ہیں   تم اس جانب سے آؤ، ہم تلنگانے سے آتے ہیں

(یہ نظم پچاس ساٹھ اشعار پر مشتمل تھی)

حمایت صاحب غالباً مئی یا جون ۱۹۵۱ء میں پاکستان آئے اور یہاں آ کر انھوں نے دو طویل نظمیں لکھیں۔ ایک ''شعلۂ بے دود'' جو ۱۹۵۲ء میں ''ادبِ لطیف'' (لاہور) کے جولائی کے شمارے میں شائع ہوئی تھی اور ''بنگال سے کوریا تک'' جو عالمی جنگ کے خلاف ایک طویل افسانوی نظم تھی۔

''شعلۂ بے دود'' ایک افسانے کے انداز میں لکھی گئی تھی۔ متوسط طبقے کا ایک کردار واحد متکلم کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے اور وہ اپنے طبقے کی نفسیات کی روشنی میں اپنے عشق، اپنے خواب اور اپنے تصورات بیان کرتا ہے۔ اس کی زندگی میں دو لڑکیاں داخل ہوتی ہیں ایک اسی کی طرح غریب متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی اور دوسری امیر زادی۔ جو وقت گزاری کے لیے کہانی کے ہیرو میں دل چسپی لیتی ہے کچھ عرصہ ساتھ رہتی ہے اور پھر اپنے طبقے کے کسی امیر زادے سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ غریب نوجوان اس عرصے میں جو خواب دیکھتا ہے یا خوابوں میں جو محل تعمیر کرتا ہے اور اس امیر زادی کے جگمگاتے حسن سے متاثر ہو کر جن رنگا رنگ تصورات میں کھویا کھویا رہتا

ہے وہ مناظر دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اس کا سراپا جس انداز میں میں کھینچتا ہے وہ بھی دیدنی ہے اور در پردہ جو حسرتیں اور آرزوئیں اس کے دل میں پیدا ہوتی ہیں ان کی تصویر ان اشعار میں دیکھی جا سکتی ہے:

میری مسجود اک بتِ طناز — زرگرِ وقت کا نیا شہکار
جس کے قدموں میں مہر و ماہ و نجوم — جس کے پیکر میں بس گئی تھی بہار

زلف جس طرح میکدے کی شام — ہونٹ لالے کی ادھ کھلی کلیاں
روپ جس طرح چودھویں کا چاند — سر سے پا تک حیات کا عنواں
خلوتوں کی خموش گفتاری — جلوہ گاہوں کے راز کی غماز
حرمِ خاص میں کھنکتے جام — ناچتے گاتے میکدوں میں نماز

میری نظروں کے عکس زادوں میں — ایک جنت، خرام فرما تھی
کعبۂ دل میں خُم بدوش کوئی — دخترِ زر قیام فرما تھی
دخترِ زر کہ جس کے ہونٹوں پر — روپیوں کی کھنک بکھرتی ہوئی
دخترِ زر کہ جس کی آنکھوں میں — روپیوں کی چمک نکھرتی ہوئی

میرے خوابوں میں کب سے رقص کناں — میرے مسجود کی جوانی تھی
بھاؤ چڑھتے اترتے جاتے تھے — جرأت اک اور آزمانی تھی

یہ نظم ہمارے معاشرے کے اس انداز فکر کی ترجمان ہے جو متوسط طبقے میں عموماً پایا جاتا ہے۔ اس طبقے کے لوگ عام طور پر اوپر کے طبقے میں جانے کی آرزو رکھتے ہیں ان کی یہ دلی خواہش ہوتی ہے کہ کسی طرح اوپر کے طبقے میں پہنچ جائیں۔ وہ اگر اس طبقے سے وابستہ نہ بھی ہو سکیں تو اپنے آپ کو اس طبقے کا ایک فرد باور کراتے ہیں۔ جائز طریقے سے راتوں رات امیر ہونا تو ممکن نہیں، سوائے اس کے کہ کوئی امیر زادی ان سے عشق کر بیٹھے جو بہت کم ہوتا ہے ایسی باتیں صرف کہانیوں اور داستانوں میں نظر آتی ہیں، ان کے لکھنے والے بھی چوں کہ متوسط طبقے کے ہوتے ہیں اس لیے وہی

لوگ ایسی کہانیاں لکھ کر اپنی حسرت پوری کر لیتے ہیں۔ ''شعلۂ بے دود'' میں بھی کہانی کچھ ایسے ہی تصورات کی نمائندگی کرتی ہے، پھر جب یہ تصورات ٹوٹتے ہیں اور حقیقت سامنے آتی ہے تو وقت ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ کہانی کے کردار کو اپنی ناکامی کا احساس ہوتا ہے اور یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اس نے کیا کھویا اور کیا پایا۔۔۔

مجھ کو معلوم کیا کہ تاج محل — کس کے اشکوں میں ڈوب کر ابھرا
کس امارت نے کس غریبی کے — دل سے سارا لہو نچوڑ لیا
ایک غربت گزیدہ مستِ شباب — خامشی سے نگاہ موڑ گئی
اس نے مجھ سے کہا تو کچھ بھی نہیں — اک تبسم لبوں پہ چھوڑ گئی

وہ تبسم کہ جس کی زندہ لاش — دفن کر دی تھی میں نے ہونٹوں میں
وہ تبسم کہ ہو گیا تحلیل ..... — زرگری کے طفیل اشکوں میں

یہاں حمایت صاحب نے جو تجزیہ کیا ہے وہ قابل مطالعہ ہے۔

اشک، دل کے مزار کی شمعیں — اشک، طغیانیوں کا ساکت جوش
اشک، تابوت مسکراہٹ کے — دوشِ مژگاں پہ منجمد خاموش

اشک، جن کی چمک پہ سکّوں کی — تابناکی نے دھند برسا دی
اشک، جن کے خنک شراروں نے — میری رگ رگ میں آگ دوڑا دی

تقریباً سو اشعار پر مشتمل یہ نظم مختلف نشیب و فراز سے گزر کر جب اپنے نقطۂ عروج پر پہنچتی ہے تو ایک کربناک تشنگی چھوڑ جاتی ہے۔ جو اس کہانی کا حرف اختتام ضرور ہے مگر اسے معاشرے میں ایک انقلاب کا حرف آغاز بھی کہا جا سکتا ہے۔

وہ چلی تو گئی مگر اب تک — آہٹ آہٹ پہ دل دھڑکتا ہے
بجھ گئی انتظار کی ہر شمع — دل میں ایک شعلہ سا بھڑکتا ہے

حمایت علی شاعر کا تعلق بھی ایک متوسط طبقے سے ہے۔ میں نہیں جانتی کہ اس کہانی کا ان کی زندگی سے بھی کوئی تعلق ہے یا نہیں جب انھوں نے یہ افسانوی نظم لکھی وہ شادی شدہ تھے اور مجھے معلوم

ہے کہ یہ شادی انھوں نے اپنے خاندان کی مخالفت کے باوجود کی تھی گویا انھوں نے اپنی پسند کی شادی کی تھی۔ اس لیے ہم ''واحد متکلم'' میں ہونے کے باوجود اس کہانی کو ان کی ''آپ بیتی'' سے متعلق نہیں کر سکتے۔

وہ ایک باشعور شاعر ہیں۔ ان کی نظر نہ صرف اپنے طبقے پر ہے بلکہ وہ اپنے اطراف ان تمام حقیقتوں کو بھی دیکھتے رہتے ہیں جن میں ایسی کہانیاں جنم لیتی رہی ہیں۔ ''بنگال سے کوریا تک'' بھی ایک ایسی ہی آپ بیتی ہے۔ حمایت صاحب نے اس نظم کے بارے میں ایک نوٹ بھی لکھا ہے۔

''یہ کہانی آپ بیتی نہیں لیکن آپ بیتی ہو سکتی ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ''میں بھی'' ہو سکتا ہوں اور ''آپ بھی''۔ کیوں کہ گزشتہ عالم گیر جنگ میں بنگال جنگ سے دور رہ کر بھی لاکھوں انسانوں کا مدفن بن گیا اور کوریا تازہ ہیروشیما ہے اور یہ ہیروشیما جتنی تیزی سے پھیلتا جائے گا بنگال کی وسعتوں میں بھی اسی سرعت سے اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس پس منظر کی روشنی میں اس کہانی کا مرکزی کردار انفرادی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اجتماعی کردار بھی ہے اور آج نئی عالم گیر جنگ کا ہولناک اندیشہ، دنیا کے ہر انسان کے دل میں ایک سوالیہ علامت بن گیا ہے۔ ''کیا ہماری نئی نسل بھی جنگ کا ایندھن بن جائے گی؟''

اس نوٹ کی ایک تاریخی اہمیت بھی ہے اس زمانے میں کوریا کی جنگ کے خلاف ساری دنیا میں امن تحریک بھی چل رہی تھی۔ جنگ کے خلاف ایک عالم گیر دستخطی مہم بھی شروع کی گئی تھی میں نے حمایت صاحب کی لائبریری میں حیدرآباد دکن کے ہفتہ وار ''پرواز'' کی ایک فائل دیکھی جس کے ۱۸ر نومبر ۱۹۵۰ء کے شمارے میں حمایت صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا تھا ''میں امن چاہتا ہوں''۔ اس مضمون میں انھوں نے بڑی خوبصورتی سے اپنی امن کی خواہش کا جواز پیش کیا ہے، وہ اس وقت اپنی ننھی بچی ''جاوداں'' کے ساتھ گھر کے سامنے دوسرے ننھے ننھے بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''میں بچوں کی ایک ایسی محفل میں بیٹھا ہوں جہاں دھرتی کے سینے پر پھیلی ہوئی ہری ہری دوب ہے۔ قریب و دور جھومتے ہوئے چھوٹے چھوٹے پودے ہیں اور رنگ برنگے پھول اور ہنستے ہوئے بچے ہیں۔ میری گود میں بیٹھی ہوئی جاوداں ہنس رہی ہے۔ کلکاریاں مار رہی ہے۔ ایسے وقت آپ کا یہ سوال کہ میں امن چاہتا ہوں یا جنگ؟ یہ مسکراتے ہوئے پھول، اڑتی ہوئی تتلیاں،

ننھے منے مرمرین قدموں تلے بچھا ہوا مخملیں قالین، قالین پر رینگتا، بھاگتا ہوا یہ ربر کا گولا، دوڑتا ہوا ارتقاء، مسکراتا ہوا مستقبل، ہنستی ہوئی زندگی اور یہ جاوداں، نہ جانے اس کی چیخوں سے میرا دل کانپ کیوں جاتا ہے۔ اس شور و غوغا میں مجھے بم کے دھماکوں کی آواز ڈوبتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ میری بچی کی مسلسل ''نا..... نا'' جنگ کے خلاف آواز بلند کرتی نظر آ رہی ہے۔''

یہ تو ایک شاعر کا انداز بیان تھا ایک شاعرانہ نثر میں۔ لیکن انھوں نے اس دور میں جو بھی لکھا جنگ کے خلاف ہی لکھا۔ ۱۹۵۱ء کے آغاز میں جب وہ بمبئی بسلسلۂ روزگار گئے ہوئے تھے انھیں ساحر لدھیانوی کی معرفت ایک فلم ''اسٹیج'' کے لیے ایک گانا لکھنے کا چانس ملا تھا۔ اس وقت عہد حاضر کے مقبول میوزک ڈائریکٹر انو ملک کے والد سر ملک، موسیقار حسن لال بھگت رام کے اسسٹنٹ تھے، ساحر صاحب کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ جو بمبئی کے ایک محلے اندھیری میں کرشن چندر کے بنگلے کے اوپری حصے میں مقیم تھے حمایت صاحب اور مسلم ضیائی بھی وہیں ٹھہرے ہوئے تھے۔ انھی دنوں انھیں ''اپٹا'' (IPTA انڈین پیپلز تھیٹر ز ایسوسی ایشن) میں ایک اور کام مل گیا۔ اپٹا سے ان دنوں حیدرآباد ریڈیو کی ایک آرٹسٹ اوشا بھی وابستہ تھیں وہ جنگ کے خلاف ایک پروگرام اسٹیج کرنا چاہتی تھیں۔ حمایت صاحب ان کے پرانے ساتھی تھے۔ ان کے مشورے سے ایک سیاسی بھجن اسٹیج کرنے کا پروگرام بنایا گیا بھجن لکھنے کا فرض حمایت صاحب نے سنبھالا، دھن اپٹا کے موسیقار اور شاعر پریم دھون نے بنائی اور اوشا نے اسے اسٹیج کیا۔ بھجن کے مکھڑے کے بول تھے۔

ڈالر دیس کے راجہ۔ او سب راجوں کے رکھوالے
کٹھن گھڑی ہے ہم بھگتوں پر، آ کر ہمیں بچالے
او سب راجوں کے رکھوالے

اس بھجن کی تفصیل میں پہلے لکھ چکی ہوں۔

یہ بھجن ان کے پہلے مجموعۂ کلام ''آگ میں پھول'' کے دوسرے ایڈیشن میں شامل ہے جس کے ساتھ اپٹا میں اسٹیج کیے جانے کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ حمایت علی شاعر نے اپنی منظوم خودنوشت سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

پاکستان آ کر بھی حمایت صاحب خاموش نہیں بیٹھے جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ انھوں نے ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۳ء کے دوران یہ طویل افسانوی نظم ''بنگال سے کوریا تک'' لکھی تھی۔ اس کے

مختلف حصے کراچی کے مختلف رسائل میں چھپتے رہتے سب سے پہلے اردو کالج کے میگزین ''برگ گل'' کے شمارے (۵۲،۵۳ء) میں اس کا دوسرا حصہ ''تصور'' کے عنوان سے چھپا۔ اس وقت ابن انشاء اور اے آر ممتاز بحیثیت اسٹوڈنٹ اس رسالے کے مدیر تھے۔ پھر اس کے دو حصے ''مشرب'' (ایڈیٹر اختر انصاری اکبر آبادی) کے مئی ۵۳ء کے شمارے میں شائع ہوئے۔ بعد ازاں انھیں حصوں کو پروفیسر ممتاز حسین نے اپنے ادبی ڈائجسٹ ''روح ادب'' (۵۳ء) میں منتخب کیا۔ پھر ڈاکٹر جمیل جالبی کے رسالے ''نیا دور'' (۳-۴) میں اس کی دو قسطیں چھپیں (اس وقت جمیل جالبی صاحب انکم ٹیکس افسر تھے، اس لیے رسالے میں بحیثیت مدیر اپنا نام نہیں دیتے تھے) پروفیسر ممتاز حسین ایک اور رسالے ''سیارہ'' کے بھی مدیر تھے۔ انھوں نے ''بنگال سے کوریا تک'' کا ایک حصہ ''سیارہ'' کے ستمبر ۵۳ء میں بھی شائع کیا تھا۔ اس کے بعد بھی مختلف رسائل میں یہ نظم قسط وار چھپتی رہی۔ پوری نظم ماہ نامہ ''شاہراہ'' (دہلی) کے سال نامے (ضمیمہ) مارچ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت واثق جونپوری اس کے ایڈیٹر تھے۔

پاکستان میں پوری نظم پہلی بار ۱۹۵۶ء میں حمایت صاحب کے پہلے مجموعۂ کلام ''آگ میں پھول'' میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کی اشاعت سے پہلے ساحر لدھیانوی کی نظم ''پرچھائیاں'' نومبر ۵۵ء میں شائع ہو چکی تھی (کتاب میں ساحر صاحب کے پیش لفظ پر ۱۲ر نومبر ۱۹۵۵ء اور علی سردار جعفری کے دیباچے پر ۲۳ر نومبر ۱۹۵۵ء درج ہے) چناں چہ حمایت صاحب کے کچھ ''کرم فرما'' جو ہمیشہ کسی نہ کسی عنوان سے انھیں بدنام کرنے کی اور ان کی شہرت کو نقصان پہنچانے کی کوشش میں مصروف رہتے تھے، ان کی اس نظم کو ''پرچھائیاں'' سے منسوب کرنے لگے۔ ان میں جو لوگ پیش پیش تھے ان میں ایک شمیم احمد (سلیم احمد کے بھائی) تھے اور دوسرے محسن بھوپالی۔ ان حضرات کی اچھالی ہوئی دُھول اس وقت صاف ہوئی جب حمایت صاحب نے اپنی نظم کی اشاعتی تاریخوں کی تفصیل اہل ادب کے سامنے پیش کر دی۔

''بنگال سے کوریا تک'' ہندوستان میں بھی شائع ہوئی۔ سلیمان اریب نے پوری نظم، ساہتیہ اکیڈمی (اتر پردیش) کے زیر اہتمام چھپنے والی کتاب ''حیدر آباد کے شاعر'' (حصہ دوم) میں حمایت صاحب کے بارے میں ایک نوٹ کے ساتھ شائع کی۔ بعد ازاں ان کے سندھی، ہندی اور انگریزی تراجم بھی چھپتے رہے۔

میں نے اپنی کتاب ''بارش سنگ سے بارش گل تک'' کے دیباچے میں دونوں نظموں (بنگال سے کوریا تک اور پرچھائیاں) کے موضوع اور مماثلت کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کا اقتباس پیش کرتی ہوں۔

''دونوں نظموں کا موضوع ایک تھا یعنی جنگ کے خلاف عالمی امن کی آرزو۔ اتفاق سے دونوں کی تکنیک بھی ایک تھی یعنی FLASH BACK جو اردو شاعری میں عرصہ ہوا۔ پہلی بار محترم احسان دانش نے اختیار کی تھی۔ ان کی بہت ہی مشہور اور مقبول نظم ''بیتے ہوئے دن'' اسی تکنیک میں ہے جس کا ٹیپ کا مصرعہ تھا۔

''بیتے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں تنہائی جنھیں دہراتی ہے''

ساحر صاحب نے ''پرچھائیاں'' مختلف بحروں میں لکھی ہے۔ جن میں ایک بحر وہی تھی جس میں احسان دانش صاحب نے اپنی نظم لکھی تھی۔ (ممکن ہے ساحر صاحب کے تحت الشعور میں وہی نظم رہی ہو ویسے ان کا تعلق فلم سے بھی تھا فلموں میں یہ تکنیک اکثر استعمال ہوتی ہے) حمایت صاحب کا تعلق بھی ریڈیو اور فلم سے رہا ہے ان کی پوری نظم ایک ہی بحر میں ہے اور جیسا کہ اشاعتی تاریخوں سے ظاہر ہے کہ یہ نظم ساحر صاحب کی نظم سے تین سال پہلے پاکستان میں لکھی گئی تھی۔ دونوں نظموں میں کہانی بھی مختلف تھی اور اس کا پس منظر بھی، حمایت صاحب کی نظم ایک تاریخی پس منظر رکھتی ہے جب کہ ساحر صاحب نے ایک ''رومانی افسانہ'' لکھا تھا، کچھ باتیں مزید وضاحت کے لیے بیان کرنا چاہتی ہوں۔

ساحر صاحب نے مختلف بحروں میں جو اشعار ہیں ان میں ایک مصرعہ ''چودہ بار'' استعمال کیا ہے۔

''تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں''

اس بحر میں (۵۲) اشعار ہیں۔

''وہ لمحے کتنے دلکش تھے، وہ گھڑیاں کتنی پیاری تھیں''

اس بحر میں (۲۳) اشعار ہیں پھر اس بحر میں نصف مصرعہ اضافی استعمال کر کے انھوں نے ڈھائی مصرعوں کے سات (۷) بند اور لکھے ہیں۔

تم آج ہزاروں میل یہاں سے دور کہیں تنہائی میں
یا بزم طرب آرائی میں

میرے سپنے بنتی ہوگی بیٹھی آغوش پرائی میں

اس طرح یہ نظم جملہ (۸۲) اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے برعکس حمایت علی شاعر کی نظم (۱۲) حصوں پر مشتمل ہے ہر حصے میں (۲۱) اشعار ہیں اور ایک ٹیپ کا بند ہے جو ہر حصے کے نقطۂ آغاز کے طور پر آتا ہے۔

آئینہ خانۂ تصور میں ایک اک نقش ابھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھرتھراتے ہی آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

اس طرح یہ نظم (۲۵۴) اشعار پر مشتمل ہے

نامناسب نہیں ہوگا اگر ان دونوں نظموں کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے بھی پیش کر دوں۔[۱] ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

''طویل نظموں میں ''بنگال سے کوریا تک'' نہایت خوب صورت نظم ہے۔ اتفاق دیکھیے کہ پچھلے دنوں بالکل اسی موضوع پر ساحر لدھیانوی نے بھی ایک طویل نظم لکھی ہے ''پرچھائیاں''۔ لیکن میری رائے میں آپ کی نظم ''پرچھائیاں'' سے کہیں بہتر ہے۔ ''پرچھائیاں'' میں ایک تو ساحر صاحب نے میٹر کو بار بار بدلا ہے جس سے نظم کی روانی کو صدمہ پہنچتا ہے۔ آپ کی نظم میں یہ نقص موجود نہیں ہے۔ دوسرے ساحر نے جو کہانی پیش کی ہے وہ نہ صرف بے حد معمولی ہے بلکہ بے ربط بھی ہے اور آخر میں اس نے وعظ کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ آپ کی کہانی میں لوچ ہے ایک نقطۂ عروج ہے اور پھر زندگی کے مخصوص ''انداز'' کو طشت از بام کیا گیا ہے۔ اس نظم میں ''بچی'' کا کردار ''امید'' کے معنوں میں آیا ہے جو موجودہ خلفشار تخریب اور بربریت کے زمانے میں انسان کا واحد سہارا ہے۔ نظم کا یہ مثبت پہلو بڑے فطری انداز میں ابھرا ہے اور یہی اس نظم کا سب سے بڑا وصف ہے۔ پھر آپ نے ساحر کی طرح اپنے افکار کو قاری پر ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی بلکہ صرف اپنی کہانی سنائی ہے اور اس طرح قاری کی ہمدردی حاصل کی ہے میں آپ کی اس نظم سے متاثر ہوا ہوں۔ مبارک باد قبول فرمائیے۔''

''بنگال سے کوریا تک'' کے بارہ حصوں کے عنوانات یہ ہیں۔

۱۔ یادوں کے غبار، ۲۔ ایک مسرت ایک موت، ۳۔ غم حاصل، ۴۔ وداع، ۵۔ جنگ کے میدان میں، ۶۔ آگ میں پھول، ۷۔ جب شعلے بجھ گئے، ۸۔ اپنا وطن، ۹۔ اپنا گھر، ۱۰۔ حاصلِ غم،

۱۱۔ دوسری زندگی، ۱۲۔ دوسری مسرت۔

ان بارہ عنوانات سے کہانی کا ایک خاکہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ ایک نسل سے دوسری نسل تک زندگی کا ایک تسلسل ہے جو اپنے مسائل کے ساتھ رواں دواں ہے۔ پس منظر میں اپنا وطن، اپنے لوگ، اپنے رشتے ناطے، ان کی محبت، ان کے غم اور پھر قوم و ملک کے ساتھ ان کی اپنی تباہی، انتشار، غربت، قحط۔ بقول شاعر:

میرے نیگور کی زمیں پر آج
لاشوں ڈھانچوں کا بس گیا تھا جہاں
اس قدر تھا کریہہ ہر منظر
جیسے قے کر چکا ہو قبرستان

اور پھر سوالات؟

سوچتا تھا کہ میری غربت نے
اپنا سب کچھ لٹا کے کیا پایا
ایک خوش حال زندگی کے لیے
جنگ کے کام آ کے کیا پایا

یہ دوسری عالم گیر جنگ (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) کا حاصل تھا۔ کوریا کی جنگ تیسری عالم گیر جنگ کا پیش خیمہ سمجھی جا رہی تھی اور ساری دنیا اسی لیے لرزہ براندام تھی۔۔۔ حمایت صاحب لکھتے ہیں:

آج پھر کچھ خدائے دولتِ ارض
نقش ہستی مٹائے جاتے ہیں
نت نئے کوریا، نت نئے بنگال
سولیوں پر چڑھائے جاتے ہیں

اور پھر نئی نسل کے لیے سوچ کا ایک زاویہ یہ بھی نمایاں ہوا تھا:

کوئی سوچے، عروس فطرت کیوں
شام سے تابہ صبح روتی ہے

ایک سورج کی موت میں مضمر
کتنی کرنوں کی موت ہوتی ہے

یہ بند اس نظم کا حرفِ آخر ہے۔

''بنگال سے کوریا تک'' کی کہانی ایک فرد کی زندگی سے شروع ہوتی ہے اور ایک خاندان کا المیہ بن جاتی ہے۔ ''ایک خاندان'' ایک ملک اور ایک قوم کا حصہ ہوتا ہے۔ ایک کی تباہی سے دوسرے کی تباہی عبارت ہوتی ہے۔ جنگ افراد کو پہچانتی ہے نہ قوموں کو شہروں کو پہچانتی ہے نہ ملکوں کو۔ جنگ کی زد میں جو آبادیاں آجاتی ہیں وہ بھی اجڑ جاتی ہیں اور جو آبادیاں بظاہر دور ہوتی ہے وہ بھی جنگ کا ایندھن بن جاتی ہیں۔ حمایت علی شاعر نے جنگ اور امن کے تعلق سے برسوں جو سوچا وہ سب لکھ دیا۔ (اخباری کالموں اور مضامین کی شکل میں یا نظموں، گیتوں اور بھجن کی شکل میں) جس ماحول میں وہ زندگی بسر کر رہے تھے وہ زندگی اپنے گرد و پیش کا آئینہ بھی انھیں دکھا رہی تھی۔ ساری دنیا میں چلنے والی امن تحریک انھیں جنگ کے خلاف اکساتی رہی۔ پاکستان آکر بھی وہ ذہنی طور پر اسی فکر سے بندھے رہے وہی جذبات و احساسات انھیں اپنے دائرے میں لیے رہے آخر وہ اس نظم کے لکھنے میں کامیاب ہوگئے۔

اس نظم میں بچی کے کردار نے جو مثبت تاثر چھوڑا ہے میں سوچتی ہوں اس کا تعلق شعوری یا لاشعوری طور پر حمایت صاحب کی اس بچی سے کتنا ہے جو ۱۹۵۰ء میں ان کی گود میں کلکاریاں بھر رہی تھی۔ جو ''نا۔نا'' کہہ کر جنگ کے خلاف اپنے انداز میں آواز بلند کر رہی تھی۔ اس وقت تک تو حمایت صاحب نے اس نظم کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اس وقت تو انھوں نے صرف ایک اخباری مضمون لکھا تھا۔ ''میں امن چاہتا ہوں''۔ ''کوریا'' ان کی اوّلین طویل نظم ایک جوشیلی نظم تھی اس میں کوئی افسانہ تھا نہ کوئی کردار۔

اس لیے اس نظم کو ''بنگال سے کوریا تک'' کا محرک نہیں کہا جاسکتا۔ اس کی محرک وہی بچی ہے یا پھر اپنا بچپن میں اوشا کا اسٹیج کیا ہوا وہ ''بھجن'' جس کے بول بچے بچے کو یاد ہو گئے تھے۔ اس بات کی تصدیق حمایت صاحب کے اس مضمون سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے کے بعد ۱۹۷۱ء میں لکھا تھا جب ہماری (۹۳) ترانوے ہزار فوج ہندوستان کی قید میں تھی۔ اس مضمون کا عنوان تھا ''میرا پیغام محبت ہے'' (مطبوعہ ''دھنک'' لاہور ۱۹۷۲ء) اس مضمون میں

بھی انھوں نے ۵۰ء اور ۵۱ء میں چلنے والی امن تحریک کی دستخطی مہم کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔ ''مجھے یاد ہے، میری یہ بیٹی جوان دنوں ایک ننھی سی گڑیا جیسی تھی جسے پا کر میں پہلی بار اس احساس سے آشنا ہوا تھا جو روزِ ازل انسان کی تخلیق پر خدا نے محسوس کیا ہوگا یا آدم نے حوا کی گود ہری دیکھ کر محسوس کیا ہوگا۔ ایک اجنبی سا احساس مسرت ایک لطیف سا احساسِ فخر۔ میں جب بھی اپنی بچی کو گود میں لیتا، ایک ایسی ہی انجانی کیفیت مجھ پر طاری ہو جاتی اور پکاسو کی فاختہ کے پروں کے سائے میں مجھے ایک اطمینان کا احساس ہوتا اور میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کے دستخط حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہو جاتا۔ پھر ایک روز یوں ہوا کہ میری ننھی سی بٹیا نے اس کاغذ پر چند لکیریں کھینچ دیں۔ بیوی نے ہنس کر کہا۔ ''لیجیے! آپ کی بیٹی نے بھی دستخط کر دیئے۔'' اور جب یہ بات ادیبوں تک پہنچی تو سب نے اسے نئی نسل کی طرف سے ''امن کی دستاویز'' سے تعبیر کیا اور کرشن چندر نے اس کے نیچے لکھ دیا۔ ''امن کی فاختہ''۔

اور سردار جعفری نے لکھا۔ ''نئی دنیا کو سلام''۔ وشوا شر عادل نے لکھا۔ ''ایشیا جاگ اٹھا''۔ اور میری آنکھوں سے خوشی کے چند آنسو نکل کر ان آڑھی ترچھی لکیروں پر پھیل گئے، کوریا کے لیے بمبئی کی گلیوں میں آنسو، انسان سے انسان کی اس لازوال محبت کی علامت تھے جو دل کی دھڑکنوں میں جنم لیتی ہے اور اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک اس دھرتی پر انسان کا نقشِ قدم موجود ہے۔''

''بنگال سے کوریا تک میں'' (جنگ ختم ہونے کے بعد) جب ایک دوسرے انداز کی ''جنگ'' پوری زندگی پر مسلط ہو جاتی ہے۔ حمایت صاحب نے کس انداز میں اس کا جائزہ لیا ہے۔ قابلِ مطالعہ ہے۔

زندگی کے ہر ایک گوشے میں
ایک ایک چیز کاروباری تھی
کھیت کے کھیت تھے گھروں میں دفن
اور بھوکی خدائی ساری تھی
دیر تا کعبہ، کوئی دوکاں ہو
ہر طرف زر کی شہریاری تھی
ہر تجوری میں قبر کے مانند

موت کی جوئے فیض جاری تھی
جنگ تو ختم ہو چکی تھی مگر
جنگ ایک ایک گھر میں جاری تھی

اس ماحول میں یہ بچی بھی اپنا کردار ادا کرتی نظر آتی ہے۔

تنگ آ کر نہ جانے کتنی بار
دل نے سانسوں کا ساتھ چھوڑ دیا
لیکن اکثر میرے عزائم کو
ایک بچی نے ہنس کے توڑ دیا

ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا تھا۔ ''بچی امید کی علامت ہے''۔ حمایت صاحب نے اس کی صداقت کا ثبوت یوں دیا ہے۔

کیسے کیسے نہ خوں کے طوفاں میں
زندگی ڈوب کر ابھر آئی
ایک بچی کے واسطے یہ لاش
ہر کڑے دور سے گزر آئی

کسی نظم کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو اس کے محرکات پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ شاعر کے انداز فکر اور اس کی نفسیات بھی مطالعے کا حصہ ہوتی ہے۔ جس طرح ہمارے بچوں میں ہماری خصوصیات خون کے ذریعے در آتی ہیں اسی طرح ادبی تخلیقات میں بھی شاعر یا ادیب کی نفسیات اس کا طرزِ فکر اور اس کی شخصیت کسی نہ کسی طرح موجود ہوتی ہے۔ حمایت علی شاعر کے لاشعور میں ان کا بچپن محفوظ نظر آتا ہے۔ فرائڈ کے نقطۂ نظر سے سارے شعوری اقدامات کا محرک انسان کا لاشعور ہی ہوتا ہے۔ بچپن کے اثرات زندگی بھر ساتھ رہتے ہیں، حمایت صاحب کی اکثر نظموں میں بچے ضرور شامل ہو جاتے ہیں۔

حمایت صاحب کی ایک اور طویل نظم ہے ''حرف حرف روشنی''، یہ نظم بھی انھوں نے اپنے بچوں کی وساطت سے پاکستان کی اس نسل کے لیے کہی ہے جن کے والدین ترکِ وطن کر کے یہاں آباد ہو گئے، بظاہر یہ موضوع ایسا نہیں کہ اس پر ایک طویل نظم لکھی جائے۔ کیوں کہ پاکستان میں

''تارکینِ وطن'' ہیں ہی کتنے بمشکل ایک کروڑ ہوں گے جو رفتہ رفتہ اس کرب سے آزاد ہوتے جا رہے ہیں جو ایک زمین، ایک تاریخ اور ایک تہذیب کے چھوڑنے کے دکھ سے تعلق رکھتا ہے۔ ہندوستان سے ان کی رشتہ داریاں بھی روز بروز محدود ہوتی جا رہی ہیں۔ ایک ہی باپ کی اولاد میں اب رشتوں کی وہ نوعیت نہیں رہی جو اب سے پچاس سال پہلے تھی۔ نسل در نسل وقت کی چھلنی میں ہر چیز اب چھنتی جا رہی ہے اور اپنوں کے درمیان رفتہ رفتہ ایک اجنبیت کی فضا بھی ہموار ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن نئی نسل کے لیے سب سے اہم مسئلہ اپنی تاریخ کے تسلسل سے نکل کر مقامی تاریخ سے رشتہ جوڑنے کا ہے۔ ''لاشعور'' پر شعور کا قابو پانا اور وقت کی رفتار سے مطابقت پیدا کرنا ایک مشکل ترین عمل ہے اس عمل میں کئی نازک مقامات حارج ہوتے ہیں۔ حمایت صاحب نے تاریخی تجزیے کے ساتھ نئی نسل کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

مرے لہو کے چراغو میرے جگر پارو
سنو یہ مری نصیحت یہی ہے وصیت بھی
میں آج تم میں ہوں موجود کل نہیں ہوں گا
مگر جو تم ہو تو میں ہوں سدا سلامت بھی
تم اپنا نقطۂ آغاز ہی سہی لیکن
تمھارے ساتھ رواں مری روایت بھی
میں اپنے ماضی مرحوم کی امانت تھا
سو آج تم سے ہے منسوب یہ امانت بھی

پھر وہ اپنی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہیں۔

دروغ و مکر کا انبار ہے مری تاریخ
برائے نام خدا ہے، برائے نام ہے دیں
خدا و دیں کی گنہگار ہے مری تاریخ
نہ آدمی کی حقیقت نہ زندگی کا سراغ
فقط قصیدۂ دربار ہے مری تاریخ

☆☆

ہر ایک ذرہ ہے اپنے لہو میں ڈوبا ہوا
حنا سے اپنی ہتھیلی سجا کے دیکھو تو
حرم سرا ہو کہ دربار ہو کہ راج محل
سبھی ہیں ایک، یہ دیوار ڈھا کے دیکھو تو

☆☆

وہ لوگ اور تھے جن سے ہے یہ زمیں روشن

☆☆

وہی جنھوں نے بتانِ حروف کے بدلے　　دل بشر کو بنایا حیات کا مخزن
خدا کو قید معابد سے دے کر آزادی　　وسیع کر دیا اس کائنات کا دامن
یہ نکتہ غور طلب بھی ہے گفتنی بھی ہے

☆☆

اس نظم میں حمایت صاحب نے بڑے سلیقے سے نئی نسل کو اس تاریخی شعور سے آگاہ کیا ہے جو ہزار پردوں کے پیچھے چھپا دیا گیا ہے۔ بادشاہوں کے زیر سایہ، مذہبی علمائے کرام نے دینی تعلیم کو کتنا مسخ کر دیا ہے، اسے کتنے خانوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک اکائی کو کتنی دہائیوں میں بانٹ دیا۔ اس کا تجزیہ کبھی ''حقیقت پسند'' وقت ہی کرے گا مگر وہ وقت کب آئے گا؟ اگر ہمیں حقیقت کا علم ہی نہ ہو تو وہ قوم حقیقت آشنا کیسے ہو سکتی ہے؟

انسان کو فرشتوں نے صرف اس اعزاز کی بناء پر سجدہ کیا تھا کہ خالق کائنات نے اسے ''عقل'' سے سرفراز کیا تھا۔ اپنی کسی مخلوق کو خدا نے یہ نعمت عطا نہیں کی۔ اسی کی بناء پر وہ ''اشرف المخلوقات'' کے منصب پر فائز ہوا اور اب یہی فضیلت اس سے چھین لی گئی۔ بالخصوص مسلمانوں میں یہ عقیدہ عام ہے کہ عقل ناقص ہوتی ہے اس لیے سوچنا بھی گناہ ہے، وغیرہ وغیرہ۔ حمایت صاحب نے اپنی نظم میں ایسے ہی عقائد کی گود میں پلی ہوئی نسلوں کو ''عقل'' کی طرف راغب کیا ہے۔

مرے لہو کے چراغو مرے جگر پارو
تغیرات کی زد میں زندگی کا نظام
ہر اک عمل کا مقدر ہے ایک ردِّ عمل

ہر ایک صبح کی تقدیر میں لکھی ہے شام
ہر ایک مظہر فطرت ہے، آدمی کا رفیق
ہر ایک لوح پہ کندہ ہے آدمی کا نام
یہ شرق و غرب، سفید و سیاہ، پست و بلند
ہر ایک فرق سے بالا ہے، آدمی کا مقام

☆☆

پھر وہ نئی نسل کو نصیحت کرتے ہیں:

تمھیں زمین پہ رہنا ہے آسماں کی طرح
سمیٹنا ہے ہر اک غم کو اپنے دامن میں
کشادہ ظرفیِ قلبِ پیمبراں کی طرح
یہ رہ گزر جو بچھی ہے تمھارے قدموں میں
بصد خلوص کسی نیک میزباں کی طرح
اسی وطن کی عطا ہے اسی وطن کا کرم
جنم دیا ہے تمھیں جس نے ایک ماں کی طرح

زمین حمایت صاحب کی نظر میں ''ماں'' کی طرح محترم اور ماں کی طرح مقدس اور ماں کی طرح سب سے بڑی سچائی ہے۔

''آئینہ در آئینہ'' کو بھی طویل نظموں میں شمار کیا جائے گا۔ یہ تین ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل ہے مگر چوں کہ حمایت صاحب کی خودنوشت ہے۔۔ سوانح حیات ہے اور اردو شاعری میں پہلی مثال کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے اس کا جائزہ ایک الگ باب میں لیا جائے گا۔

تثلیث یا ثلاثی

(مختصر ترین صنفِ سخن)

حمایت علی شاعر نے جہاں ''بنگال سے کوریا تک'' اور آئینہ در آئینہ جیسی طویل نظمیں لکھی ہیں وہاں

مختصر ترین اصناف سخن میں بھی اپنا ہنر دکھایا ہے۔ رباعیات، قطعات، غزلیں اور ہم جانتے ہیں کہ غزل کا ایک شعر دنیا میں سب سے مختصر پیمانہ اظہار ہے صرف دو مصرعوں میں بڑی سے بڑی بات، بڑے سے بڑا خیال سمیٹ لیا جاتا ہے۔ لیکن حمایت علی شاعر کے حیرت طراز ذہن نے ''سخن کا اس سے بھی مختصر قرینہ اپنایا۔ یعنی ''ایک مصرعہ۔ ایک نظم'' ان کے پہلے مجموعۂ کلام ''آگ میں پھول'' کے پہلے ایڈیشن (۱۹۵۶ء) میں (صفحہ ۱۱۹) پر ''عوام'' کے عنوان سے ایک مصرعہ دیا ہوا ہے۔

''رات سورج کو نگل سکتی ہے تاروں کو نہیں''

یہ مصرعہ ایک بڑی صداقت کا آئینہ دار ہے۔ سورج بھی روشنی کی علامت ہے اور تارے بھی۔ لیکن رات میں سورج نہیں ہوتا اور تارے چمکتے رہتے ہیں اندھیرا ان کا کچھ نہیں بگاڑ پاتا اندھیرا جتنا زیادہ ہوتا ہے وہ اتنے ہی چمکتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ''عوام'' ناقابل تسخیر ہوتے ہیں۔ میں نے جب حمایت صاحب سے ان کی ایسی نظموں کے حوالے سے گفتگو کی تو انھوں نے بتایا کہ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۵ء کے درمیان ''ایک مصرعہ۔ ایک نظم'' کا سلسلہ شروع کیا تھا جو ''ادب لطیف'' (لاہور) اور دوسرے رسالوں میں شائع ہوتا رہا۔ پھر انھوں نے اپنے مقالات اور مباحث کا ایک مجموعہ جو ''شخص و عکس'' (۱۹۸۴ء) کے نام سے ہے مجھے دکھایا۔ اس کتاب کے حصہ مباحث ''تزکیہ'' کے صفحہ (۳۰۷) پر تین نظمیں ''ایک مصرعہ ایک نظم'' کے عنوان سے (عکس کی صورت میں) موجود ہیں جو ''ادب لطیف'' کے فروری ۱۹۵۲ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھیں جس میں ''عوام'' کے علاوہ دو اور نظمیں بھی تھیں۔ ''مستقبل'' کے عنوان سے ایک مصرعہ تھا۔

''رات کی گود میں سویا ہوا مہتاب کا خواب''

اور ''دوشیزگی'' کے عنوان سے یہ مصرعہ تھا۔

نہ مسکرائے تو گلزار، مسکرائے تو پھول

ان نظموں کو پڑھ کر مجھے ان کے ذہن اور مزاج کو سمجھنے کی ایک اور راہ مل گئی۔ وہ جستجو پسند ہیں، اس لیے ہمیشہ منفرد راستہ اپنے لیے منتخب کرتے ہیں خواہ وہ کتنا ہی کٹھن کیوں نہ ہو۔ وہ تجربوں کی طرف مائل رہتے ہیں اور ہمیشہ غیر معمولی کام کرنا چاہتے ہیں۔ ان نظموں کے بارے میں انھوں نے (اسی کتاب میں) اپنے ایک جوابی مضمون ''آئینہ کیوں نہ دوں'' میں لکھا ہے۔

''ابتدائی عمر میں یہ سب مشاغل کبھی تفریحاً اور کبھی تجربے کے طور پر عمل آتے تھے میں اس دور میں

ہی نظمیں رسائل میں چھپتی تھیں اور سارا ہندوستان و پاکستان ایک ہی صف میں نظر آتا تھا۔ حیدرآباد دکن میں حمایت صاحب کے ساتھ سلیمان اریب، قمر ساحری اور عزیز قیسی بھی جوش و خروش سے بھرپور نظمیں لکھتے تھے اور مشاعروں میں ان تمام شعرا کو بہت ذوق وشوق سے سنا جاتا تھا۔ میں یہ بات پہلے کہیں تحریر کر چکی ہوں کہ یہ نظم حیدرآباد دکن کے رسالے ''آدمیت'' میں چھپ چکی تھی لیکن حمایت صاحب کی کسی کتاب میں ہے نہ کسی بیاض میں۔ لیکن چوں کہ یہ ان کی پہلی طویل نظم تھی اس لیے اس کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھا۔ اس کے کچھ اشعار جو مجھے حمایت صاحب نے سنائے لکھ رہی ہوں تاکہ اُن کے (اُس وقت کے) اندازِ نگارش کا اندازہ ہو جائے۔

جو بازو سوکھ کر کانٹا ہوئے تھے، اب ہیں تلواریں — جو سینے کھوکھلے تھے، آج ہیں لوہے کی دیواریں
برہنہ پاؤں کی ٹھوکر میں ہیں زورآور دستاریں — نہ ہوگا بال بھی بیکا، نہ بنے لاکھ سر ماریں

☆

جو تم بڑھتے ہو آگے، دل ہمارے بڑھتے جاتے ہیں — ہمارے دل میں بھی جذبات پیچ و تاب کھاتے ہیں
تمھاری طرح لو ہم بھی قدم آگے بڑھاتے ہیں — تم اس جانب سے آؤ، ہم تلنگانے سے آتے ہیں

(یہ نظم پچاس ستاسٹھ اشعار پر مشتمل تھی)

حمایت صاحب غالباً مئی یا جون ۱۹۵۱ء میں پاکستان آئے اور یہاں آکر انھوں نے دو طویل نظمیں لکھیں۔ ایک ''شعلۂ بے دود'' جو ۱۹۵۲ء میں ''ادب لطیف'' (لاہور) کے جولائی کے شمارے میں شائع ہوئی تھی اور ''بنگال سے کوریا تک'' جو عالمی جنگ کے خلاف ایک طویل افسانوی نظم تھی۔

''شعلۂ بے دود'' ایک افسانے کے انداز میں لکھی گئی تھی۔ متوسط طبقے کا ایک کردار واحد متکلم کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے اور وہ اپنے طبقے کی نفسیات کی روشنی میں اپنے عشق، اپنے خواب اور اپنے تصورات بیان کرتا ہے۔ اس کی زندگی میں دو لڑکیاں داخل ہوتی ہیں ایک اسی کی طرح غریب متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی اور دوسری امیرزادی۔ جو وقت گزاری کے لیے کہانی کے ہیرو میں دل چسپی لیتی ہے کچھ عرصہ ساتھ رہتی ہے اور پھر اپنے طبقے کے کسی امیرزادے سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ غریب نوجوان اس عرصے میں جو خواب دیکھتا ہے یا خوابوں میں جو محل تعمیر کرتا ہے اور اس امیرزادی کے جگمگاتے حسن سے متاثر ہو کر جن رنگا رنگ تصورات میں کھویا رہتا

ہے وہ مناظر دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اس کا سراپا جس انداز میں کھینچتا ہے وہ بھی دیدنی ہے اور در پردہ جو حسرتیں اور آرزوئیں اس کے دل میں پیدا ہوتی ہیں ان کی تصویر ان اشعار میں دیکھی جا سکتی ہے:

میری مسجود اک بتِ طناز — زرگرِ وقت کا نیا شہکار
جس کے قدموں میں مہر و ماہ و نجوم — جس کے پیکر میں بس گئی تھی بہار

زلف جس طرح میکدے کی شام — ہونٹ لالے کی ادھ کھلی کلیاں
روپ جس طرح چودھویں کا چاند — سر سے پا تک حیات کا عنواں
خلوتوں کی خموش گفتاری — جلوہ گاہوں کے راز کی غماز
حرمِ خاص میں کھنکتے جام — ناچتے گاتے میکدوں میں نماز

میری نظروں کے عکس زادوں میں — ایک جنت، خرام فرما تھی
کعبۂ دل میں خُم بدوش کوئی — دخترِ زر قیام فرما تھی
دخترِ زر کہ جس کے ہونٹوں پر — روپیوں کی کھنک بکھرتی ہوئی
دخترِ زر کہ جس کی آنکھوں میں — روپیوں کی چمک نکھرتی ہوئی

میرے خوابوں میں کب سے رقص کناں — میرے مسجود کی جوانی تھی
بھاؤ چڑھتے اترتے جاتے تھے — جرأت اک اور آزمانی تھی

یہ نظم ہمارے معاشرے کے اس انداز فکر کی ترجمان ہے جو متوسط طبقے میں عموماً پایا جاتا ہے۔ اس طبقے کے لوگ عام طور پر اوپر کے طبقے میں جانے کی آرزو رکھتے ہیں ان کی یہ دلی خواہش ہوتی ہے کہ کسی طرح اوپر کے طبقے میں پہنچ جائیں۔ وہ اگر اس طبقے سے وابستہ نہ بھی ہو سکیں تو اپنے آپ کو اس طبقے کا ایک فرد باور کراتے ہیں۔ جائز طریقے سے راتوں رات امیر ہونا تو ممکن نہیں، سوائے اس کے کہ کوئی امیر زادی ان سے عشق کر بیٹھے جو بہت کم ہوتا ہے ایسی باتیں صرف کہانیوں اور داستانوں میں نظر آتی ہیں، ان کے لکھنے والے بھی چوں کہ متوسط طبقے کے ہوتے ہیں اس لیے وہی

لوگ ایسی کہانیاں لکھ کر اپنی حسرت پوری کر لیتے ہیں۔ ''شعلۂ بے دود'' میں بھی کہانی کچھ ایسے ہی تصورات کی نمائندگی کرتی ہے، پھر جب یہ تصورات ٹوٹتے ہیں اور حقیقت سامنے آتی ہے تو وقت ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ کہانی کے کردار کو اپنی ناکامی کا احساس ہوتا ہے اور یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اس نے کیا کھویا اور کیا پایا۔۔۔

مجھ کو معلوم کیا کہ تاج محل — کس کے اشکوں میں ڈوب کر ابھرا
کس امارت نے کس غریبی کے — دل سے سارا لہو نچوڑ لیا
ایک غربت گزیدہ مستِ شباب — خامشی سے نگاہ موڑ گئی
اس نے مجھ سے کہا تو کچھ بھی نہیں — اک تبسم لبوں پہ چھوڑ گئی

وہ تبسم کہ جس کی زندہ لاش — دفن کر دی تھی میں نے ہونٹوں میں
وہ تبسم کہ ہو گیا تحلیل ..... — زرگری کے طفیل اشکوں میں

یہاں حمایت صاحب نے جو تجزیہ کیا ہے وہ قابل مطالعہ ہے۔

اشک، دل کے مزار کی شمعیں — اشک، طغیانیوں کا ساکت جوش
اشک، تابوت مسکراہٹ کے — دوشِ مژگاں پہ منجمد خاموش

اشک، جن کی چمک پہ سکّوں کی — تابناکی نے دھند برسا دی
اشک، جن کے خنک شراروں نے — میری رگ رگ میں آگ دوڑا دی

تقریباً سوا شعار پر مشتمل یہ نظم مختلف نشیب و فراز سے گزر کر جب اپنے نقطۂ عروج پر پہنچتی ہے تو ایک کربناک تشنگی چھوڑ جاتی ہے۔ جو اس کہانی کا حرف اختتام ضرور ہے مگر اسے معاشرے میں ایک انقلاب کا حرف آغاز بھی کہا جا سکتا ہے۔

وہ چلی تو گئی مگر اب تک — آہٹ آہٹ پہ دل دھڑکتا ہے
بجھ گئی انتظار کی ہر شمع — دل میں ایک شعلہ سا بھڑکتا ہے

حمایت علی شاعر کا تعلق بھی ایک متوسط طبقے سے ہے۔ میں نہیں جانتی کہ اس کہانی کا ان کی زندگی سے بھی کوئی تعلق ہے یا نہیں جب انھوں نے یہ افسانوی نظم لکھی وہ شادی شدہ تھے اور مجھے معلوم

ہے کہ یہ شادی انھوں نے اپنے خاندان کی مخالفت کے باوجود کی تھی گویا انھوں نے اپنی پسند کی شادی کی تھی۔ اس لیے ہم ''واحد متکلم'' میں ہونے کے باوجود اس کہانی کو ان کی ''آپ بیتی'' سے متعلق نہیں کر سکتے۔

وہ ایک باشعور شاعر ہیں۔ ان کی نظر نہ صرف اپنے طبقے پر ہے بلکہ وہ اپنے اطراف ان تمام حقیقتوں کو بھی دیکھتے رہتے ہیں جن میں ایسی کہانیاں جنم لیتی رہی ہیں۔ ''بنگال سے کوریا تک'' بھی ایک ایسی ہی آپ بیتی ہے۔ حمایت صاحب نے اس نظم کے بارے میں ایک نوٹ بھی لکھا ہے۔

''یہ کہانی آپ بیتی نہیں لیکن آپ بیتی ہو سکتی ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ''میں بھی'' ہو سکتا ہوں اور ''آپ بھی''۔ کیوں کہ گزشتہ عالم گیر جنگ میں بنگال جنگ سے دور رہ کر بھی لاکھوں انسانوں کا مدفن بن گیا اور کوریا تازہ ہیروشیما ہے اور یہ ہیروشیما جتنی تیزی سے پھیلتا جائے گا بنگال کی وسعتوں میں بھی اسی سرعت سے اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس پس منظر کی روشنی میں اس کہانی کا مرکزی کردار انفرادی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اجتماعی کردار بھی ہے اور آج نئی عالم گیر جنگ کا ہولناک اندیشہ، دنیا کے ہر انسان کے دل میں ایک سوالیہ علامت بن گیا ہے۔ ''کیا ہماری نئی نسل بھی جنگ کا ایندھن بن جائے گی؟''

اس نوٹ کی ایک تاریخی اہمیت بھی ہے اس زمانے میں کوریا کی جنگ کے خلاف ساری دنیا میں امن تحریک بھی چل رہی تھی۔ جنگ کے خلاف ایک عالم گیر دستخطی مہم بھی شروع کی گئی تھی میں نے حمایت صاحب کی لائبریری میں حیدرآباد دکن کے ہفتہ وار ''پرواز'' کی ایک فائل دیکھی جس کے ۱۸ر نومبر ۱۹۵۰ء کے شمارے میں حمایت صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا تھا ''میں امن چاہتا ہوں''۔ اس مضمون میں انھوں نے بڑی خوبصورتی سے اپنی امن کی خواہش کا جواز پیش کیا ہے، وہ اس وقت اپنی ننھی بچی ''جاوداں'' کے ساتھ گھر کے سامنے دوسرے ننھے ننھے بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''میں بچوں کی ایک ایسی محفل میں بیٹھا ہوں جہاں دھرتی کے سینے پر پھیلی ہوئی ہری ہری دوب ہے۔ قریب و دُور جھومتے ہوئے چھوٹے چھوٹے پودے ہیں اور رنگ برنگے پھول اور ہنستے ہوئے بچے ہیں۔ میری گود میں بیٹھی ہوئی جاوداں ہنس رہی ہے۔ کلکاریاں مار رہی ہے۔ ایسے وقت آپ کا یہ سوال کہ میں امن چاہتا ہوں یا جنگ؟ یہ مسکراتے ہوئے پھول، اڑتی ہوئی تتلیاں،

ننھے منے مرمریں قدموں تلے بچھا ہوا مخملیں قالین، قالین پر رینگتا، بھاگتا ہوا یہ ربر کا گولا، دوڑتا ہوا ارتقاء، مسکراتا ہوا مستقبل، ہنستی ہوئی زندگی اور یہ جاوداں، نہ جانے اس کی چیخوں سے میرا دل کانپ کیوں جاتا ہے۔ اس شور و غوغا میں مجھے بم کے دھماکوں کی آواز ڈوبتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ میری بچی کی مسلسل ''نا.....نا'' جنگ کے خلاف آواز بلند کرتی نظر آ رہی ہے۔''

یہ تو ایک شاعر کا انداز بیان تھا ایک شاعرانہ نثر میں۔ لیکن انھوں نے اس دور میں جو بھی لکھا جنگ کے خلاف ہی لکھا۔ ۱۹۵۱ء کے آغاز میں جب وہ بمبئی بسلسلۂ روزگار گئے ہوئے تھے انھیں ساحر لدھیانوی کی معرفت ایک فلم ''اسٹیج'' کے لیے ایک گانا لکھنے کا چانس ملا تھا۔ اس وقت عہد حاضر کے مقبول میوزک ڈائریکٹر انو ملک کے والد سرملک، موسیقار حسن لال بھگت رام کے اسسٹنٹ تھے، ساحر صاحب کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ جو بمبئی کے ایک محلے اندھیری میں کرشن چندر کے بنگلے کے اوپری حصے میں مقیم تھے حمایت صاحب اور مسلم ضیائی بھی وہیں ٹھہرے ہوئے تھے۔ انھی دنوں انھیں ''اپٹا'' (IPTA انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن) میں ایک اور کام مل گیا۔ اپٹا سے ان دنوں حیدرآباد ریڈیو کی ایک آرٹسٹ اوشا بھی وابستہ تھیں وہ جنگ کے خلاف ایک پروگرام اسٹیج کرنا چاہتی تھیں۔ حمایت صاحب ان کے پرانے ساتھی تھے۔ ان کے مشورے سے ایک سیاسی بھجن اسٹیج کرنے کا پروگرام بنایا گیا بھجن لکھنے کا فرض حمایت صاحب نے سنبھالا، دھن اپٹا کے موسیقار اور شاعر پریم دھون نے بنائی اور اوشا نے اسے اسٹیج کیا۔ بھجن کے مکھڑے کے بول تھے۔

ڈالر دیس کے راجہ۔ اوسب راجوں کے رکھوالے
کٹھن گھڑی ہے، ہم بھگتوں پر، آ کر ہمیں بچالے
اوسب راجوں کے رکھوالے

اس بھجن کی تفصیل میں پہلے لکھ چکی ہوں۔

یہ بھجن ان کے پہلے مجموعۂ کلام ''آگ میں پھول'' کے دوسرے ایڈیشن میں شامل ہے جس کے ساتھ اپٹا میں اسٹیج کیے جانے کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ حمایت علی شاعر نے اپنی منظوم خودنوشت سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

پاکستان آ کر بھی حمایت صاحب خاموش نہیں بیٹھے جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ انھوں نے ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۳ء کے دوران یہ طویل افسانوی نظم ''بنگال سے کوریا تک'' لکھی تھی۔ اس کے

مختلف حصے کراچی کے مختلف رسائل میں چھپتے رہتے سب سے پہلے اردو کالج کے میگزین ''برگ گل'' کے شمارے (۵۲،۵۳ء) میں اس کا دوسرا حصہ ''تصور'' کے عنوان سے چھپا۔ اس وقت ابن انشاء اور اے آر ممتاز بحیثیت اسٹوڈنٹ اس رسالے کے مدیر تھے۔ پھر اس کے دو حصے ''مشرب'' (ایڈیٹر اختر انصاری اکبر آبادی) کے مئی ۵۳ء کے شمارے میں شائع ہوئے۔ بعد ازاں انھیں حصوں کو پروفیسر ممتاز حسین نے اپنے ادبی ڈائجسٹ ''روح ادب'' (۵۳ء) میں منتخب کیا۔ پھر ڈاکٹر جمیل جالبی کے رسالے ''نیا دور'' (۳-۴) میں اس کی دو قسطیں چھپیں (اس وقت جمیل جالبی صاحب انکم ٹیکس افسر تھے، اس لیے رسالے میں بحیثیت مدیر اپنا نام نہیں دیتے تھے) پروفیسر ممتاز حسین ایک اور رسالے ''سیارہ'' کے بھی مدیر تھے۔ انھوں نے ''بنگال سے کوریا تک'' کا ایک حصہ ''سیارہ'' کے ستمبر ۵۳ء میں بھی شائع کیا تھا۔ اس کے بعد بھی مختلف رسائل میں یہ نظم قسط وار چھپتی رہی۔ پوری نظم ماہ نامہ ''شاہراہ'' (دہلی) کے سال نامے (ضمیمہ) مارچ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت وامق جونپوری اس کے ایڈیٹر تھے۔

پاکستان میں پوری نظم پہلی بار ۱۹۵۶ء میں حمایت صاحب کے پہلے مجموعۂ کلام ''آگ میں پھول'' میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کی اشاعت سے پہلے ساحر لدھیانوی کی نظم ''پرچھائیاں'' نومبر ۵۵ء میں شائع ہو چکی تھی (کتاب میں ساحر صاحب کے پیش لفظ پر ۱۲ر نومبر ۱۹۵۵ء اور علی سردار جعفری کے دیباچے پر ۲۳ر نومبر ۱۹۵۵ء درج ہے) چناں چہ حمایت صاحب کے کچھ ''کرم فرما'' جو ہمیشہ کسی نہ کسی عنوان سے انھیں بدنام کرنے کی اور ان کی شہرت کو نقصان پہنچانے کی کوشش میں مصروف رہتے تھے، ان کی اس نظم کو ''پرچھائیاں'' سے منسوب کرنے لگے۔ ان میں جو لوگ پیش پیش تھے ان میں ایک شمیم احمد (سلیم احمد کے بھائی) تھے اور دوسرے محسن بھوپالی۔ ان حضرات کی اچھالی ہوئی دُھول اس وقت صاف ہوئی جب حمایت صاحب نے اپنی نظم کی اشاعتی تاریخوں کی تفصیل اہل ادب کے سامنے پیش کر دی۔

''بنگال سے کوریا تک'' ہندوستان میں بھی شائع ہوئی۔ سلیمان اریب نے پوری نظم، ساہتیہ اکیڈمی (اتر پردیش) کے زیر اہتمام چھپنے والی کتاب ''حیدر آباد کے شاعر'' (حصہ دوم) میں حمایت صاحب کے بارے میں ایک نوٹ کے ساتھ شائع کی۔ بعد ازاں ان کے سندھی، ہندی اور انگریزی تراجم بھی چھپتے رہے۔

میں نے اپنی کتاب ''بارش سنگ سے بارش گل تک'' کے دیباچے میں دونوں نظموں (بنگال سے کوریا تک اور پرچھائیاں) کے موضوع اور مماثلت کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کا اقتباس پیش کرتی ہوں۔

''دونوں نظموں کا موضوع ایک تھا یعنی جنگ کے خلاف عالمی امن کی آرزو۔ اتفاق سے دونوں کی تکنیک بھی ایک تھی یعنی FLASH BACK جو اردو شاعری میں عرصہ ہوا۔ پہلی بار محترم احسان دانش نے اختیار کی تھی۔ ان کی بہت ہی مشہور اور مقبول نظم ''بیتے ہوئے دن'' اسی تکنیک میں ہے جس کا ٹیپ کا مصرعہ تھا۔

''بیتے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں تنہائی جنھیں دہراتی ہے''

ساحر صاحب نے ''پرچھائیاں'' مختلف بحروں میں لکھی ہے۔ جن میں ایک بحر وہی تھی جس میں احسان دانش صاحب نے اپنی نظم لکھی تھی۔ (ممکن ہے ساحر صاحب کے تحت الشعور میں وہی نظم رہی ہو ویسے ان کا تعلق فلم سے بھی تھا فلموں میں یہ تکنیک اکثر استعمال ہوتی ہے) حمایت صاحب کا تعلق بھی ریڈیو اور فلم سے رہا ہے ان کی پوری نظم ایک ہی بحر میں ہے اور جیسا کہ اشاعتی تاریخوں سے ظاہر ہے کہ یہ نظم ساحر صاحب کی نظم سے تین سال پہلے پاکستان میں لکھی گئی تھی۔ دونوں نظموں میں کہانی بھی مختلف تھی اور اس کا پس منظر بھی، حمایت صاحب کی نظم ایک تاریخی پس منظر رکھتی ہے جب کہ ساحر صاحب نے ایک ''رومانی افسانہ'' لکھا تھا، کچھ باتیں مزید وضاحت کے لیے بیان کرنا چاہتی ہوں۔

ساحر صاحب نے مختلف بحروں میں جو اشعار ہیں ان میں ایک مصرعہ ''چودہ بار'' استعمال کیا ہے۔

''تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں''

اس بحر میں (۵۲) اشعار ہیں۔

''وہ لمحے کتنے دلکش تھے، وہ گھڑیاں کتنی پیاری تھیں''

اس بحر میں (۲۳) اشعار ہیں پھر اس بحر میں نصف مصرعہ اضافی استعمال کر کے انھوں نے ڈھائی مصرعوں کے سات (۷) بند اور لکھے ہیں۔

تم آج ہزاروں میل یہاں سے دور کہیں تنہائی میں
یا بزم طرب آرائی میں

میرے سپنے بنتی ہوگی بیٹھی آغوش پرائی میں

اس طرح یہ نظم جملہ (۸۲) اشعار پر مشتمل ہے۔اس کے برعکس حمایت علی شاعر کی نظم (۱۲) حصوں پر مشتمل ہے ہر حصے میں (۲۱) اشعار ہیں اور ایک ٹیپ کا بند ہے جو ہر حصے کے نقطۂ آغاز کے طور پر آتا ہے۔

آئینہ خانۂ تصور میں ایک اک نقش ابھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھر تھراتے ہی آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

اس طرح یہ نظم (۲۵۴) اشعار پر مشتمل ہے

نامناسب نہیں ہوگا اگر ان دونوں نظموں کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے بھی پیش کر دوں۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

"طویل نظموں میں "بنگال سے کوریا تک" نہایت خوب صورت نظم ہے۔اتفاق دیکھیے کہ پچھلے دنوں بالکل اسی موضوع پر ساحر لدھیانوی نے بھی ایک طویل نظم لکھی ہے "پرچھائیاں"۔لیکن میری رائے میں آپ کی نظم "پرچھائیاں" سے کہیں بہتر ہے۔"پرچھائیاں" میں ایک تو ساحر صاحب نے میٹر کو بار بار بدلا ہے جس سے نظم کی روانی کو صدمہ پہنچتا ہے۔آپ کی نظم میں یہ نقص موجود نہیں ہے۔دوسرے ساحر نے جو کہانی پیش کی ہے وہ نہ صرف بے حد معمولی ہے بلکہ بے ربط بھی ہے اور آخر میں اس نے وعظ کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔آپ کی کہانی میں لوچ ہے ایک نقطۂ عروج ہے اور پھر زندگی کے مخصوص "انداز" کو طشت از بام کیا گیا ہے۔اس نظم میں "بچی" کا کردار "امید" کے معنوں میں آیا ہے جو موجودہ خلفشار تخریب اور بربریت کے زمانے میں انسان کا واحد سہارا ہے۔نظم کا یہ مثبت پہلو بڑے فطری انداز میں ابھرا ہے اور یہی اس نظم کا سب سے بڑا وصف ہے۔پھر آپ نے ساحر کی طرح اپنے افکار کو قاری پر ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی بلکہ صرف اپنی کہانی سنائی ہے اور اس طرح قاری کی ہمدردی حاصل کی ہے میں آپ کی اس نظم سے متاثر ہوا ہوں۔مبارک باد قبول فرمایئے۔"

"بنگال سے کوریا تک" کے بارہ حصوں کے عنوانات یہ ہیں۔

۱۔یادوں کے غبار، ۲۔ایک مسرت ایک موت، ۳۔غم حاصل، ۴۔وداع، ۵۔جنگ کے میدان میں، ۶۔آگ میں پھول، ۷۔جب شعلے بجھ گئے، ۸۔اپنا وطن، ۹۔اپنا گھر، ۱۰۔حاصلِ غم،

۱۱۔دوسری زندگی، ۱۲۔دوسری مسرت۔

ان بارہ عنوانات سے کہانی کا ایک خاکہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ایک نسل سے دوسری نسل تک زندگی کا ایک تسلسل ہے جو اپنے مسائل کے ساتھ رواں دواں ہے۔پس منظر میں اپنا وطن، اپنے لوگ، اپنے رشتے ناطے، ان کی محبت، ان کے غم اور پھر قوم و ملک کے ساتھ ان کی اپنی تباہی، انتشار، غربت، قحط۔بقول شاعر:

میرے ٹیگور کی زمیں پر آج
لاشوں ڈھانچوں کا بس گیا تھا جہاں
اس قدر تھا کریہہ ہر منظر
جیسے قے کر چکا ہو قبرستان

اور پھر سوالات؟

سوچتا تھا کہ میری غربت نے
اپنا سب کچھ لٹا کے کیا پایا
ایک خوش حال زندگی کے لیے
جنگ کے کام آکے کیا پایا

یہ دوسری عالم گیر جنگ (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) کا حاصل تھا۔کوریا کی جنگ تیسری عالم گیر جنگ کا پیش خیمہ سمجھی جا رہی تھی اور ساری دنیا اسی لیے لرزہ براندام تھی۔۔۔حمایت صاحب لکھتے ہیں:

آج پھر کچھ خدائے دولتِ ارض
نقش ہستی مٹائے جاتے ہیں
نت نئے کوریا، نت نئے بنگال
سولیوں پر چڑھائے جاتے ہیں

اور پھر نئی نسل کے لیے سوچ کا ایک زاویہ یہ بھی نمایاں ہوا تھا:

کوئی سوچے، عروس فطرت کیوں
شام سے تا بہ صبح روتی ہے

ایک سورج کی موت میں مضمر
کتنی کرنوں کی موت ہوتی ہے

یہ بند اس نظم کا حرفِ آخر ہے۔

''بنگال سے کوریا تک'' کی کہانی ایک فرد کی زندگی سے شروع ہوتی ہے اور ایک خاندان کا المیہ بن جاتی ہے۔ ''ایک خاندان'' ایک ملک اور ایک قوم کا حصہ ہوتا ہے۔ ایک کی تباہی سے دوسرے کی تباہی عبارت ہوتی ہے۔ جنگ افراد کو پہچانتی ہے نہ قوموں کو شہروں کو پہچانتی ہے نہ ملکوں کو۔ جنگ کی زد میں جو آبادیاں آجاتی ہیں وہ بھی اجڑ جاتی ہیں اور جو آبادیاں بظاہر دور ہوتی ہے وہ بھی جنگ کا ایندھن بن جاتی ہیں۔ حمایت علی شاعر نے جنگ اور امن کے تعلق سے برسوں جو سوچا وہ سب لکھ دیا۔ (اخباری کالموں اور مضامین کی شکل میں یا نظموں، گیتوں اور بھجن کی شکل میں) جس ماحول میں وہ زندگی بسر کر رہے تھے وہ زندگی اپنے گرد و پیش کا آئینہ بھی انھیں دکھا رہی تھی۔ ساری دنیا میں چلنے والی امن تحریک انھیں جنگ کے خلاف اکساتی رہی۔ پاکستان آکر بھی وہ ذہنی طور پر اسی فکر سے بندھے رہے وہی جذبات و احساسات انھیں اپنے دائرے میں لیے رہے آخر وہ اس نظم کے لکھنے میں کامیاب ہو گئے۔

اس نظم میں بچی کے کردار نے جو مثبت تاثر چھوڑا ہے میں سوچتی ہوں اس کا تعلق شعوری یا لاشعوری طور پر حمایت صاحب کی اس بچی سے کتنا ہے جو ۱۹۵۰ء میں ان کی گود میں کلکاریاں بھر رہی تھی۔ جو ''نا۔نا'' کہہ کر جنگ کے خلاف اپنے انداز میں آواز بلند کر رہی تھی۔ اس وقت تک تو حمایت صاحب نے اس نظم کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اس وقت تو انھوں نے صرف ایک اخباری مضمون لکھا تھا۔ ''میں امن چاہتا ہوں''۔ ''کوریا'' ان کی اوّلین طویل نظم ایک جوشیلی نظم تھی اس میں کوئی افسانہ تھا نہ کوئی کردار۔

اس لیے اس نظم کو ''بنگال سے کوریا تک'' کا محرک نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی محرک وہی بچی ہے یا پھر اپنا میں اوشا کا اسٹیج کیا ہوا وہ ''بھجن'' جس کے بول بچے بچے کو یاد ہو گئے تھے۔ اس بات کی تصدیق حمایت صاحب کے اس مضمون سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے کے بعد ۱۹۷۱ء میں لکھا تھا جب ہماری (۹۳) ترانوے ہزار فوج ہندوستان کی قید میں تھی۔ اس مضمون کا عنوان تھا ''میرا پیغام محبت ہے'' (مطبوعہ ''دھنک'' لاہور ۱۹۷۲ء) اس مضمون میں

بھی انھوں نے ۵۰ء اور ۵۱ء میں چلنے والی امن تحریک کی دستخطی مہم کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔ ''مجھے یاد ہے، میری یہ بیٹی جوان دنوں ایک ننھی سی گڑیا جیسی تھی جسے پا کر میں پہلی بار اس احساس سے آشنا ہوا تھا جو روزِ ازل انسان کی تخلیق پر خدا نے محسوس کیا ہوگا یا آدم نے حوا کی گود ہری دیکھ کر محسوس کیا ہوگا۔۔ ایک اجنبی سا احساس مسرت ایک لطیف سا احساسِ فخر۔ میں جب بھی اپنی بچی کو گود میں لیتا، ایک ایسی ہی انجانی کیفیت مجھ پر طاری ہو جاتی اور پکاسو کی فاختہ کے پروں کے سائے میں مجھے ایک اطمینان کا احساس ہوتا اور میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کے دستخط حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہو جاتا۔ پھر ایک روز یوں ہوا کہ میری ننھی سی بیٹی نے اس کاغذ پر چند لکیریں کھینچ دیں۔ بیوی نے ہنس کر کہا۔ ''لیجیے! آپ کی بیٹی نے بھی دستخط کر دیئے۔'' اور جب یہ بات ادیبوں تک پہنچی تو سب نے اسے نئی نسل کی طرف سے ''امن کی دستاویز'' سے تعبیر کیا اور کرشن چندر نے اس کے نیچے لکھ دیا۔ ''امن کی فاختہ''۔

اور سردار جعفری نے لکھا۔ ''نئی دنیا کو سلام''۔ وشواشر عادل نے لکھا۔ ''ایشیا جاگ اٹھا''۔ اور میری آنکھوں سے خوشی کے چند آنسو نکل کر ان آڑھی ترچھی لکیروں پر پھیل گئے، کوریا کے لیے، بمبئی کی گلیوں میں آنسو، انسان سے انسان کی اس لازوال محبت کی علامت تھے جو دل کی دھڑکنوں میں جنم لیتی ہے اور اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک اس دھرتی پر انسان کا نقش قدم موجود ہے۔''

''بنگال سے کوریا تک میں'' (جنگ ختم ہونے کے بعد) جب ایک دوسرے انداز کی ''جنگ'' پوری زندگی پر مسلط ہو جاتی ہے۔ حمایت صاحب نے کس انداز میں اس کا جائزہ لیا ہے۔ قابل مطالعہ ہے۔

زندگی کے ہر ایک گوشے میں
ایک ایک چیز کاروباری تھی
کھیت کے کھیت تھے گھروں میں دفن
اور بھوکی خدائی ساری تھی
دیر تا کعبہ، کوئی دوکاں ہو
ہر طرف زر کی شہریاری تھی
ہر تجوری میں قبر کے مانند

موت کی جوئے فیض جاری تھی
جنگ تو ختم ہو چکی تھی مگر
جنگ ایک ایک گھر میں جاری تھی

اس ماحول میں یہ بچی بھی اپنا کردار ادا کرتی نظر آتی ہے۔

تنگ آ کر نہ جانے کتنی بار
دل نے سانسوں کا ساتھ چھوڑ دیا
لیکن اکثر میرے عزائم کو
ایک بچی نے ہنس کے توڑ دیا

ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا تھا۔ ''بچی امید کی علامت ہے''۔ حمایت صاحب نے اس کی صداقت کا ثبوت یوں دیا ہے۔

کیسے کیسے نہ خوں کے طوفاں میں
زندگی ڈوب کر ابھر آئی
ایک بچی کے واسطے یہ لاش
ہر کڑے دور سے گزر آئی

کسی نظم کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو اس کے محرکات پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ شاعر کے انداز فکر اور اس کی نفسیات بھی مطالعے کا حصہ ہوتی ہے۔ جس طرح ہمارے بچوں میں ہماری خصوصیات خون کے ذریعے در آتی ہیں اسی طرح ادبی تخلیقات میں بھی شاعر یا ادیب کی نفسیات اس کا طرزِ فکر اور اس کی شخصیت کسی نہ کسی طرح موجود ہوتی ہے۔ حمایت علی شاعر کے لاشعور میں ان کا بچپن محفوظ نظر آتا ہے۔ فرائڈ کے نقطۂ نظر سے سارے شعوری اقدامات کا محرک انسان کا لاشعور ہی ہوتا ہے۔ بچپن کے اثرات زندگی بھر ساتھ رہتے ہیں، حمایت صاحب کی اکثر نظموں میں بچے ضرور شامل ہو جاتے ہیں۔

حمایت صاحب کی ایک اور طویل نظم ہے ''حرف حرف روشنی''، یہ نظم بھی انھوں نے اپنے بچوں کی وساطت سے پاکستان کی اس نسل کے لیے کہی ہے جن کے والدین ترکِ وطن کر کے یہاں آباد ہو گئے، بظاہر یہ موضوع ایسا نہیں کہ اس پر ایک طویل نظم لکھی جائے۔ کیوں کہ پاکستان میں

''تارکینِ وطن'' ہیں ہی کتنے بمشکل ایک کروڑ ہوں گے جو رفتہ رفتہ اس کرب سے آزاد ہوتے جا رہے ہیں جو ایک زمین، ایک تاریخ اور ایک تہذیب کے چھوڑنے کے دکھ سے تعلق رکھتا ہے۔ ہندوستان سے ان کی رشتہ داریاں بھی روز بروز محدود ہوتی جا رہی ہیں۔ ایک ہی باپ کی اولاد میں اب رشتوں کی وہ نوعیت نہیں رہی جو اب سے پچاس سال پہلے تھی۔ نسل در نسل وقت کی چھلنی میں ہر چیز اب چھنتی جا رہی ہے اور اپنوں کے درمیان رفتہ رفتہ ایک اجنبیت کی فضا بھی ہموار ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن نئی نسل کے لیے سب سے اہم مسئلہ اپنی تاریخ کے تسلسل سے نکل کر مقامی تاریخ سے رشتہ جوڑنے کا ہے۔ ''لاشعور'' پر شعور کا قابو پانا اور وقت کی رفتار سے مطابقت پیدا کرنا ایک مشکل ترین عمل ہے اس عمل میں کئی نازک مقامات حارج ہوتے ہیں۔ حمایت صاحب نے تاریخی تجزیے کے ساتھ نئی نسل کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

مرے لہو کے چراغو میرے جگر پارو
سنو یہ مری نصیحت یہی ہے وصیت بھی
میں آج تم میں ہوں موجود کل نہیں ہوں گا
مگر جو تم ہو تو میں ہوں سدا سلامت بھی
تم اپنا نقطۂ آغاز ہی سہی لیکن
تمھارے ساتھ رواں مری روایت بھی
میں اپنے ماضی مرحوم کی امانت تھا
سو آج تم سے ہے منسوب یہ امانت بھی

پھر وہ اپنی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہیں۔

دروغ و مکر کا انبار ہے مری تاریخ
برائے نام خدا ہے، برائے نام ہے دیں
خدا و دیں کی گنہگار ہے مری تاریخ
نہ آدمی کی حقیقت نہ زندگی کا سراغ
فقط قصیدۂ دربار ہے مری تاریخ

☆☆

ہر ایک ذرہ ہے اپنے لہو میں ڈوبا ہوا
حنا سے اپنی ہتھیلی سجا کے دیکھو تو
حرم سرا ہو کہ دربار ہو کہ راج محل
سبھی ہیں ایک، یہ دیوار ڈھا کے دیکھو تو

☆☆

وہ لوگ اور تھے جن سے ہے یہ زمیں روشن

☆☆

وہی جنھوں نے بتانِ حروف کے بدلے دل بشر کو بنایا حیات کا مخزن
خدا کو قید معابد سے دے کر آزادی وسیع کر دیا اس کائنات کا دامن
یہ نکتہ غور طلب بھی ہے گفتنی بھی ہے

☆☆

اس نظم میں حمایت صاحب نے بڑے سلیقے سے نئی نسل کو اس تاریخی شعور سے آگاہ کیا ہے جو ہزار پردوں کے پیچھے چھپا دیا گیا ہے۔ بادشاہوں کے زیر سایہ، مذہبی علمائے کرام نے دینی تعلیم کو کتنا مسخ کر دیا ہے، اسے کتنے خانوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک اکائی کو کتنی دہائیوں میں بانٹ دیا۔ اس کا تجزیہ کبھی ''حقیقت پسند'' وقت ہی کرے گا مگر وہ وقت کب آئے گا؟ اگر ہمیں حقیقت کا علم ہی نہ ہو تو وہ قوم حقیقت آشنا کیسے ہو سکتی ہے؟

انسان کو فرشتوں نے صرف اس اعزاز کی بناء پر سجدہ کیا تھا کہ خالق کائنات نے اسے ''عقل'' سے سرفراز کیا تھا۔ اپنی کسی مخلوق کو خدا نے یہ نعمت عطا نہیں کی۔ اسی کی بناء پر وہ ''اشرف المخلوقات'' کے منصب پر فائز ہوا اور اب یہی فضیلت اس سے چھین لی گئی۔ بالخصوص مسلمانوں میں یہ عقیدہ عام ہے کہ عقل ناقص ہوتی ہے اس لیے سوچنا بھی گناہ ہے، وغیرہ وغیرہ۔ حمایت صاحب نے اپنی نظم میں ایسے ہی عقائد کی گود میں پلی ہوئی نسلوں کو ''عقل'' کی طرف راغب کیا ہے۔

مرے لہو کے چراغو مرے جگر پارو
تغیرات کی زد میں زندگی کا نظام
ہر اک عمل کا مقدر ہے ایک ردِ عمل

ہر ایک صبح کی تقدیر میں لکھی ہے شام
ہر ایک مظہر فطرت ہے، آدمی کا رفیق
ہر ایک لوح پہ کندہ ہے آدمی کا نام
یہ شرق و غرب، سفید و سیاہ، پست و بلند
ہر ایک فرق سے بالا ہے، آدمی کا مقام

☆☆

پھر وہ نئی نسل کو نصیحت کرتے ہیں:

تمھیں زمین پہ رہنا ہے آسماں کی طرح
سمیٹنا ہے ہر اک غم کو اپنے دامن میں
کشادہ ظرفیِ قلبِ پیمبراں کی طرح
یہ رہ گزر جو بچھی ہے تمھارے قدموں میں
بصد خلوص کسی نیک میزباں کی طرح
اسی وطن کی عطا ہے اسی وطن کا کرم
جنم دیا ہے تمھیں جس نے ایک ماں کی طرح

زمین حمایت صاحب کی نظر میں ''ماں'' کی طرح محترم اور ماں کی طرح مقدس اور ماں کی طرح سب سے بڑی سچائی ہے۔

''آئینہ در آئینہ'' کو بھی طویل نظموں میں شمار کیا جائے گا۔ یہ تین ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل ہے مگر چوں کہ حمایت صاحب کی خود نوشت ہے۔ سوانح حیات ہے اور اردو شاعری میں پہلی مثال کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے اس کا جائزہ ایک الگ باب میں لیا جائے گا۔

تثلیث یا ثلاثی

(مختصر ترین صنفِ سخن)

حمایت علی شاعر نے جہاں ''بنگال سے کوریا تک'' اور آئینہ در آئینہ جیسی طویل نظمیں لکھی ہیں وہاں

مختصر ترین اصناف سخن میں بھی اپنا ہنر دکھایا ہے۔ رباعیات، قطعات، غزلیں اور ہم جانتے ہیں کہ غزل کا ایک شعر دنیا میں سب سے مختصر پیمانہ اظہار ہے صرف دو مصرعوں میں بڑی سے بڑی بات، بڑے سے بڑا خیال سمیٹ لیا جاتا ہے۔ لیکن حمایت علی شاعر کے حیرت طراز ذہن نے ''سخن کا اس سے بھی مختصر قرینہ اپنایا۔ یعنی ''ایک مصرعہ۔ ایک نظم'' ان کے پہلے مجموعۂ کلام ''آگ میں پھول'' کے پہلے ایڈیشن (۱۹۵۶ء) میں (صفحہ ۱۱۹) پر ''عوام'' کے عنوان سے ایک مصرعہ دیا ہوا ہے۔

''رات سورج کو نگل سکتی ہے تاروں کو نہیں''

یہ مصرعہ ایک بڑی صداقت کا آئینہ دار ہے۔ سورج بھی روشنی کی علامت ہے اور تارے بھی۔ لیکن رات میں سورج نہیں ہوتا اور تارے چمکتے رہتے ہیں اندھیرا ان کا کچھ نہیں بگاڑ پاتا اندھیرا جتنا زیادہ ہوتا ہے وہ اتنے ہی چمکتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ''عوام'' ناقابل تسخیر ہوتے ہیں۔ میں نے جب حمایت صاحب سے ان کی ایسی نظموں کے حوالے سے گفتگو کی تو انھوں نے بتایا کہ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۵ء کے درمیان ''ایک مصرعہ۔۔ایک نظم'' کا سلسلہ شروع کیا تھا جو ''ادب لطیف'' (لاہور) اور دوسرے رسالوں میں شائع ہوتا رہا۔ پھر انھوں نے اپنے مقالات اور مباحث کا ایک مجموعہ جو ''شخص و عکس'' (۱۹۸۴ء) کے نام سے ہے مجھے دکھایا۔ اس کتاب کے حصہ مباحث ''ترکیہ'' کے صفحہ (۳۰۷) پر تین نظمیں ''ایک مصرعہ ایک نظم'' کے عنوان سے (عکس کی صورت میں) موجود ہیں جو ''ادب لطیف'' کے فروری ۱۹۵۲ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھیں جس میں ''عوام'' کے علاوہ دو اور نظمیں بھی تھیں۔ ''مستقبل'' کے عنوان سے ایک مصرعہ تھا۔

''رات کی گود میں سویا ہوا مہتاب کا خواب''

اور ''دوشیزگی'' کے عنوان سے یہ مصرعہ تھا۔

نہ مسکرائے تو گلزار، مسکرائے تو پھول

ان نظموں کو پڑھ کر مجھے ان کے ذہن اور مزاج کو سمجھنے کی ایک اور راہ مل گئی۔ وہ جستجو پسند ہیں، اس لیے ہمیشہ منفرد راستہ اپنے لیے منتخب کرتے ہیں خواہ وہ کتنا ہی کٹھن کیوں نہ ہو۔ وہ تجربوں کی طرف مائل رہتے ہیں اور ہمیشہ غیر معمولی کام کرنا چاہتے ہیں۔ ان نظموں کے بارے میں انھوں نے (اسی کتاب میں) اپنے ایک جوابی مضمون ''آئینہ کیوں نہ دوں'' میں لکھا ہے۔

''ابتدائی عمر میں یہ سب مشاغل کبھی تفریحاً اور کبھی تجربے کے طور پر عمل آتے تھے میں اس دور میں

چوں کہ ''طویل نظمیں'' زیادہ لکھتا تھا اس لیے مشق کے طور پر کبھی ''مختصر ترین'' کا بھی مشغلہ رہتا تھا۔ کبھی یک رکنی غزل بھی لکھی جاتی۔

جو کرم ہے۔۔۔(فاعلاتن)

اک ستم ہے۔۔۔(فاعلاتن)

کبھی بحروں کے تجربے۔۔۔''تاک دھنا دھن'' (تین بار)

آج کی شب جیسے بھی ہو ممکن جاگتے رہنا

کوئی نہیں ہے جان کا ضامن جاگتے رہنا

کبھی تصویری علامتی نظمیں۔۔''اردو اور بابائے اردو''

''جیسے آغوش محبت میں ہمکتی ہوئی ننھی بچی''

جو پہلے ''آگ میں پھول'' کے نام سے بھی چھپ چکی ہے۔ (اس کا ذکر پچھلے باب میں آچکا ہے) اسی طرح مختصر تمثیلی نظمیں۔ ''جواب۔ اندیشہ اور بگولا'' وغیرہ۔

اس تجربہ پسندی اور جدت کی تلاش میں حمایت صاحب نے ایک صنف بھی ایجاد کر لی۔ ''مثلیث''۔ یہ تین مصرعوں کی ایسی نظم ہوتی ہے جس کا پہلا اور تیسرا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے اور دوسرا مصرعہ آزاد، لیکن تینوں مصرعے ایک بحر کے پابند ہوتے ہیں (یہ کسی بھی بحر میں لکھی جا سکتی ہے) حمایت صاحب ۱۹۶۰ء سے ایسی نظمیں لکھ رہے ہیں۔ ابتدا میں اس صنف کا کوئی نام نہیں تھا اور تین مصرعوں کی یہ نظمیں مختلف رسالوں میں شائع ہوتی تھیں۔ مثلاً ادب لطیف'' (لاہور) ''نئی قدریں'' (حیدر آباد سندھ) ''خیال'' ''کامٹی'' (انڈیا) اور ''پگڈنڈی'' (امرتسر انڈیا) وغیرہ۔ حمایت صاحب کی جو ثلاثی مشاعروں میں سب سے زیادہ مقبول ہوئی اور بعد ازاں رسائل کی زینت بنی وہ یہ تھی۔

پتھر

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت سنوار دے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت تراش لے تو یہی خدا ہے

فروری ۱۹۶۳ء میں ماہ نامہ ''نئی قدریں'' (حیدر آباد سندھ) کے سال نامے میں حمایت صاحب

نے پہلی بار ایسی نظموں کو ایک صنفی نام دیا ''تثلیث''، اور اس حوالے سے انھوں نے لکھا کہ۔

''میرے خیال میں مختصر ترین نظم تین مصرعوں ہی پر مشتمل ہو سکتی ہے۔ اس لیے میں نے اس نئی صنف کا نام (مذہبی نظریے سے قطع نظر) ''مثلث'' کی رعایت سے ''تثلیث'' مناسب سمجھا۔''

اس عنوان کے تحت رسالے میں ان کی چھ نظمیں شائع ہوئی تھیں۔ ''شاعری پیغمبری''، ''پتھر''، ''دوام''، ''لاحاصل''، ''رفاقت''، ''بیگانگی''۔ پھر مختلف رسائل میں ان کی ''تثلیثات'' چھپتی رہیں۔ جون ۱۹۶۳ء کے ''الشجاع'' (کراچی) میں ہندوستان کے ایک نقاد اثر فاروقی نے ''تثلیث'' کے بارے میں ایک مضمون لکھا اور ان سے بہتر توقعات وابستہ کیں۔ لیکن ساتھ ہی انھوں نے ایک مشورہ بھی دیا۔

''حمایت علی شاعر کے اس تجربے کو مذہبی عقیدے ''تثلیث'' سے محفوظ رکھنے کے لیے رباعی کے وزن پر اسے ''ثلاثی'' بھی کہا جا سکتا ہے''۔ حمایت صاحب نے فاروقی صاحب کی تجویز کو ادب کے بڑے اہل قلم کے سامنے پیش کیا۔ علامہ نیاز فتح پوری، جعفر علی خاں اثر لکھنوی اور احمد ندیم قاسمی جیسے بزرگوں کو خطوط لکھے اور ان کی رائے طلب کی۔ نیاز فتح پوری اور اثر لکھنوی نے اس تجربے اور نام کو بہت پسند کیا اور احمد ندیم قاسمی صاحب نے اپنے رسالے ''فنون'' میں پہلی بار حمایت صاحب کی ''تثلیثات'' کو ''ثلاثی'' کے نام سے شائع کیا۔ یہ غالباً ۱۹۶۳ء یا ۱۹۶۴ء کی بات ہے۔ یہاں دل چسپ پہلو یہ ہے کہ اثر فاروقی کا مضمون چھپتے ہی ''الشجاع'' میں مختلف حضرات نے مخالفت شروع کر دی۔ مخالفین میں سرفہرست محسن بھوپالی کا نام تھا۔ انھوں نے یہاں تک لکھ دیا کہ ''ادب کے قاری کو اردو میں ایسی بہت سی نظمیں مل جائیں گی جو اس طرح کہے ہوئے بندوں پر مشتمل ہیں۔ مثال کے طور پر ظہیر کاشمیری کی نظم ''شکستِ زنداں'' اسی فارم میں کہی گئی ہے۔ میری ایک نظم ''عشرت یک لحہ'' بھی انھی خطوط پر کہی گئی ہے۔ ممکن ہے حمایت علی شاعر ان نظموں سے متاثر ہوئے ہوں اور طوالت سے گریز کرتے ہوئے ''ایک ہی بند'' پر نظم ختم کر دینے میں انھیں جدت نظر آئی ہو۔''

پھر انھوں نے ''ہائیکو'' اور قمر جمیل کا حوالہ دیا اور سلیم احمد سے گواہی مانگی۔ سلیم احمد خاموش رہے تو ''الشجاع'' میں مراسلہ بازی شروع ہو گئی۔ جن میں دلوں کی جلن صاف نمایاں تھی۔ حمایت صاحب نے کسی کا جواب نہیں دیا البتہ ''الشجاع'' کے ایڈیٹر سلمان الارشد کے نام ایک خط میں

معترض کو بتایا کہ ''تین مصرعوں کے بند والی نظمیں بہت سے شعرا نے کہی ہیں۔ خود میری اپنی کئی ایسی نظمیں برسوں پہلے چھپ چکی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسی کوئی بات نہیں جس کا حوالہ دینا ضروری ہو''۔

حمایت صاحب نے اپنی کسی نظم کا حوالہ نہیں دیا تھا لیکن ادب کے سنجیدہ قاری جانتے ہیں کہ ان کی کچھ نظمیں اسی فارم میں ہیں مثلاً:

۱۔ ''فسادات کی رات'' (مطبوعہ ۱۹۴۹ء)

۲۔ ''کوجے'' (۱۹۵۱ء) یہ دونوں نظمیں ان کے پہلے مجموعۂ کلام ''آگ میں پھول'' (۱۹۵۶ء) میں شامل ہیں۔

۳۔ ''شاید کہ بہار آئی'' (حصہ اول) جو پہلے ''ماہِ نو'' (کراچی) کے فروری ۵۶ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی پھر ''ٹھہرا ہوا لمحہ'' کے عنوان سے ''ادب لطیف'' (لاہور) اکتوبر ۱۹۵۶ء میں چھپی۔

۴۔ ''ایک منظر، ایک سوچ'' (مطبوعہ ''صبا'' حیدر آباد دکن۔ جولائی، اگست ۱۹۵۹ء)

یہ نظم ڈاکٹر وزیر آغا نے ''۱۹۵۹ء کی بہترین نظمیں'' میں بھی منتخب کی تھی۔ ''ٹھہرا ہوا لمحہ'' اور ''ایک منظر ایک سوچ'' (منظر اور پس منظر کے عنوان سے) حمایت صاحب کے دوسرے مجموعہ کلام ''مٹی کا قرض'' (۱۹۷۴ء) میں بھی موجود ہیں۔ محسن بھوپالی نے اپنی جس نظم کا حوالہ یہاں دیا ہے وہ ''نئی قدریں'' (حیدر آباد سندھ) میں جون ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی تھی لیکن ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ (شاید اس قابل نہ سمجھا ہو) ''ٹھہرا ہوا لمحہ'' کے بعد ''عشرت یک لحہ'' یہ ثبوت بھی فراہم کرتی ہے کہ خود انھوں نے حمایت صاحب کی نظم سے اثر قبول کیا اور یہ نظم لکھ دی۔ حمایت صاحب نے حقیقت جانتے ہوئے بھی چشم پوشی کی اور اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے اسی خط میں ''ثلاثی'' کے محرکات بیان کر دیے۔ ''ثلاثی کی محرک نہ ''ہائیکو'' ہے نہ ظہیر کاشمیری کی ''شکست زنداں'' اور نہ میرے بعد میں آنے والے کسی ''نومشق شاعر'' کی کوئی نظم۔ ''ثلاثی'' کا خیال میرے دل میں رباعی سے پیدا ہوا۔ رباعی ہماری سب سے مختصر اور شاید سب سے مشکل صنف ہے یہی وجہ ہے کہ بہت کم شعرا نے اس پر طبع آزمائی کی ہے (اس کی وجہ چند مخصوص بحروں کی پابندی بھی ہے) غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ اکثر رباعیوں میں دوسرا مصرعہ اضافی ہوتا ہے اور محض ہیئت کی پابندی کی خاطر لکھا جاتا ہے۔ میں نے سوچا اگر پہلا مصرعہ ہی ہر طرح مکمل ہو تو دوسرے

مصرعے کا احسان نہیں اٹھانا پڑے گا اور خیال بھی کم سے کم الفاظ میں سمٹ آئے گا۔ اس طرح میں نے اپنے تئیں الفاظ کی ''فضول خرچی'' سے دامن بچانے کی کوشش کی ہے اور ان مصرعوں کو ان بحروں کا پابند نہیں رکھا جو رباعی کے لیے مخصوص ہیں۔ ہیئت میں اس تھوڑی سی تبدیلی سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ بحروں کے انتخاب میں شاعر کو آزادی مل گئی اور دوسرا یہ کہ ایک مختصر ترین صنف سخن وجود میں آئی جس میں خیال کو اور بھی احتیاط کے ساتھ نظم کرنے کی ذمہ داری شاعر پر عائد ہوتی ہے۔''

ثلاثی کے اس فارم کو بھی اہل نظر نے قبول کیا۔ بیشتر ادیب شاعر اور ناقدین نے اس صنف کو ''فطری تخلیق'' سے تعبیر کیا اور شاعر صاحب کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ حضرت راغب مراد آبادی نے نہ صرف اردو بلکہ پنجابی میں بھی ''ثلاثیاں'' لکھی ہیں۔ ان کے پنجابی کلام ''تاریاں دی لو'' میں بائیس (۲۲) ثلاثیاں ہیں جن کا آغاز اس ثلاثی سے ہوتا ہے۔

ثلاثی دا موجد

ثلاثی اردو وچ ایجاد اوہدی
حمایت علی جنھوں کہندے نیں شاعر
وسے دل چ پنجاب دی یاد اوہدی

اسی طرح ایک رباعی میں بھی انھوں نے حمایت صاحب کی تعریف کی ہے۔ یاد رہے کہ راغب صاحب فی البدیہہ منظوم اظہار خیال میں اپنی مثال آپ ہیں۔

رُباعی ملاحظہ فرمائیے:

''ہارون کی آواز'' سے کیوں دل نہ ہو شاد
شاعر کی طبیعت ہے معانی ایجاد
لیلائے غزل کے بھی سنوارے خدو خال
اور صنف ''ثلاثی'' کی بھی رکھی بنیاد

اسی طرح چند اور شعرا نے بھی حمایت صاحب کو اشعار میں داد دی ہے۔ مگر کچھ ایسے بھی ہیں جو حمایت صاحب کی پیروی میں ثلاثیاں تو لکھ رہے ہیں مگر اپنے تین مصرعوں کو کچھ اور نام دیتے ہیں:

۱۔ کراچی کے ایک بزرگ شاعر حنیف اسعدی نے ذرا سے تصرف سے کام لیا اور اپنے تینوں

مصرعوں کو قافیہ کا پابند کر دیا۔ اس صنف کو وہ ''سہ مصرعی'' کہتے ہیں۔ (حنیف اسعدی اب مرحوم ہو چکے ہیں)

۲۔ انڈیا کے شاعر قمر اقبال نے ''تثلیاں'' کے نام سے ۱۹۸۱ء میں ایک مجموعہ کلام شائع کیا اور اپنے تین مصرعوں کو (ثلاثی کے پہلے نام) ''تثلیث'' ہی کہنے پر اصرار کیا (قمر اقبال بھی اب مرحوم ہو چکے ہیں)

۳۔ ہندوستان کے مشہور فلم ڈائریکٹر اور نغمہ نگار گلزار اپنے تین مصرعوں کو ''ترویٰنی'' کہتے ہیں اور تینوں مصرعوں کو قافیہ ردیف کا پابند نہیں رکھتے۔

۴۔ ہندوستان ہی کے ایک شاعر نعیم صبا نویدی نے ''ترسیلے'' کے نام سے ایک مجموعہ شائع کیا اور اس صنف کا نام بھی شاید ''ترسیلے'' ہی رکھا ہے۔

۵۔ ہندوستان میں ایک شاعر صابر زاہد بھی ہیں وہ اپنے تین مصرعوں کو ''مثلثے'' کہتے ہیں۔

۶۔ پاکستان کے ایک شاعر ساحل احمد بھی تین ہم قافیہ مصرعوں کو ''مثلث'' کے نام سے فروغ دینے کی سعی میں مصروف ہیں۔ (اردو ادب کی مختصر تاریخ۔ صفحہ ۵۳۶۔ مصنف ڈاکٹر انور سدید)

۷۔ ہندوستان میں کچھ شاعر ''ترائیلے'' کے نام سے تین مصرعے لکھتے ہیں۔ (شاید انھیں نہیں معلوم کہ ''ترائیلے'' فرانسیسی زبان کی صنف سخن ہے۔ جو آٹھ مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس میں صرف ایک مصرعہ تین بار دہرایا جاتا ہے۔)

۸۔ ایک مزاح نگار شاعر نے اسے ''تپائی'' کا نام دے رکھا ہے۔

۹۔ حیدر آباد سندھ سے ایک شاعر ''ظافر تشنہ'' کا ۲۰۰۳ء میں ایک نعتیہ دیوان ''کجری'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں ''تین مصرعوں'' پر مشتمل مختلف عنوانات سے کئی نعتیں شامل ہیں۔ (انھیں شاید یہ نہیں معلوم کہ ''کجری'' پوربی زبان کا ایک لوک گیت ہے جو شمالی ہند میں بہت مقبول ہے۔) مشہور شاعر دامق جونپوری بھی ''کجریاں'' لکھتے تھے۔ ان کی خود نوشت سوانح حیات ''گفتنی ناگفتنی'' (مطبوعہ ۱۹۹۳ء) میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

۱۰۔ لندن کے ایک شاعر انور شیخ نے اپنی ایک شعری صنف کا نام ''تکونی'' رکھا تو لندن ہی کے ایک نقاد محمود ہاشمی نے اس کا رشتہ ''ثلاثی'' سے ملا دیا۔ حالاں کہ یہ صنف تین مصرعوں کے بجائے تین بندوں پر مشتمل ہوتی ہے اور ہر بند میں چار چار شعر ہوتے ہیں مگر ہمارے نقاد نے شاید اس کا

صرف نام پڑھا کلام نہیں دیکھا۔ ''نقاد'' جو ٹھہرے۔ ۱۱۔ مناظر عاشق ہرگانوی جو پہلے گلزار کے دیے ہوئے نام ''ترویٰنی'' کو اپنا چکے تھے اب اپنے تین آزاد مصرعوں کو ''سہہ لگی'' کا نام دے چکے ہیں (بحوالہ منظوم رسالہ ''شاعری'' اپریل ۲۰۰۰ء کراچی)۔

آیئے اب جاپانی صنف سخن ''ہائیکو'' اور پنجابی لوک گیت ''ماہیا'' کی طرف۔ ''ہائیکو'' ۵۔۷۔۵ سلے بلز (دو حرفی لفظ) میں لکھی جاتی ہے اس کے تینوں مصرعے آزاد ہوتے ہیں اور ''ماہیا'' ڈیڑھ مصرعی صنف سخن ہے۔ مگر اکثر شعرا الاعلمی کی بنیاد پر دونوں کو ''ثلاثی'' کے انداز میں لکھتے ہیں۔ یا من مانے انداز میں چھوٹے بڑے مصرعے لکھ دیتے ہیں۔ پنجاب کے اردو شعرا بھی ''ماہیا'' کی تکنیک سے واقف نہیں تھے۔ انھوں نے چراغ حسن حسرت کے ماہیوں کی پیروی کی لیکن وہ درست نہیں تھی۔

باغوں میں پڑے جھولے
تم بھول گئے ہم کو
ہم تم کو نہیں بھولے

یہ ماہیے حسرت صاحب نے موسیقار برکت علی خاں کی خاطر لکھے تھے۔ چند شعرا نے البتہ درست ماہیے لکھے ہیں۔ جن میں ساحر لدھیانوی کا نام بھی شامل ہے۔

دل لے کے صدا دیں گے
یار ہیں مطلب کے
یہ دیں گے تو کیا دیں گے

بعد ازاں حیدر قریشی اور دوسرے صاحب علم شعرا نے ماہیا کی تکنیک پر مختلف مضامین لکھے اور لوگوں کی غلط فہمی دور کی چناں چہ اب بڑی حد تک درست ماہیے لکھے جا رہے ہیں۔ پنجابی زبان و ادب کے کئی ماہرین بھی اب یہ بتا چکے ہیں کہ ''ماہیا'' ڈیڑھ مصرعی صنف سخن ہے۔ ان اہل قلم میں پروفیسر شارب، افضل پرویز، ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار اور ڈاکٹر سرفراز حسین قاضی کے نام سرفہرست ہیں۔ ''ہائیکو'' اور ''ماہیا'' کی تکنیک نہ جاننے کے سبب جو خلفشار پیدا ہوا ہے اسے دیکھتے ہوئے بعض شعرا، خاقان خاور اور اقبال نجمی وغیرہ نے اپنے تین مصرعوں کو کوئی نام نہیں دیا اور نہ کسی ہیئت کی پابندی کی۔ محمود ہاشمی ''ثلاثی'' کے بارے میں اپنے ایک ادبی جائزے ''آنے والے دور کی

دھندلی سی تصویر'' میں لکھتے ہیں ''حمایت علی شاعر نے تین مصرعوں کی مختصر نظم ''ثلاثی'' بھی ہمارے ادب کو دی۔ لیکن وہ پنجابی کے ''ماہیا'' اور جاپانی ''ہائیکو'' سے گڈمڈ ہو کر رہ گئیں۔ علاوہ ازیں ہندوستانی شاعر گلزار کی ''ترویٰنی'' اور برطانیہ میں مقیم شاعر انور شیخ کی ''تکونی'' نے ان کی ثلاثی'' کی جدت کی اہمیت کو دھندلا دیا'' انھوں نے حمایت صاحب کی منظوم سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے مگر اس انداز میں۔

''خود نوشت سوانح حیات کے سلسلے میں حمایت علی شاعر کی ''منظوم خود نوشت'' ہمارے یہاں ایک نئی اور انوکھی پیشکش ہے۔ ان کی یہ خود نوشت اگر مستقبل کے قاری تک پہنچی تو کیا وہ سیدھے سبھاؤ اس کے بنیادی موضوع ''آپ بیتی'' پر توجہ دے گا یا سوچنے لگے گا کہ اس کے متقدمین کے پاس نئے نئے تجربات کرنے کے لیے کتنا وافر وقت تھا؟''

اس انداز تحریر کے بارے میں بھلا کیا کہا جا سکتا ہے۔ ''جو چاہے آپ کا ''علم کرشمہ ساز'' کرے۔'' لیکن دراصل ان باتوں کا فیصلہ وقت ہی کرتا ہے کوئی ''ابن الوقت'' نہیں۔ جہاں تک ''ثلاثی'' کے بحیثیت ایک نئی صنف برقرار رہنے اور مستقبل میں اس کے قائم بالذات ہونے کا تعلق ہے، وقت نے اس کے لیے خود ہی راہیں ہموار کر دی ہیں۔ وہ ''ثلاثی نما اصناف'' جو لاعلمی کے سبب یا کسی اور جذبے سے وجود میں لائی گئی تھیں، اپنے شعرا کی ذات تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ اب ہر تین مصرعوں والی نظم کو ''ثلاثی'' ہی کے پیمانے سے جانچا جاتا ہے۔ ''ثلاثی'' کی مقبولیت کو کم کرنے کی ایک اور صاحب نے بھی کوشش کی تھی، نقوی احمد پوری۔ انھوں نے ''ثلاثی''[۲] کو ایک ''جنسی علامت'' قرار دے دیا اور کسی پیر صاحب کی کسی کتاب کا عکس بھی اقدار نمبر ۱۰ میں چھپوا دیا۔ تاکہ اسے صنف ادب کے طور پر اپناتے ہوئے لوگ شرمائیں۔ لیکن مشہور شاعر[۳] پروفیسر ساقی جاوید نے ایک مستند عربی لغت سے نہ صرف اس کے لغوی معنی دے دیے بلکہ اس کے مرادی معنی کی تمام شقوں کی تفصیل بھی فراہم کر دی تھی۔ (میری کتاب ''مثلیث یا ثلاثی'' میں بھی کتابوں کے متعلقہ حصوں کا عکس اپنے اپنے مقام پر دے دیا گیا ہے) ''ثلاثی'' کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ سلیم احمد کا دوسرا مجموعۂ کلام ''اکائی'' جو ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ''ثلاثی'' کے انداز میں لکھی ہوئی نظموں کو سلیم احمد نے تو کوئی نام نہیں دیا تھا لیکن ان کے انتقال کے بعد ۱۹۸۷ء میں لاہور سے رسالہ ''روایت'' کا ''سلیم احمد نمبر'' شائع ہوا تو اس میں رسالے کے مرتبین محمد سہیل عمر اور جمال پانی

پتی نے جو کہ سلیم احمد مرحوم کے قریبی دوست ہوا کرتے تھے، ان کی ان نظموں کو ''ثلاثی'' ہی کے عنوان سے شائع کر دیا۔ ثلاثی کے بارے میں ایک اور انکشاف بھی سامنے آیا ہے حمایت صاحب کہتے ہیں ''ایک دن وہ، ادیب سہیل اور بنگلہ دیش سے آئے ہوئے ایک صحافی دوست، زین العابدین ماہ نامہ ''افکار'' کے دفتر میں بیٹھے تھے کہ قتیل شفائی کی مختصر نظمیں بذریعہ ڈاک صہبا صاحب کو ملیں۔ عنوان تھا ''بے نام سخن پارے'' یہ رباعی کی بحر میں پانچ پانچ مصرعوں پر مشتمل تھیں۔ صہبا لکھنوی نے کہا ان نظموں کو کیا نام دیا جا سکتا ہے۔ حمایت صاحب نے کہا ''خماسی۔ مخمس کی رعایت سے''۔ میں سمجھتی ہوں کہ ان کے ذہن میں ''ثلاثی'' کی وجہ تسمیہ موجود تھی سب کو یہ نام پسند آیا اور صہبا صاحب نے مارچ ۱۹۸۸ء میں ''خماسی'' کے عنوان سے یہ بے نام سخن پارے شائع کر دیے۔ (حمایت صاحب نے قتیل شفائی کو اس سلسلے میں ایک خط بھی لکھ دیا تھا۔)

پھر ستمبر ۱۹۸۸ء میں ''افکار'' میں قتیل شفائی کی چند خماسیوں کے ساتھ الیاس عشقی کا ایک خط بھی شائع ہوا جس میں انھوں نے انکشاف کیا کہ ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ ایران میں رباعی پر اس قسم کے تجربے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کسی شاعر کا نام اور کوئی مثال تو نہیں پیش کی، بس پنجگانہ، شش گانہ اور ہفت گانہ کے حوالے دیئے۔ ساتھ میں یہ بھی لکھا کہ ''ہمارے ہاں جو لوگ ''ثلاثی'' لکھتے ہیں وہ اس لیے ''ثلاثی'' نہیں کہلائی جا سکتی کہ اس تجربے کو پہلے ہی ''ثلاثی'' کا نام دیا جا چکا ہے چناں چہ ''ثلاثی'' تین مصرعوں کی وہ نظم ہے جو ''رباعی کے وزن'' پر ہو۔'' حمایت صاحب کے لیے یہ ایک بڑا انکشاف تھا، جس کے بارے میں کسی نے اب تک ایسی بات نہیں کی تھی۔ صرف علامہ نیاز فتح پوری نے ''شعر العجم'' دیکھنے کی ہدایت کی تھی۔ سو انھوں نے اس کی تمام جلدیں دیکھ لی تھیں لیکن بقول حمایت صاحب انھیں کہیں بھی یہ لفظ نہیں مل سکا۔ پھر انھوں نے فارسی کے مختلف اساتذہ اور شعرائے کرام حضور احمد سلیم، انور مسعود، حسین انجم اور راغب مراد آبادی سے بھی دریافت کیا، سب نے لاعلمی ظاہر کی تھی۔ الیاس عشقی صاحب کو بھی خط لکھا مگر انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ایک دن ماہ نامہ ''دائرے'' (کراچی) ستمبر ۱۹۸۹ء کے شمارے میں عشقی صاحب کا ایک مضمون ''اصناف سخن کا معاملہ'' نظر سے گزرا۔ جس میں انھوں نے دوہے، رباعی، اور ثلاثی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا اور ثلاثی کے لیے یہ بھی فرمایا کہ پہلے اس قسم کی مختصر نظموں کو ''ثلیث'' کا نام دیا گیا تھا، وہ اس لیے مناسب تھا کہ اس نام سے کوئی صنف موجود نہیں تھی۔

الیاس عشقی صاحب نے ''دائرے'' والے مضمون میں ایران کے ایک شاعر ''آئیتی'' کی ایک ''ثلاثی'' اور دوسرے شاعر افسر کی ''خماسی'' اور ایک ''سداسی'' تحریر کی تھی۔ حمایت صاحب اس وقت سندھ یونیورسٹی سے ریٹائر ہو چکے تھے ایک دن انھیں پروفیسر ڈاکٹر نجم الاسلام کا خط ملا جس میں ڈاکٹر محمد اسحاق کی ایک کتاب کا تذکرہ تھا، جو کلکتہ سے شائع ہوئی تھی اس کتاب میں ''آئیتی'' سے متعلق کچھ معلومات بھی فراہم کی گئی تھیں۔ اسی دوران حمایت صاحب کا ہندوستان جانا ہوا، کلکتہ بھی گئے، جہاں ف۔س۔ اعجاز اور شانتی رنجن بھٹا چاریہ سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے اس کتاب کا ذکر کیا۔ چناں چہ بھٹا چاریہ نے مغربی بنگال اردو اکادمی کی لائبریری سے نکلوا کر ایک کتاب دی، جس کا نام ''دی ماڈرن پرشین پوئٹری'' تھا۔ یہ ۱۹۴۳ء میں کلکتہ میں شائع ہوئی تھی جو ڈاکٹر اسحاق کا پی ایچ ڈی کا مقالہ تھا۔ حمایت صاحب نے اس کی فوٹو کاپی بنوالی۔ بعد میں نجم الاسلام صاحب نے ایک ملاقات میں بتایا کہ یہی کتاب انھوں نے الیاس عشقی صاحب کے پاس بھی دیکھی تھی۔ ''آئیتی'' کا اصل نام عبدالحسین تھا۔ الیاس عشقی کے مضمون میں وہی اشعار نقل کیے گئے تھے جو ڈاکٹر اسحاق نے اپنی کتاب میں دیئے تھے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ صنف آئیتی کی ذات تک ہی محدود رہی۔

حمایت صاحب کا کہنا ہے کہ انھوں نے جامعہ عثمانیہ (حیدر آباد دکن۔ آندھرا پردیش) کی پروفیسر ڈاکٹر رضیہ اکبر کی کتاب ''ایران میں جدید فارسی ادب کے پچاس سال'' (مطبوعہ اگست ۱۹۹۱ء) بھی دیکھی جس میں ۱۹۰۰ء سے ۱۹۵۰ء تک جدید فارسی شعری ادب کا ذکر ہے۔ آئیتی کا تذکرہ اس میں بھی کہیں نہیں ملا۔ حالاں کہ جن کتابوں سے رضیہ اکبر نے استفادہ کیا ان میں ''کتابات'' کے تحت ڈاکٹر اسحاق کی بھی دو کتابیں شامل ہیں۔ ایک تو یہی کتاب جن کا ذکر کیا گیا دوسری ''سخنورانِ ایران عصر حاضر''۔

ڈاکٹر محمد اسحاق اور الیاس عشقی نے ''آئیتی'' کی جو ''ثلاثی'' مثال کے طور پر پیش کی تھی وہ یہ ہے۔

یار بدت اے کاش بدی ہم چو سراب
او نیست سراب وہست چوں آتش و آب
کت باغ بسوزد و کند خانہ خراب

حمایت صاحب نے مجھے بتایا کہ میری بیگم معراج نسیم کے انتقال پر الیاس عشقی کا ایک تعزیتی خط آیا

تھا (ہم ریڈیو پاکستان حیدرآباد میں برسوں ایک ساتھ کام کرتے رہے ہیں) جس میں اپنی کتاب ''دوہا ہزاری'' کی اشاعت کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بھی اطلاع دی تھی کہ انھوں نے سندھ پر میری کسی ''مشہور نظم'' کو ''دوہے'' کی درست بحر میں ڈھال دیا ہے۔

میں نے جوابی خط میں تعزیت پر ان کا شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ سندھ پر میری کوئی ایسی نظم نہیں ہے، آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ دوسری بات یہ لکھی کہ بہتر ہوتا کہ آپ جمیل الدین عالی یا ''دوہے'' کے سلسلے میں ان کے کسی مقلد کے ''دوہے نما کلام'' کی اصلاح کر دیتے۔

مجھ پہ نہ احسان کرتے تو یہ احساں ہوتا

کیوں کہ میں نے کبھی ''دوہا'' لکھا ہی نہیں۔

اس کے بعد عشقی صاحب اور حمایت صاحب کے درمیان جو خط و کتابت رہی حمایت صاحب کی اجازت سے میں نے وہ اپنی کتاب ''تثلیث یا ثلاثی'' میں تاریخی حوالوں کے ساتھ شائع کر دی۔

حمایت علی شاعر بہت صبر و تحمل کے ساتھ کام کرتے ہیں، وہ ''کاتا اور لے دوڑی'' کے قائل نہیں۔ انھوں نے بے شمار

ثلاثیاں کہی ہیں لیکن آج تک مجموعہ نہیں چھپوایا۔ یہ امر حقیقت ہے کہ انھوں نے جو کام بھی کیا اس میں اپنی انفرادیت کو مدنظر رکھا، لیکن شاید یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ کسی کے اچھے کام کو سراہنے کے بجائے ہم اس میں رکاوٹیں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہرحال ''ثلاثی'' کے حوالے سے بھی بحث و مباحثہ کا ایک طویل سلسلہ رہا ہے چناں چہ ان تمام متنازعہ تحریروں کو میں نے اپنی کتاب ''تثلیث یا ثلاثی'' (مطبوعہ ۲۰۰۵ء) میں محفوظ کر دیا۔ اور فیصلہ اہلِ نظر پر چھوڑ دیا ہے۔

☆☆

آئینہ در آئینہ

(منظوم سوانح حیات)

''آئینہ در آئینہ'' حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت سوانح حیات ہے۔ کتاب کا تفصیلی جائزہ لینے سے قبل ہمارے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ حمایت صاحب سے قبل اردو میں کون کون سی ''منظوم خودنوشت آپ بیتیاں'' منظرِ عام پر آ چکی ہیں تاکہ ان کی روشنی میں ''آئینہ در آئینہ'' کا

جائزہ لیا جا سکے۔

یہاں سب سے پہلے محترم شفیع عقیل کی اس تحریر کا حوالہ دوں گی جو مذکورہ خودنوشت[1] پر بطور تبصرہ شائع ہوئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ اردو میں پہلی باقاعدہ سوانح حیات ہے۔ باقاعدہ میں نے اس لیے لکھا کہ بعض قدیم شعرا نے اپنی مثنویوں میں اپنی سوانح منظوم کی ہے۔ ۱۹۶۴ء میں ''الزبیر'' بھاولپور میں اردو کے معروف محقق مشفق خواجہ کا ''منظوم آپ بیتیوں'' کے بارے میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں واجد علی شاہ اختر کی منظوم خودنوشت ''حزن اختر'' کا تذکرہ ہے جو (۱۲۵۰) اشعار پر مشتمل ہے۔ اور اس میں شاعر نے صرف اپنی اسیری کے حالات اور واقعات قلم بند کیے ہیں۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''حزن اختر'' پہلی منظوم خودنوشت ہے لیکن واضح رہے کہ واجد علی شاہ ۱۸۶۴ء میں بے دخل کیے گئے اور ۱۸۷۶ء میں انتقال کر گئے۔ مشفق خواجہ کے مضمون سے کچھ اور نام بھی ملے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

محمد علی شوق اورنگ آبادی ۱۷۹۹ء (چہار درویش، قلمی مخزونہ، انجمن ترقی اردو۔ تصنیف ۱۲۱۴ اور ۱۲۱۵ھ)

شاہ حسین حقیقت۔ ۱۸۱۰ء (ہشت گلزار صفحہ نمبر ۴ مطبوعہ ۱۲۶۷ھ تصنیف ۱۲۲۵ھ)

اعزاز الدین نامی مستقیم جنگ ارکانی ۱۸۱۷ء (گنج قدرت (محفوظ) مصنفہ ۱۲۳۳ء مکتوبہ ۱۲۶۶ء)

سائل ارکائی ۱۸۳۴ء (مخلوط قصہ اگرگل۔ مصنفہ سائل ور ۱۲۵۰ھ)

یہ وہ تحریریں ہیں جو پچھلے دو سو برسوں میں مثنوی کی بحر میں لکھی گئیں اور اپنے مصنف کے کسی نہ کسی دور کا آئینہ دکھاتی ہیں۔ ان کے علاوہ مثنوی ''فریاد داغ'' ہے جس میں داغ دہلوی نے ''منی بائی حجاب'' سے اپنے عشق کی داستان قلمبند کی ہے اس کے علاوہ ''قول غمی'' مومن خان مومن کی مثنوی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بھی ان کی داستان عشق ہے۔ مزید برآں منیر شکوہ آبادی نے بھی ایک دو سفرنامے لکھے ہیں۔ یہ تمام تحریریں اہم ضرور ہیں لیکن ان میں سوانح حیات جزوی طور پر ہی قلم بند کی گئی ہے۔ موجودہ دور میں سلیم احمد کی کتاب ''مشرق'' میں بھی آپ بیتی کا کچھ عنصر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی بھی تحریر کو آپ بیتی کے خانہ میں نہیں رکھا جا سکتا۔ مثلاً ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی طویل آزاد نظم ''آدھی صدی کے بعد'' کو بھی منظوم آپ بیتی کا نام دیا ہے۔ اس نظم میں

زندگی کے نشیب و فراز کو مختلف علامتوں کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔ پہاڑ سے پھوٹنے والے جھرنے سے لے کر میدان میں دریا ہو جانے اور سمندر میں ڈوب جانے کی حد تک زندگی کی عکاسی اس انداز سے کی گئی ہے جسے کسی کا بھی ''احوال واقعی'' تو قرار دیا جا سکتا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کی نجی زندگی سے لے کر ان کے عہد کی سماجی اور ادبی زندگی تک کے واقعات کہیں نہیں ملتے۔ بہر حال یہ فیصلہ ناقدین ہی کریں گے کہ ایسی نظموں کو سوانح کہا جائے یا نہیں۔ محترم علی سردار جعفری نے بھی یہ کوشش کی تھی کہ منظوم خودنوشت سوانح تحریر کریں، چناں چہ انھوں نے ''نومبر میرا گہوارہ'' کے عنوان سے اپنے بچپن کے کچھ واقعات آزاد نظم کی صورت میں لکھے ہیں لیکن پھر وہ اسے مکمل نہ کر سکے۔

جن دنوں حمایت صاحب کی سوانح ماہ نامہ ''افکار'' میں قسط وار شائع ہو رہی تھی، ''آسماں محراب'' کے نام سے شمس الرحمٰن فاروقی کی ایک کتاب الٰہ آباد سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں غالباً اسی نام سے آزاد نظم کی شکل میں ایک نامکمل نظم موجود ہے جسے انھوں نے بھی سوانح حیات کا نام دیا ہے۔ مگر یہ سوانح بھی علامتی انداز لیے ہوئے ہے۔ جہاں تک میرا محدود علم ہے، ان نظموں کے علاوہ دور حاضر میں کسی شاعر کی کوئی نظم متذکرہ عنوان سے نہیں ملتی اور بقول شفیع عقیل یا خود شمس الرحمٰن فاروقی ''آئینہ در آئینہ'' ہی ایک باضابطہ منظوم سوانح حیات کی تعریف میں آتی ہے۔ اس تمام تمہیدی لیکن ضروری گفتگو کے بعد میں ''آئینہ در آئینہ'' کی طرف آتی ہوں۔

حمایت صاحب نے اپنی آپ بیتی مثنوی کے انداز میں نہیں بلکہ ایک پابند نظم کے طور پر تحریر کی ہے۔ جس میں ہر شعر مطلع کی صورت میں ہے۔ یہ پوری نظم تقریباً ساڑھے تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور ستمبر ۱۹۹۹ء میں (قسط اکاون کے آخر میں) ''یار زندہ صحبت باقی'' لکھ کر اسے ختم کیا گیا۔ حمایت صاحب کے اس جملے سے یہ امید بندھتی ہے کہ وہ آیندہ بھی کچھ لکھیں گے لیکن تاریخی حوالے سے یہ ایک مکمل آپ بیتی ہے اور آیندہ جو بھی واقعات پیش کیے جائیں گے وہ اس کا ضمنی حصہ ہوں گے۔ اس طویل خودنوشت میں ندرت کا ایک پہلو یہ ہے کہ حمایت صاحب کی شاعری کے ابتدائی دور سے لے کر اب تک جتنے بھی پہلو سامنے آئے ہیں یعنی ذاتی جذبات و احساسات سے لے کر ملکی اور قومی مسائل تک، جو بھی افکار انھوں نے مختلف ''منظومات'' کی صورت میں پیش کیے ہیں، وہ بھی سوانح کے مختلف ادوار میں شامل کر لیے گئے اس طرح ان کے شعری ارتقاء کا ایک

گراف بھی سامنے آ جاتا ہے۔ دوسرے ہر دور کی وہ سچائیاں جو اس دور کے اہلِ قلم کی توجہ کا مرکز رہیں اور معرضِ تحریر میں آتی گئیں۔ اس لیے یہ ایک تاریخی نظم بھی ہے۔ مصنف نے اس نظم کا آغاز اپنے آبائی وطن اورنگ آباد کے تاریخی پس منظر سے کیا ہے اور اپنے اجداد سے لے کر اپنے والد اور والدہ مرحومہ کے حوالے سے جو بھی سنی ہوئی باتیں اپنی یادداشت میں محفوظ رکھی تھیں، انھیں افسانوی اور شاعرانہ پیرائے میں پیش کر دیا۔ حمایت صاحب کی والدہ کا انتقال اس وقت ہوا، جب وہ صرف تین برس کے تھے اس لیے وہ اس حقیقت کو صرف افسانوی انداز میں ہی بیان کر سکتے تھے اور جو کچھ اس عمر کے بچے کے ذہن میں شعوری اور لاشعوری طور پر محفوظ رہ سکتا تھا اسے بڑے قرینے سے انھوں نے نظم کر دیا ہے۔ البتہ اُن واقعات کا ذکر زیادہ تفصیل سے کیا ہے جو شعوری طور پر ان کی یادداشت کا حصہ ہیں۔ نثر میں جو سانحات ہمارے مطالعے میں آتے ہیں اس میں تو ہر واقعے کا ذکر تفصیلاً ہوتا ہے لیکن نظم میں چوں کہ اختصار مقصود ہوتا ہے اس لیے شاعر ان واقعات کا ذکر کرتا ہے جو بہت ہی اہم ہوتے ہیں۔ حمایت صاحب نے اپنی عمر کی ابتدائی منزلوں سے یہ سفر شروع کیا اور موجودہ دور تک آتے آتے وہ جن راستوں سے گزرے، جن مسائل سے نبرد آزما رہے، جن خوشیوں اور غموں سے دوچار ہوئے ان سب کا شاعرانہ انداز میں ذکر کرتے ہوئے، بیشتر تاریخی حوالے بھی دیئے ہیں۔ اکثر شخصیات اور ان دوستوں کے نام بھی بتائے ہیں جو ان کی زندگی پر اثر انداز ہوتے رہے۔ یا ان کی ذہنی و شخصی تعمیر میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔ انھوں نے اپنے افکار کا تجزیہ کرتے ہوئے مختلف ادوار کا جائزہ بھی لیا ہے۔ اکثر واقعات کے تاریخی حوالے یعنی سن اور مقامات بھی ان کی سوانح میں نظر آتے ہیں۔ بالخصوص پاکستان میں انھوں نے جیسی بھی زندگی گزاری اور جن حالات کا سامنا کیا ہے اس کا ہمیں تاریخ وار علم ہوتا ہے اور ہمارے ملک میں سماجی، سیاسی اور معاشی طور پر جو بھی مدارج آئے ہیں اور ترقی و تنزلی کے جتنے بھی پہلو نمایاں ہوئے وہ سب کے سب اس سوانح حیات میں موجود ہیں عموماً ہوتا یہ ہے کہ اپنی آپ بیتی لکھنے والا بعض صداقتیں بیان کرنے سے بہ وجوہ گریز کرتا ہے۔ ممکن ہے حمایت صاحب نے بھی دور اندیشی کی بناء پر، یا کسی کی دل شکنی کے خیال سے یا پھر اپنی ''فطری احتیاط پسندی'' کے نتیجے میں بعض واقعات سے گریز کیا ہو (یہ میرا خیال ہے) لیکن ''خودنوشت کے بعض حصے ان کی زندگی کے کمزور لمحات کے بھی گواہ ہیں۔ شاعر کے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے

کلام کے بین السطور میں بھی سچائیاں لکھ جاتا ہے اور چوں کہ شاعری میں اشاروں اور کنایوں میں حقیقت بیان کی جاتی ہے اس لیے بعض اوقات بے خطر ہو کر شاعر وہ بھی لکھ جاتا ہے جو شاید نثر میں نہ لکھا جا سکے اور ایسی چیزیں اکثر شعرا کے کلام میں شہ پاروں کے طور پر موجود ہوتی ہیں کیوں کہ وہ ان لمحوں کی سچی ترجمان ہوتی ہیں۔ حمایت صاحب کے کلام میں بھی ایسی نظمیں اور غزلیں میری نگاہ سے گزری ہیں جو ان مخصوص لمحوں کی گواہی دے سکیں۔ سو وہ نظمیں ''ایک عہد کا سچ'' بن کر ہمیں بہت سی حقیقتوں سے آشنا کراتی ہیں۔ ایسی نظموں میں ''جذباتی نظمیں''، ''سیاسی نظمیں'' اور بعض معاشرتی موضوعات پر لکھی گئی نظمیں شامل ہیں۔ اس سوانح حیات کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ حمایت صاحب نے وہ مسرتیں یا وہ کیفیات جو انھیں زندگی میں پہلی بار عطا ہوئیں انھیں بھی بڑے قرینے سے لکھ دیا ہے۔ وہ موضوعات خواہ محبت کے جذبے سے تعلق رکھتے ہوں یا وہ کسی بڑی خوشی کے حصول سے متعلق ہوں انھوں نے تمام تر نازک محسوسات و جذبات کی عکاسی بڑے خوب صورت انداز سے کی ہے۔

حمایت صاحب کی زندگی بڑے نشیب و فراز سے گزری ہے ہے وہ حقیقتاً سیلف میڈ انسان اور سیلف میڈ شاعر ہیں۔ بیشتر تارکین وطن کی طرح انھوں نے یہاں کسی کلیم کی معرفت حکومت پاکستان سے کچھ حاصل نہیں کیا۔ صرف اس لیے کہ وہ اگر یہاں سے کچھ حاصل کر لیتے ہیں تو اس کا اثر ہندوستان میں موجود ان کی دوسری والدہ اور بہن بھائیوں پر پڑتا اور یہ حمایت صاحب کو کسی صورت منظور نہ تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی کی ابتدا اپنے پیروں سے چل کر کی یہ سوانح اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی بنانے میں کسی کا سہارا نہیں لیا۔ انھوں نے ۱۹۵۱ء میں پاکستان ہجرت کی تھی اور اس وقت وہ صرف میٹرک پاس تھے لیکن عملی زندگی میں قدم رکھ چکے تھے۔ اور وہ صاحب اولاد بھی ہو چکے تھے۔ ان تمام باتوں سے یہ اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہیں ہے کہ ان ذمہ داریوں کے ساتھ زندگی کو سنوارنا، خود کو اعلیٰ تعلیم یافتہ بنانا اور اپنے آٹھ بچوں کو بھی اعلیٰ تعلیم سے نواز کر تمام مسائل سے سبکدوشی تک حمایت صاحب نے کس قدر محنت کی ہو گی۔ جو لوگ حمایت صاحب کو جانتے ہیں وہ گواہی دیں گے کہ یہ سوانح حیات حمایت صاحب کی زندگی کے ان تمام پہلوؤں کا بھی احاطہ کرتی ہے۔ حمایت صاحب نے ریڈیو، فلم، ٹیلی ویژن، صحافت اور تدریس ہر شعبے میں کام کیا ہے وہ مشکل سے مشکل مراحل میں بھی ثابت قدم رہے۔

ان کے ہم عصروں میں کچھ لوگ ان کی راہ میں رکاوٹیں بھی کھڑی کرتے رہے اور جیسا کہ ہمارے معاشرے کا انداز ہے کہ لوگ خواہ مخواہ ایک دوسرے سے حسد کرنے لگتے ہیں حمایت صاحب کو ایسے دوست نما دشمنوں سے بھی نمٹنا پڑا۔ اس کتاب میں ایسے تمام واقعات کا جزوی طور پر حوالہ ملتا ہے اور ان کی اس دور کی کہی ہوئی غزلیں اور نظمیں ان کے مخصوص احساسات اور جذبات کا آئینہ دکھاتی ہیں لیکن مجموعی طور پر نہ صرف میں بلکہ حمایت صاحب کے تمام جاننے والے اس بات کی گواہی دیں گے کہ وہ ایک کامیاب انسان ہیں۔ انھوں نے بڑی پامردی سے ہر مشکل کا مقابلہ کیا ہے اور سرخ رو ہوئے۔ حمایت صاحب نے زندگی سے جو چوکھی لڑائی لڑی ہے، یہ کتاب اس کی گواہ ہے۔

انھوں نے بلا تکلف ہر اس دور کا ذکر کر دیا ہے جس کے بارے میں لوگ بتانا پسند نہیں کرتے یا پھر چھپانا ضروری سمجھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی انتہائی غربت کو بھی نہیں چھپایا جب وہ قائداعظم کے مزار کے اطراف میں بنی ہوئی جھونپڑیوں میں مقیم تھے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی محنت اور صلاحیت کے سبب ایسے مقام پر آ گئے جسے دولت کی ریل پیل کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب انھوں نے فلم لائن اختیار کی اور بے شمار فلموں کے نغمات لکھے، کہانیاں تحریر کیں، اسکرین پلے لکھے اور فلمیں پروڈیوس بھی کیں اور ڈائریکٹ بھی کیں اور ان کی فلمیں باکس آفس پر ہٹ بھی ہوئیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ مالی اعتبار سے ان کا وہ زمانہ روشن ترین زمانہ تھا لیکن پھر ان کا یہ احساس کہ کہیں ان کی فلمی زندگی اُن کے بچوں کے آڑے نہ آ جائے وہ اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں فلم انڈسٹری کو خیر باد کہہ کر سندھ یونیورسٹی سے بحیثیت استاد وابستہ ہو گئے، اس دوران ان کا وسیلۂ آمدنی یونی ورسٹی کے علاوہ صرف ریڈیو اور ٹی وی تھا۔ ٹی وی پر حمایت صاحب نے بڑے علمی و تحقیقی پروگرام سلسلہ وار پیش کیے اور ہم سب جانتے ہیں کہ وہ تمام پروگرام اپنی نوعیت کے اعتبار سے کتنے اہم رہے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک صاحب علم انسان کس طرح اپنی زندگی کو سنوارتا سمیٹتا آگے بڑھتا ہے یہ ہمیں ''آئینہ در آئینہ'' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کا ایک حصہ ''حرف حرف روشنی'' کے عنوان سے ایک طویل نظم کی شکل میں ہے جو ان کے بچوں کے نام ہے لیکن یہ نظم ہر اس گھرانے کو متوجہ کرتی ہے جو ترکِ وطن کر کے پاکستان میں آباد ہوا اور مختلف مسائل کا شکار ہوا۔ اس نظم میں نئی نسل کو جو نصیحت کی گئی ہے وہ شاعر کی وسیع النظری کی دلیل ہے۔

یہ نصیحت ایک ایسا شاعر و ادیب ہی کر سکتا تھا جو تاریخ و تہذیب کا شعور رکھتا ہو، جسے اپنے وطن سے پیار ہو، یوں بھی حمایت صاحب قدرے مختلف شاعر ہیں ان کی عام نظموں میں بھی ان کا وہ شعور جھلکتا ہے جو ایک صاحب علم کشادہ ظرف اور ترقی پسند خیالات رکھنے والے شاعر میں ہوتا ہے۔

کتاب کے آخر میں حمایت صاحب نے ایک اشاریہ بھی مرتب کیا ہے جو تقریباً پچاس صفحات پر محیط ہے اور اس میں تاریخ وار وہ تمام تفصیلات جمع کر دی ہیں جو ان کی زندگی اور پاکستان کی تاریخ مرتب کرتی ہیں۔

میرے خیال میں یہ کتاب ایک ایسی سوانح حیات ہے جسے نہ صرف اپنی خصوصیات کی بناء پر اردو شاعری کی بے مثال سوانح حیات کہا جا سکتا ہے بلکہ منظوم ہونے کے سبب اولیت کا درجہ بھی دیا جائے گا۔ یہ کتاب ہمیں یہ بتاتی ہے کہ ایک شاعر یا فن کار ایک بڑا اور ذمہ دار انسان بھی ہو سکتا ہے۔ شعرا میں ایسی مثالیں موجود ہیں جو بلاشبہ سماجی اعتبار
سے بھی بڑی اہمیت کے مالک ہیں وہ علامہ اقبال ہوں یا جوش اور فیض، جمیل الدین عالی، احمد ندیم قاسمی ہوں یا حمایت علی شاعر۔ یہ سب شعرا اپنے اپنے مقام پر بڑے انسان بھی ہوئے، وہ اپنی تعمیر نو کے ساتھ ساتھ اپنی نسلوں کی طرف بھی متوجہ رہے اور ہر وہ فرض انجام دیا جو بحیثیت باپ یا بحیثیت گھر کے بزرگ کے ان پر عائد ہوتا تھا۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے بچے بھی اعلیٰ تعلیم سے فیض یاب ہوئے اور اپنی اپنی جگہ سب باعزت طور پر زندگی گزار رہے ہیں۔ حمایت صاحب کہتے ہیں:

بس ایک کام کیا میں نے زندگی بھر میں
تمام بچے ہیں تعلیم یافتہ گھر میں

اس شعر سے ان کی شخصیت کے جس پہلو پر روشنی پڑتی ہے یہ سوانح اس کا عکس دکھائی دیتی ہے۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد اور ایسی شان دار تخلیق پر حمایت صاحب مبارک باد کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

باب سوم

شاعر کی نثر نگاری

(افسانہ نگاری)

حمایت علی شاعر کی وجہ شہرت شاعری ہے لیکن ان کے مختلف انٹرویوز اور بعض مضامین کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ان کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔ اس سلسلے میں خود انھوں نے ایک دلچسپ واقعہ بھی بیان کیا ہے:

''یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں نویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ ایک بار مولانا صلاح الدین احمد کے رسالہ ''ادبی دنیا'' (لاہور) میں کتابوں کی ایک فہرست شائع ہوئی کہ چند مہینوں میں قیمتیں بڑھنے والی ہیں اور فی الحال یہ کتابیں پرانی قیمتوں پر دستیاب ہیں۔ لہٰذا اہلِ ذوق حضرات فوراً منگوا لیں۔

میں نے سب سے کم قیمت کی کتاب تلاش کی، ایک کتاب پر نظر رُک گئی۔ ''آتش پارے'' قیمت ایک روپیہ اور مصنف کا نام تھا سعادت حسن منٹو، میرے لیے یہ نام اجنبی تھا۔ کتاب کے نام سے شاعری کا گمان ہو رہا تھا، اس زمانے میں ''جگر پارے'' اور ''برق پارے'' قسم کے شعری مجموعے چھپتے تھے۔ میں نے فوراً آرڈر دے دیا، کچھ دنوں میں بذریعہ وی پی کتاب بھی آ گئی بے صبری سے سرورق دیکھا... ایک کتاب کی سطروں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اور انھیں چنگاریوں سے جلی حروف میں لکھا تھا ''آتش پارے''... طبیعت خوش ہو گئی۔ سرِورق اُلٹا، کتاب افسانوں کا مجموعہ تھی۔ کچھ حیرت، کچھ مسرت کے ساتھ پھر ورق اُلٹا، انتساب والدہ مرحومہ کے نام تھا۔ مصنف سے ایک تعلق پیدا ہو گیا، ہمارا غم مشترک تھا۔ اس کے بعد دیباچہ جو صرف ایک سطری تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے:

''یہ افسانے دبی ہوئی چنگاریاں ہیں۔ انھیں شعلوں میں تبدیل کرنا پڑھنے والوں کا کام ہے۔''

اس جملے نے مجھ پر جادو کا اثر کیا، خود پر اعتماد پیدا ہو گیا۔ افسانے پڑھنے شروع کر دیے اور جوں جوں پڑھتا رہا منٹو صاحب مجھے اچھے لگتے گئے۔ میں نے بڑی بے چینی سے پہلا افسانہ پڑھنا شروع کیا۔ ''خونی تھوک'' جس میں ایک گورا ایک ریلوے قلی کے سینے پر ٹھوکر مارتا ہے۔ ٹرین چل پڑتی ہے اور قلی غصّے میں اس کے منہ پر تھوک دیتا ہے وہ تھوک خون آلود تھا۔ اس افسانے نے میرے دل میں برطانوی سامراج کے خلاف نفرت کے جذبات کو اور بھی بھڑکا دیا۔

دوسرا افسانہ تھا ''انقلاب پسند'' اس افسانے میں ایک باغی نوجوان کا کردار پیش کیا گیا تھا، اس میں مجھے اپنی شباہت نظر آئی۔ یعنی روایتی یکسانیت سے بیزاری، تبدیلی کی خواہش، جوشیلے جذبات اور کچھ ایسی حرکات جنھیں غیر معمولی کہا جا سکتا ہے... میں یہ کتاب جیسے جیسے پڑھتا جاتا ویسے ویسے منٹو صاحب مجھے اچھے لگتے جاتے۔ انھی افسانوں میں ایک افسانہ ''چوری'' بھی تھا۔ جس میں مصنف نے ایک دکان سے کتاب چراتے ہوئے پکڑے جانے کا واقعہ بیان کیا تھا لیکن اس میں ندامت کے بجائے غربت کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا۔ میرے ساتھ بھی ایک بار ایسا واقعہ پیش آ چکا تھا۔ چوں کہ وہ دکان دار میرے والد کا جاننے والا تھا اس لیے میں خوف زدہ تھا ورنہ جذبات میرے بھی وہی تھے جو منٹو صاحب کے تھے۔''

حمایت صاحب، سعادت حسن منٹو سے متاثر ہو کر افسانہ نگار بنے اور پھر ''کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے'' کے مصداق، بعد میں شاعری کو اپنا ذریعۂ اظہار بنا لیا۔ لیکن فی الحال ان کے افسانے میرے پیش نظر ہیں۔ انھیں پڑھتے ہوئے میں محسوس کر رہی ہوں کہ وہ شاعر ہو کر بھی بنیادی طور پر افسانہ نگار ہی ہیں۔ انھوں نے بیشتر افسانوی نظمیں لکھی ہیں ''بنگال سے کوریا تک''، ''شعلۂ بے دود''، ''ادھوری کہانی'' اور ''آئینہ در آئینہ'' یہ سب افسانے ہی تو ہیں۔ افسانہ نگاری کے لیے جو فضا درکار ہوتی ہے وہ فضا ان کی زندگی اور ان کے آبائی شہر نے انھیں فراہم کر دی تھی۔ انھوں نے اپنی منظوم خود نوشت سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' میں یہ بھی انکشاف کیا کہ ان کا آبائی شہر اورنگ آباد ایک بڑا تاریخی شہر ہونے کے باوجود ریاست (حیدر آباد دکن) کا بہت ہی غریب شہر تھا۔ وہاں سے کوئی اخبار نکلتا تھا نہ رسالہ، وہ اور ان کے ہم جماعت، قلمی رسالے نکالتے تھے۔ (یہ بات اس وقت کی ہے جب وہ ہائی اسکول کے طالب علم تھے) اس حوالے سے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

یہ اک عظیم ریاست کا شہر تھا لیکن — بڑی عظیم روایت کا شہر تھا لیکن
یہاں پہ کچھ نہ تھا بوڑھی عمارتوں کے سوا — غریب لوگوں کی بھولی عبادتوں کے سوا
نہ علم و فن کی کوئی درس گاہ اعلیٰ تھی — نہ کوئی لائبریری علم کا حوالہ تھی
کوئی رسالہ نہ اخبار ہی نکلتا تھا — سنی سنائی پہ لوگوں کا کام چلتا تھا
تمام شہر میں اک انٹر آرٹس کالج تھا — نہ ہسپتال نہ کوئی بڑا معالج تھا
سوائے ''بلدہ'' کوئی مرکز علوم نہ تھا — ہمارا شہر بجز ''شہر زاغ و بوم'' نہ تھا
ہمارے قلمی رسائل تھے ''جگنو'' و ''شاہین'' — ہم اپنے شوق کی کرتے کسی طرح تسکین

حمایت صاحب نے اپنے ایک مضمون میں اپنے قلمی رسالے ''شرارہ'' کا بھی ذکر کیا ہے۔ میں نے اسے نہیں دیکھا البتہ ان کے کتب خانے میں میری نظر سے ''جگنو'' کے کچھ شمارے گزرے ہیں اور انھیں میں، میں نے حمایت صاحب کے چند افسانے بھی پڑھے۔ ایک افسانہ ''غریب'' اور دوسرا افسانہ ''آزادی'' بالترتیب فروری ۱۳۵۳ف اور اردی ''بہشت'' ۱۳۵۳ف (مطابق ۱۹۴۴ء) کے شماروں میں میر حمایت علی کے نام سے شائع ہوئے تھے۔

حمایت صاحب کا پہلا مطبوعہ افسانہ ''فلسفہ اور حقیقت'' ہے جو عثمانیہ انٹرمیڈیٹ آرٹس کالج اورنگ آباد کے رسالے ''نورس'' میں ''حمایت تراب'' کے نام سے ۱۹۴۵ء میں چھپا تھا۔ (آذر تا اسفند اور ۱۳۵۵ف مطابق ستمبر تا دسمبر ۱۹۴۵ء)

افسانہ ''فلسفہ اور حقیقت'' سے اقتباس۔ (حمایت تراب متعلم دہم)

''جانتے ہو پرویز، چند روز کے بعد میں بیاہی جا رہی ہوں لیکن ایک دوسرے گھرانے میں۔ ایک دوسرے ماحول میں، اتنی رات گئے چوری چوری تم سے ملاقات کا مقصد یہی تھا کہ اپنے مستقبل کی بھیانک زندگی کا نقشہ تمھارے سامنے پیش کر دوں۔ تم سے مدد چاہوں یا الوداع کی گزارش... لیکن جب میں نے تمھاری فلسفہ طرازی دیکھی تو نہ پوچھو میرے دل پہ کتنی بجلیاں گر گئیں۔''

''غزالہ'' پرویز نے فلسفیانہ نیند سے چونک کر کہا۔ ''تم یہ کیا کہہ رہی ہو غزالہ! میں اس جدائی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ میری دنیا کو تاریک نہ بناؤ، مجھے تم سے محبت ہے۔ میں تمھیں نہیں چھوڑ سکتا۔''

پرویز نے غزالہ کا دامن تھام لیا۔ ضخیم کتابوں میں کھویا ہوا یہ فلسفی آج جدائی کے ہیبت ناک تصور

سے مغلوب ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''مجھے جانے دیجیے۔ ورنہ میں کہیں کی نہ رہوں گی۔ ماں باپ کے پرانے خیالات نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔''

غزالہ نے جذبات کو ضبط کے گھونٹ پلاتے ہوئے کہا۔

''غزالہ... ہم کہیں اور جا بسیں گے، تم تعلیم یافتہ ہو۔ کیا میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتیں۔'' پرویز کی آنکھیں مایوسی سے بے نور ہو گئی تھیں۔

''والدین کی عزت کا خیال... میں مجبور ہوں پرویز، بات طے پا چکی ہے۔'' مشرق کی جانب سے کالے کالے مہیب بادل سر اٹھائے آ رہے تھے۔ ایک لمحے بعد چاند ان مہیب بادلوں میں روپوش ہو گیا۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔'' اس افسانے کو پڑھ کر پہلا تاثر یہ قائم ہوتا ہے کہ وہ اسی عمر سے تصورات اور حقیقت کے درمیان کسی قدر مشترک کی تلاش میں تھے۔

حمایت صاحب کی رغبت اشتراکیت کی جانب بھی نظر آتی ہے۔ جس عمر میں انھوں نے افسانے لکھے، عام نوجوان اس عمر میں رومانی کہانیاں لکھتے ہیں مگر ان کے کسی افسانے میں یہ عنصر نظر نہیں آتا۔ ان کا ایک افسانہ کامریڈ افتخار کی گرفتاری پر ''تاج کے زیر سایہ'' کے عنوان سے ہفتہ وار نظام (ممبئی) کے ۱۷ر نومبر ۱۹۴۶ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس افسانے میں کرداروں کے نام فرضی رکھے گئے تھے۔ افتخار کی بجائے انتشار اور اورنگ آباد کی بجائے مراد آباد رکھا گیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ریاست کا سیاسی ماحول کیسا تھا اور لوگ کتنے خوف زدہ تھے؟

افسانہ ''تاج کے زیر سایہ'' سے اقتباس:

''آج صبح سے شہر میں لاشیں گھوم رہی ہیں... زندہ لاشیں، پھٹے پرانے کفن اوڑھی ہوئیں۔ وہ شام تک گھومتی رہیں۔ دوپہر کی چلچلاتی دھوپ کی بھی انھوں نے پروا نہیں کی... نکیرین، ملوں کی قبروں میں اُن سے کیا کیا سوال کریں گے؟ انھوں نے اس پر سوچا تک نہیں۔ سوالات کے جوابات نہ دینے پر اُن پر کتنے کوڑے برسائے جائیں گے؟ انھوں نے اس کا بھی خیال نہیں کیا۔ آج لاشوں نے بغاوت کر دی تھی۔ ملوں کی قبروں کے نکیرین سے... حکومت کے خداؤں سے۔ وہ نعرے لگا رہی تھیں، چیخ چیخ کر نعرے لگا رہی تھیں۔

''کامریڈ انتشار کو چھوڑ دو۔''

''کامریڈ خادم کو چھوڑ دو۔''

مگر دنیاوی خداوند تو کیا آسمانوں نے بھی ان کی ایک نہ سنی، سنتے ہیں اکثریت ہمیشہ غالب رہتی ہے۔ خواہ اُن کے مطالبات غلط ہی کیوں نہ ہوں۔ مگر یہاں غلبہ تو کیا اُن کا دباؤ تک کسی پر نہ پڑا...

لاکھ چیخو کہ چلاؤ طاقت کے کان بہرے ہیں۔ مگر طاقتوروں سے کہہ دو کہ یہی بندۂ مزدور سکندر بنے گا۔ انھیں کے پیٹ کی آگ میں جھلسے ہوئے جسموں کے سروں پر تاج رکھا جائے گا اور تاج بھی وہ نہیں جو ''کشکول گدائی'' ہے بلکہ انسانیت کا تاج۔ آدمیت کا تاج۔''

یہ افسانہ ان بدلتے ہوئے رجحانات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے جو ریاست میں بادشاہت کے زیر سایہ جاگیرداری اور زمین داری کے خلاف عام لوگوں میں پیدا ہو رہے تھے۔ حمایت صاحب کی زندگی، نوجوانی ہی میں سیاست سے اُلجھ گئی تھی۔ مگر ان کا ذہن علم و آگہی کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہا۔ اپنی اس ذہنی کیفیت کا نقشہ بھی انھوں نے اپنے اشعار میں کھینچا ہے:

کبھی ہو جوش کی، مخدوم کی، مجاز کی بات
کبھی نگار کی بجنیں، کبھی نیاز کی بات
کبھی ہو فیض کے راشد کے اختراع کی بات
کبھی ہو عصمتِ چغتائی کے دفاع کی بات
کبھی ہو منٹو، کبھی میرا جی پہ ہو تکرار
کبھی ہوں بحث میں مجروح و ساحر و سردار
کبھی ہو کرشن، کبھی بیدی و ندیم کی بات
کبھی فراق کی مجنوں کی اور کلیم کی بات
کبھی ہو اختر و سجاد و احتشام کی بات
کبھی ترقی پسندوں کے پیش امام کی بات
کبھی فرائڈ، کبھی کارل مارکس کی باتیں
کبھی قدیم ادب پر ہزار صلواتیں
کوئی ہو فکر کا موضوع، بحث کرتے ہیں
ہر اک مقام سے بے خوف ہم گزرتے تھے

یہ قیامِ پاکستان سے پہلے کا زمانہ ہے۔ سارے ہندوستان میں آزادی کی تحریک زور و شور سے جاری تھی اور مسلم لیگ کے پرچم تلے ملک کی تقسیم کا غلغلہ تھا۔

بٹ کے رہے گا ہندوستان
لے کے رہیں گے پاکستان

لیکن حیدرآباد دکن میں سوچ کا انداز مختلف تھا وہاں کے لوگ ایک آزاد ریاست کا خواب دیکھ رہے تھے۔ حمایت علی شاعر شعر بھی کہنے لگے تھے اس دوران ان کی جو نظمیں چھپیں وہ بھی ان کے جذبات اور ان کے فکری رجحانات کی آئینہ دار تھیں لیکن اُن کا زیادہ رجحان افسانہ نگاری کی طرف تھا۔ ہندوستان بھر میں مشہور تھا کہ حیدرآباد کے لوگ بہت خوش حال ہیں لیکن ان کا افسانہ ''غریب'' پڑھ کر ایک پس پردہ سچائی کا انکشاف ہوتا ہے کہ ریاست میں بھی غریبوں کی زندگی وہی تھی جیسی ہندوستان کے عام انسانوں کی نظر آتی ہے۔

افسانہ ''غریب'' سے اقتباس:

''بھیّا... بند کرو تمھاری کتاب... مجھ سے اب سنا نہیں جاتا۔''

میں اپنی کتاب پڑھ رہا تھا میری بہن فرزانہ پاس بیٹھی تھی۔ بہن کی چیخ سے کتاب ہاتھ سے چھوٹ گئی چہرہ فق ہو گیا مجھ پر سکتہ طاری تھا۔ لیکن میں نے بہن کو سنبھال لیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''بھیّا اب نہ پڑھو میں نہیں سن سکتی یہ افسانہ نہیں کسی کے دل کی کراہ ہے کسی کی آہ ہے۔ اس سے تمام پرانے زخم تازہ ہو جائیں گے۔''

''فرزانہ بہن! اسے نہ سنو گی، یہ اُن غریبوں کی دُکھ بھری کہانیاں ہیں جن کا خون چوس کر امیروں نے عالی شان عمارتیں بنوائیں۔ ان کے جیتے جی اُن کی ہڈیوں سے فاسفورس نکالنی چاہی۔ میں اپنی کتابوں کو ایسی ہی دُکھ بھری کہانیوں سے بھر دوں گا تا کہ آنے والی نسلیں اپنی حقیقت سے آگاہ ہوں۔''

اس افسانے کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے جب ''آزادی'' پڑھا تو شوکت تھانوی کی ''سودیشی ریل'' کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ شوکت صاحب نے صرف ایک پہلو کا مذاق اُڑایا تھا اور حمایت صاحب نے زندگی کے ہر شعبے کا آئینہ دکھا دیا ہے۔ آج ہم پاکستان میں ہر طرف وہی عمل دیکھتے ہیں ہر شعبۂ حیات میں زندگی بے مہار نظر آتی ہے۔ رشوت، چور بازاری، قانون شکنی، تعلیم کی بے حرمتی، اقدار کی پامالی۔ حمایت صاحب نے اپنے انداز میں یہ ساری تصویریں ۱۹۴۴ء ہی میں کھینچ کر رکھ دی تھیں۔ ظاہر ہے وہ ان کی نوجوانی کا زمانہ تھا ادب کی جانب تازہ تازہ رغبت تھی۔ جذبات پر قابو رکھنا آسان نہ تھا اس لیے اس افسانے کو ادب کے

آئینے میں دیکھنے کے بجائے صرف جذبات کے آئینے ہی میں دیکھنا چاہیے۔ ہاں اس کا فکری پس منظر یہ بتاتا ہے کہ لکھنے والا اپنی ایک سوچ بھی رکھتا ہے جو اپنے دور سے مختلف ایک الگ نگاہ رکھنے والا نوجوان ہے۔ حمایت صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ یہ افسانہ اسی دور میں دہلی کے ایک رسالے میں شائع ہوا تھا ''تاج کے زیرسایہ'' بھی ان کا قابلِ مطالعہ افسانہ ہے جس میں دو کرداروں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ دونوں ''کردار'' دو بھائی ہیں جن میں ایک انقلابی ہے اور دوسرا دیوانہ۔ انقلابی کردار جب جیل چلا جاتا ہے تو دوسرا بھائی پوچھتا ہے ''کیوں صاحب! دیوانے بھائی صاحب ہیں یا ہم؟ اماں بیمار ہیں ہمیں اُن کی دوا لانا ہے اور ایک پیسہ ہمارے پاس نہیں۔ آپ کچھ عنایت کریں گے؟''

یہاں کہانی ایک تلخ طنز میں ڈوب جاتی ہے۔ ویسے یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ ہمارے بیشتر انقلابیوں کے گھروں کا یہی حال ہے۔ اس افسانے کو پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچی کہ اگر حمایت صاحب باضابطہ مسلسل افسانے لکھتے رہتے تو وہ احمد ندیم قاسمی کی طرح ایک کامیاب افسانہ نگار بھی بن جاتے۔ ان کے بعض افسانے ممبئی کے کچھ اور رسالوں میں بھی شائع ہوئے تھے مگر وہ رسالے محفوظ نہیں رہے۔

حمایت صاحب کا ایک اور افسانہ بھی میں نے پڑھا ہے جو ہفتہ وار ''شاہد'' (ممبئی) میں ۱۹۴۸ء کے عید نمبر میں شائع ہوا تھا۔ ''شاہد'' عادل رشید نکالتے تھے (اس رسالے میں حمایت صاحب کا کلام بھی شائع ہوا ہے) میں نے حمایت صاحب کے کتب خانے میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۹ء تک کے ''شاہد'' کے کئی شمارے دیکھے ہیں۔ حمایت صاحب کا جو افسانہ شائع ہوا تھا، اس کا نام تھا ''بدلتے زاویے''۔

افسانہ ''بدلتے زاویے'' کا اقتباس:

''چچا جان، چچا جان... ہوائی جہاز'' اور پھر وہ خاموش ہو گیا اور جب اس کا چچا آنگن سے ہو کر دالان میں آیا تو رفعت بھی اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا خاموش۔ لیکن جب اس کے چچا نے اس سے وجہ پوچھی تو اُس نے ایک جملہ کچھ اس انداز سے کہا جیسے وہ بڑے ہی غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہو۔

''چچا جان۔ معلوم ہوتا ہے اللہ میاں ہوائی جہاز کو دھاگا باندھ کر ہوا میں اُڑاتے ہیں۔''

''اس وقت اس کی عمر چار برس تھی، اس کا چچا کھلکھلا کر ہنس پڑا اور اس کی ذہانت پر اس کی پیٹھ ٹھونکی اور محبت سے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ لیکن رفعت کو اس ہنسی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ متعجب پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے چچا کی صورت کو تکتا رہا... اس واقعے کو دو تین سال گزر گئے۔

(ایک اور واقعہ)

''چچا جان۔ یہ دکانیں کیوں توڑی جا رہی ہیں؟''

''بیٹا، یہ بادشاہ سلامت کا حکم ہے۔''

''بادشاہ سلامت، دکانیں کیوں تڑوا رہے ہیں ان کو غریبوں پر رحم نہیں آتا۔ کل مدن کہہ رہا تھا میرے باپو کی دکان بھی توڑ ڈالی گئی۔ میرا باپ کہتا ہے پان کا ٹوکرا لے کر گلی گلی بیچا کر... چچا جان، بادشاہ سلامت کا حکم کیوں ماننا پڑتا ہے؟''

''بیٹا، وہ ہمارے مالک ہیں اور مالک کا حکم ٹالا نہیں جاتا۔ اب تمھارے مدرسے کا وقت ہو چکا ہے بچے ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔''

''مگر چچا جان، بادشاہ سلامت ہمارے مالک کیسے؟''

اور ابھی وہ اپنا جملہ پوری طرح کہہ بھی نہ پایا تھا کہ ایک تھپڑ اس کے داہنے گال پر پڑ گیا اور ساتھ ہی اس کے چچا کی گرج دار آواز...

''خبردار، جو کبھی ایسی باتیں اپنی زبان سے نکالیں۔ گھٹنے برابر کا لونڈا ہو کر ایسی باتیں، چل دُور ہو یہاں سے، جاہل رسہ، ابھی تجھے معلوم کیا بادشاہ کہتے کسے ہیں؟ نمک حرام کہیں کا۔''

رفعت رونے لگا۔ ساتھ ہی اس کے ذہن میں ایک بات آئی اُس نے اپنی کتاب میں پڑھا تھا اے زمیں آسمان کے مالک، ساری دنیا جہان کے مالک، ساری زمین تو خدا کی ہے۔ پھر بادشاہ! بادشاہ بھی تو خدا کا بندہ ہے اور بندے پر بندے کا حکم!! بندے کا بندہ مالک!!

مولوی صاحب نے بھی کلام مجید پڑھاتے وقت کہا تھا۔

''الارض اللہ'' ساری زمین اللہ کی ہے۔

آخر چچا جان نے اس بات پر اُسے مار کیوں دیا؟

کیوں آخر؟؟

ایک انٹرویو میں وہ ''بدلتے زاویے'' کے بارے میں کہتے ہیں:

''یہ افسانہ ایک بچے کے بدلتے ہوئے ذہن کا ترجمان ہے۔''

بچے کا نام ''رفعت'' ہے جو ''حمایت'' کا ہم قافیہ ہے میرا خیال ہے یہ بچہ خود حمایت صاحب ہیں۔ اس کی تصدیق خود اُن کے مضمون ''پودے اور مسلم ضیائی'' سے ہوتی ہے جس میں وہ اپنے بچپن میں بادشاہ کے خلاف کچھ کہہ دینے پر والد کی ڈانٹ کھانے کا ذکر کرتے ہیں۔ اس افسانے میں بچہ ایسی ہی ایک بات پر اپنے چچا کا تھپڑ کھاتا ہے۔

شاعری کی طرح اُن کے افسانے بھی ان ہی کی ذات کے اطراف گھومتے ہیں۔ گورنمنٹ سروس کی وجہ سے وہ اپنے کرداروں کے فرضی نام رکھ لیتے ہیں اور ان کی معرفت اپنے عہد کی سچائیاں بیان کرتے ہیں۔ اُن کے اندر کا باغی انسان بھی مختلف قلمی ناموں سے اپنے ردِّ عمل کا اظہار کرتا رہتا ہے۔

تھے نوکری کے سبب میرے نام کچھ قلمی	میں شاعری میں تھا ''نردوش'' و ''ابن مریم'' بھی
مگر بطور صحافی بحیثیت باغی	عجیب نام تھا ''ابلیس'' وہ بھی ''فردوسی''
جو نوجوانی کے جذبات کا تھا آئینہ	اور آپ اپنے تضادات کا تھا آئینہ
مگر مجھے تو اسی ''فکرِ بندگی'' کی ادا	(جو کر گئی اسے مردود و راندۂ درگہ)
پسند اس قدر آئی کہ میرے دل نے کہا	خدا سے اس سے بڑا عشق اور کیا ہوگا
یہ انحراف بھی ہے عشق کی انا گویا	بجز خدا کسی در پر بھی اُس کا سر نہ جھکا
وگرنہ ہم تو خدا کے وہ نیک بندے ہیں	بجز خدا، ہر اک انساں کے آگے جھکتے ہیں

اپنے ایک مضمون میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''سوچ رہا ہوں کہ ابلیس کا نردوش'' اور ''ابنِ مریم'' کی معنویت سے پس پردہ کیا تعلق قائم ہو سکتا ہے اور ان ناموں سے ابلیس کے فردوسی ہونے کی کون سی دلیل فراہم ہوتی ہے۔ کہیں میرے لاشعوری محرکات میں اختر صاحب کے اقبال اور ابلیس کے بارے میں دیے ہوئے لیکچرز اور میری نکتہ آفرینی کے زاویے تو پوشیدہ نہیں تھے؟''

یہ مضمون پروفیسر حمید الدین شاہد ایڈیٹر ''سب رس'' کے نوٹ کے مطابق حمایت صاحب نے ڈربن (جنوبی افریقہ) میں لکھا تھا اور وہیں سے انھیں بھیجا تھا۔ ۱۹۸۷ء میں وہ ڈاکٹر حبیب الحق

ندوی (صدر شعبۂ اردو، فارسی، عربی ڈربن یونیورسٹی) کی دعوت پر ''یومِ غالب'' کے سلسلے میں وہاں گئے تھے، لیکچر کا عنوان تھا ''اردو غزل غالب سے فیض تک''۔

محولہ بالا افسانوں کے بعد دیر تک ان کا کوئی افسانہ نثر میں نظر نہیں آتا لیکن چوں کہ میری جستجو جاری تھی اس لیے معاً مجھے خیال آیا کہ ریڈیو کی سروس کے دوران ممکن ہے کچھ اس قسم کی تحریریں اور بھی ان کے قلم سے نکلی ہوں۔

اپنی طویل افسانوی اور تمثیلی نظموں کے مجموعے ''تشنگی کا سفر'' کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ نظمیں میں نے ۵۲ء سے ۶۳ء کے دوران لکھی تھیں یہ وہ زمانہ تھا جب میں ریڈیو پاکستان سے متعلق تھا اور بہ یک وقت کئی شعبوں میں کام کرتا تھا۔ صداکاری (اناؤنسر، کمنٹریٹر، نیوز ریڈر اور ڈراما آرٹسٹ) مسودہ نگاری (نغمات، گیت، غنائیے، ڈرامے، فیچر اور تقاریر لکھنا) پروڈکشن (مختلف پروگراموں کی پیش کش) یہ ملازمت سالانہ کنٹریکٹ کی بنیاد پر ہوتی اور جن ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کو اس زمرے میں شامل کیا جاتا انھیں ریڈیو کی اصطلاح میں ''اسٹاف آرٹسٹ کہا جاتا...''

ان حوالوں کی روشنی میں، میں نے ریڈیو پاکستان کراچی اور حیدر آباد کے بعض افسران اور فن کاروں سے معلومات حاصل کیں اور ریڈیو کے پرانے ''ریکارڈ'' دیکھے تو مجھے کچھ نایاب تحریریں ملیں۔

حمایت صاحب نے ملازمت کے دوران ''گیتوں بھری کہانیاں'' بھی لکھی تھیں۔ (حمایت علی شاعر کی ان کہانیوں کا مجموعہ بھی زیرِ طبع ہے۔ البتہ ان کے مشورے سے کچھ کہانیوں کے نام بدل دیے گئے ہیں) میرے گھرانے کے بعض بزرگ بتاتے ہیں کہ اس زمانے میں ایسی کہانیاں بڑے ذوق وشوق سے سنی جاتی تھیں کیوں کہ ان میں تین ''لطف'' ہوتے تھے۔ یعنی گانے، ڈراما اور کہانی بیان کرنے کا انداز۔

مجھے حمایت صاحب کی چھ کہانیاں ملیں جو مختلف تاریخوں میں نشر ہوئی تھیں جس میں پانچ ریڈیو پاکستان حیدر آباد سے نشر ہوئیں۔

۱۔ پتھر کے پھول (۱۸ر ستمبر ۱۹۵۹ء)

۲۔ چوٹ (۱۶ر دسمبر ۱۹۶۱ء)

۳۔ ہم کو ان سے وفا کی ہے اُمید (۲۴ر ستمبر ۱۹۶۲ء

۴۔ اُس گاؤں میں (تاریخ نشر دستیاب نہیں)

۵۔ محبت کی کہانی (تاریخ نشر دستیاب نہیں)

۶۔ ایک کہانی ''الجھی لکیریں'' ۱۸ر نومبر ۱۹۶۱ء کو کراچی سے نشر ہوئی۔

میں نے ان کہانیوں کے مسودوں کی نقول بھی ریڈیو سے حاصل کر لی ہیں۔ کراچی سے جو کہانی نشر ہوئی تھی اس میں جن گلوکاروں اور صداکاروں نے حصہ لیا تھا ان کی تفصیل بھی ریڈیو کے ریکارڈ سے مل گئی۔

''الجھی لکیریں'' کی موسیقی مشہور موسیقار نہال عبداللہ نے دی تھی اور اس کہانی کے گیتوں کی دھنیں بھی بنائی تھیں جنھیں اس وقت کے مشہور گلوکاروں مدھو الماس اور زوار حسین نے گایا تھا۔ صداکاروں میں محمد علی (فلمستار) عبدالماجد، ظفر صدیقی اور فاطمہ خانم وغیرہ شامل تھے۔ صوتی اثرات ایم اے رزاق نے دیے تھے اور اس کے پروڈیوسر تھے سیّد علی حسن جو بڑے صاحبِ علم پروڈیوسر تھے۔ ریڈیو پاکستان کے بعد وہ ادارہ ''ہمدرد'' سے منسلک ہو گئے تھے۔ سہ ماہی ''ارتقاء'' نے مارچ ۲۰۰۲ء میں ان کا ایک گوشہ بھی شائع کیا تھا۔ ان فن کاروں میں کچھ فن کار فلم، ریڈیو اور بعض دوسری حیثیتوں میں انتہائی مشہور بھی ہوئے۔ ان کہانیوں میں گیت بھی حمایت صاحب خود ہی لکھتے تھے۔ ان کے بعض گیت آج بھی مشہور ہیں اور کبھی کبھی ریڈیو سے نشر ہوتے رہتے ہیں۔

گیتوں بھری کہانیوں میں ایک کہانی سرحد کی لوک کہانی ''پتھر کے پھول'' (جلالت محبوبہ) کی بنیاد پر لکھی گئی ہے اور دوسری ''محبت کی کہانی'' بھی اسی کا ریڈیائی روپ ہے جب کہ ایک کہانی ''ہم کو ان سے وفا کی ہے اُمید'' چینی کہانی سے ماخوذ ہے۔ تین کہانیاں طبع زاد ہیں، جن میں ''الجھی لکیریں'' (نفسیاتی) ''چوٹ'' (سماجی) اور ''اس گاؤں میں'' ایک داستان نما کہانی ہے۔ ہر کہانی کا ایک الگ مزہ ہے۔ اندازِ بیان بھی بہت لطیف اور شاعرانہ ہے۔ مثال کے طور پر کہانی ''اس گاؤں میں'' جو ۱۹۵۹ء یا ۶۰ء میں نشر ہوئی تھی۔ داستان گو کی زبانی اس طرح شروع ہوتی ہے۔

(قہقہوں کی آوازیں جو مختلف گوشوں میں اُبھرتی ڈوبتی رہتی ہیں) داستان گو: ان قہقہوں کے پیچھے آنسوؤں کی ایک طویل داستان پوشیدہ ہے۔ یہ آوارہ قہقہے جو اس ویران حویلی کے شکستہ بام و در

سے اُٹھ رہے ہیں کبھی اس کے آراستہ گوشوں میں، شگفتہ پھولوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ یہ سربلند حویلی جو ندی کنارے چپ چاپ کھڑی ایک ایک گلی کوچے کو حسرت بھی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے اپنی پلکوں کی چھاؤں میں نہ جانے کتنے حسین خواب چھپائے ہوئے ہے۔ یہ اداس گاؤں، جس کے خدوخال پر ماہ وسال کی گرد پڑ چکی ہے کبھی ان پہاڑیوں کے دامن میں یوں چہکتا اور ہمکتا نظر آتا تھا جیسے کوئی معصوم خوب صورت بچہ اپنی ماں کی گود میں کھیل رہا ہو۔ یہ پہاڑیاں جو باہیں پھیلائے اب بھی کسی آنے والے وقت کی منتظر نظر آتی ہیں، کبھی اس گاؤں اور اس حویلی کے وجود پر اس طرح نازاں تھیں جیسے زندگی نے ان کی سال ہا سال کی ریاضت کا انعام دے دیا ہو۔

آیئے ذرا وقت کی گرد جھاڑ کر زندگی کے اس انعام کی چمک دمک دیکھیں۔

(موسیقی کا ایک خوش گوار لہرا)

''کتنا حسین ہے یہ گاؤں، معلوم ہوتا ہے فطرت کی دوشیزگی نکھر آئی ہے۔ شاداب درختوں کے سائے میں جگمگاتے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھر، شبنم سے دُھلی ہوئی پگڈنڈیاں، زندگی کے نشے میں چور، ہنستے کھیلتے، ناچتے، جھومتے ہوئے بھولے بھالے انسان، کنواری جوانیوں کی طرح لہراتی ہوئی ہوائیں، جھوم جھوم کر اُمڈتی ہوئی اور گرج گرج کر برستی ہوئی بدلیاں۔ چاندی سے ترشے ہوئے چاند ستارے اور سونے سے تراشا ہوا سورج، چاندنی اور دھوپ، دھوپ اور چھاؤں، دھرتی کے سینے پر اپنی موج میں گنگناتی ہوئی ندی اور ندی کنارے دلہن کی طرح سجی ہوئی رنگین حویلی۔''

حمایت صاحب کی ہر کہانی میں اندازِ بیان کی ایسی ہی خوبیاں نمایاں ہیں۔ ''اُلجھی لکیریں'' ایک نفسیاتی مسئلہ پر لکھی ہوئی کہانی ہے جو ایک ڈاکٹر، ایک پروفیسر اور دو نوجوان کرداروں کے گرد گھومتی ہے۔ اس کہانی میں ڈاکٹر اور پروفیسر کی گفتگو قابلِ مطالعہ ہے۔

''ڈاکٹر... اماں یار نفسیات کے پروفیسر ہو کر ایسی دقیانوسی باتیں کرتے ہو۔ اس میں کیا بُرائی ہے۔ اچھا ہے یہ لوگ ایک دوسرے کو زیادہ سمجھ لیں گے۔ تم جانتے ہو میں ڈاکٹر ہوں اور زندگی کے میکانکی رشتوں کا قائل ہوں۔ میرے خیال میں محبت جیسے روحانی جذبے کی بنیاد بھی ایک میکانکی عمل پر قائم ہے۔

پروفیسر (مسکراتے ہوئے) ٹھیک ہے۔ میں روح اور مادّے کے اس تعلق کو سمجھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ہر تعلق کی استواری ایک مخصوص وقت کی پابند ہوتی ہے اور وقت ہی ان فاصلوں کا تعین کرتا ہے جو مادّے اور روح کے درمیان رہتے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں فاصلوں کا تعین رفتار پر منحصر ہے۔ وقت کوئی چیز نہیں۔ آج کل تو طویل سے طویل فاصلے پلک جھپکتے میں طے ہو جاتے ہیں۔''

اندازِ بیان کا اسلوب موضوع کا پابند ہوتا ہے۔ حمایت صاحب اس نکتے کو خوب سمجھتے ہیں۔ ان کی ہر گیتوں بھری کہانی اپنے موضوع کے لحاظ سے اپنا مخصوص اسلوب لیے ہوئے نظر آتی ہے اور انھی خوبیوں کی بنا پر میرا خیال ہے کہ وہ ایک بہترین کہانی کار بھی بن جاتے اگر وہ اس فن پر سنجیدگی سے توجہ دیتے۔

جن افسانہ نگاروں کو پڑھ کر انھوں نے افسانے لکھنا شروع کیے ان میں سعادت حسن منٹو اور کرشن چندر سرفہرست ہیں۔ منٹو صاحب کی اختصار پسندی، نکتہ آفرینی، بے باک صداقت پسندی اور دل میں اُتر جانے والی نشتر زنی اردو ادب میں اپنی مثال آپ ہے۔ حمایت صاحب اس سے کیسے نہ متاثر ہوتے۔ اسی طرح کرشن چندر کی خوب صورت عبارت آرائی نے بھی انھیں اپنا اسیر کیا۔ حمایت صاحب نے خود بھی منٹو صاحب کی طرح کرشن چندر کے سحر کا بھی اقرار کیا ہے۔

تحقیقی و علمی کام

حمایت علی شاعر نثر بھی بہت عمدہ لکھتے ہیں اور شاعری کی طرح نثر کی بھی تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ نثر کے حوالے سے افسانے اور ڈراموں کے علاوہ بے شمار تنقیدی اور تحقیقی مقالے لکھے جو کتابی شکل میں منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ''شیخ ایاز''، ''شخص و عکس''، ''کھلتے کنول سے لوگ'' اور چوتھی کتاب ''کچھ پیشہ رو کچھ ہمسفر'' شیخ ایاز کے منتخب کلام کا منظوم اردو ترجمہ اردو کی معروف شاعرہ فہمیدہ ریاض نے ''حلقہ میری زنجیر کا'' کے نام سے بھی کیا ہے کتاب کا نام غالب کے اس شعر سے ماخوذ ہے۔

بس کہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے، حلقہ میری زنجیر کا

یہ شعر شیخ ایاز کی زندگی اور ان کی شخصیت کا بھی آئینہ دار ہے۔ خود سندھی کے بعض اہل قلم ان کے بارے میں مختلف انداز میں سوچتے ہیں کبھی ان کی وطن پرستی معرض بحث میں آتی ہے تو کبھی ان کے مذہبی اعتقادات۔ اردو کے اکثر لکھنے والے بھی اپنی لاعلمی کے سبب شیخ ایاز کی شاعری اور شخصیت پر مختلف اعتراضات کرتے رہے ہیں۔ اسی لیے جب فہمیدہ آپا کی کتاب پریس میں جانے لگی تو شیخ ایاز صاحب نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس کتاب کا مقدمہ حمایت صاحب تحریر کریں۔ اس کے علاوہ خود فہمیدہ آپا کی خواہش تھی کہ اس کا اشاریہ اور فرہنگ بھی حمایت صاحب ہی تحریر کریں لیکن عدیم الفرقی کے باعث وہ اس کام کو انجام نہ دے سکے۔ دراصل حمایت صاحب اور شیخ ایاز ایک دوسرے کے پرانے دوست اور رفیق ہی نہیں ہم خیال بھی ہیں۔ جب حمایت صاحب نے ۱۹۵۶ء میں حیدر آباد سے دوماہی ''شعور'' نکالا تو اس کی مجلس ادارت میں شیخ ایاز بھی شامل تھے (اس رسالے کے صرف تین شمارے شائع ہوئے) فہمیدہ ریاض کی کتاب کے لیے حمایت صاحب نے ایاز صاحب کی شخصیت پر ایک بھرپور مقالہ لکھا جو تقریباً سو صفحات پر مشتمل تھا

اس کام کی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انھوں نے اس میں شیخ ایاز کے اردو کلام کے ساتھ ان کے سندھی کلام کے تراجم بھی منتخب کر لیے اور ایک الگ کتاب ''شیخ ایاز... شخص و شاعر'' تیار کر لی۔ اس وقت اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن میرے سامنے ہے۔ حمایت صاحب نے یہ کتاب اردو اور سندھی ادیبوں اور شاعروں کے اتحاد کے نام معنون کی ہے۔ اس ایڈیشن میں ایاز صاحب سے ایک گفتگو بھی شامل ہے۔ جس سے ان کے نظریات کے کئی گوشے نمایاں ہوتے ہیں۔

دوسری کتاب ''شخص و عکس'' ان کے مختلف مضامین اور مباحث کا ضخیم مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں ان کی تنقیدی بصیرت کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے مختلف کتابوں پر تبصرے بھی کیے ہیں جو برسوں تواتر کے ساتھ ماہنامہ ''افکار'' میں شائع ہوتے رہے۔ ''شخص و عکس'' تین حصوں میں منقسم ہے۔ ''تجزیہ''، ''تبصرہ'' اور ''تزکیہ''۔ ''تجزیہ'' میں سرور بارہ بنکوی، عمر ہاشمی، سرشار صدیقی، کشور ناہید، سعید احمد اختر، سلطانہ مہر اور امجد اسلام امجد کے علاوہ شاہ عبداللطیف بھٹائی پر بھی ایک فکر انگیز مقالہ ہے۔ جبکہ ''تزکیہ'' میں وہ مباحث شامل ہیں جن میں شاعر صاحب نے اپنی تحریروں کے تاریخی ثبوت فراہم کر کے کچھ لاعلم حضرات اور جھوٹے معترضین کو مدلل جواب دیے ہیں۔

''ادب میں نظریاتی اختلافات سے فکر و نظر کے جو افق کھلتے ہیں ان سے نہ صرف امکانات کی نئی منزلوں کا سراغ ملتا ہے بلکہ نئی حقیقتیں بھی روشن ہوتی ہیں۔ لیکن وہ تعصّب جو کلبۂ ذات کے تاریک گوشوں میں جنم لیتے ہیں اور خود نمائی کی حوس میں صرف ''پگڑی'' اچھالنے کو طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں میرے خیال میں سستی شہرت طلبی کے ''بدترین'' مظاہرے ہیں ان مظاہروں کی زد میں میری تخلیقات بھی آئی ہیں..... ''شخص و عکس'' میری تنقیدی فکر اور میرے تخلیقات کے ردِ عمل میں ہونے والے مباحث کی روشنی میں میرا بھی آئینہ ہے اور اُن مخصوص چہروں کا بھی جنہوں نے شاید آج تک اپنا عکس نہیں دیکھا.....''

اس زمانے میں حمایت صاحب، سندھ یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ مذکورہ کتاب ان کے بعض طلباء کے اصرار پر مرتب کی گئی تھی اور اب یہ ایک عہد کی تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب میر تقی میر کے اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

کم ہیں شناسائے زرِ داغِ دل
اس کے پرکھنے کو نظر چاہیے

اور ختم غالب کے اس شعر پر ہوتی ہے:

حسد، سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجے
ستم، بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کیجے

حمایت صاحب نے اپنے مخالفین کا ہر محاذ پر ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے اور کامیابی ان کا مقدر ہوئی۔ شاعری ہو یا فلمی نغمہ نگاری، ریڈیو ہو یا ٹیلی ویژن، تدریس ہو یا تنقید و تحقیق ہر میدان میں ان کو ایسے کرم فرما ملتے رہے۔

حمایت صاحب دلیرانہ اپنے کام میں منہمک رہے اور ہر منزل پر سرخرو رہے۔ ان کی تیسری کتاب ''کھلتے کنول سے لوگ'' دکن کے اہل قلم کا مطالعہ ہے۔ وہاں رہنے والوں میں امجد حیدر آبادی، مخدوم محی الدین، جیلانی بانو، عزیز قیسی، قمر اقبال، اور ہجرت کرنے والوں میں بابائے اردو مولوی عبدالحق، مسلم ضیائی، ابراہیم جلیس، خواجہ حمید الدین شاہد، فضل گلبرگوی، نیاز گلبرگوی، وحیدہ نسیم، رشید شکیب اور قمر ساحری وغیرہ شامل ہیں۔ قمر ساحری حمایت صاحب کے ایک ہم عصر شاعر اور دوست تھے۔ ان کی شاعری پر ایک بھرپور تنقیدی مقالہ حمایت صاحب نے لکھا جو تقریباً پچاس صفحات پر مشتمل ہے۔ حمایت صاحب نے ایسے مقالے ان شعراء پر لکھے ہیں جن پر ناقدین نے بہت کم لکھا ہے۔ ان کا چوتھا مجموعہ ''کچھ پیش رو کچھ ہمسفر'' ہے۔ اس میں بھی حسن حمیدی کی شعری پر ایک تفصیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ عنوان ہے ''بولتی تحریروں کا شاعر''۔ اس کتاب میں ایک غیر معروف قدیم شاعر ذرہ اورنگ آبادی اور ہندوستان کے علاقے بہار کے بزرگ شاعر حمید عظیم آبادی کے ساتھ دوسرے اہم شعراء اور ادیب مثلاً نیاز فتح پوری، صبا اکبر آبادی، ظہیر کاشمیری، عبدالقوی ضیا، محشر بدایونی، آفاق صدیقی اور نکہت بریلوی وغیرہ پر بھی ان کے تاثراتی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین ہیں۔

حمایت صاحب نے سندھ یونیورسٹی سے وابستگی کے دوران شعبۂ اردو کے میگزین ''صریر خامہ'' کے دو نمبر مرتب کیے۔ ایک ''اقبال نمبر''، سن ۱۹۷۷ء میں اور دوسرا ''نعت نمبر'' سن ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔

''اقبال نمبر'' میں انھوں نے علامہ اقبال پر ایسی تحریریں جمع کروا دی تھیں جو عموماً نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔ فیض احمد فیض جب گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔اے کے طالب علم تھے تو کالج

کے میگزین ''راوی'' کے فروری ۱۹۳۳ء کے شمارے میں، علامہ اقبال پر ان کی ایک نظم شائع ہوئی تھی۔ علامہ اقبال ان دنوں حیات تھے۔ حمایت صاحب نے اس نظم کا سراغ لگایا اور لاہور جا کر کالج کی لائبریری سے میگزین حاصل کیا اور اسے ''صریر خامہ'' کی زینت بنایا۔ نظم کا پہلا اور آخری شعر درج کر رہی ہوں۔

زمانہ تھا کہ ہر فرد انتظارِ موت کرتا تھا
عمل کی آرزو باقی نہ تھی بازوئے انساں میں

اور آخری شعر یہ تھا

طلسم کن سے تیرا نغمۂ جاں سوز کیا کم ہے
کہ تو نے صد ہزار افیونوں کو مرد کر ڈالا

بارہ اشعار پر مشتمل یہ نظم فیض صاحب کے کسی بھی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ اسی طرح حیدر آباد دکن کے انقلابی شاعر مخدوم محی الدین نے بھی علامہ اقبال کی زندگی میں ان پر ایک نظم کہی تھی:

اس اندھیرے میں یہ کون آتش نوا گانے لگا
جانب مشرق اجالا سا نظر آنے لگا

نو اشعار پر مشتمل یہ نظم ان کے مجموعہ کلام ''سرخ سویرا'' میں شامل ہے۔ فیض اور مخدوم نے علامہ اقبال کے انتقال پر بھی نظمیں لکھی تھیں۔ فیض صاحب کی جو نظم گورنمنٹ کالج لاہور کے میگزین ''راوی'' کے ''اقبال نمبر'' میں شائع ہوئی وہ ان کے مجموعۂ کلام ''نقش فریادی'' میں شامل ہے۔ مخدوم محی الدین نے علامہ اقبال کے انتقال پر جو نظم لکھی وہ ان کے مجموعے ''سرخ سویرا'' میں شامل ہے۔

علامہ اقبال پر پہلا مرثیہ اکبر لاہوری نے علامہ اقبال کے جنازے کے ساتھ چلتے ہوئے مکمل کیا تھا اور بقول خود اکبر لاہوری کے ''جب شاہی مسجد کی سیڑھیوں میں علامہ اقبال کی تدفین کے بعد قبر کو مٹی دے چکے تو اس وقت یہ نظم مکمل ہو چکی تھی''، لیکن اس حوالے سے جب میں نے حمایت علی شاعر سے گفتگو کی تو انھوں نے کہا کہ ''جب میں نے ''صریر خامہ'' کا ''اقبال نمبر'' جگن ناتھ آزاد کو دیا تو انھوں نے کہا کہ علامہ اقبال کا پہلا مرثیہ ان کے والد تلوک چند محروم نے لکھا تھا۔ ان دنوں وہ راولپنڈی میں تھے۔ ریڈیو سے جیسے ہی انتقال کی خبر نشر کی گئی سارے ملک میں کہرام مچ گیا اور

ابھی جنازہ قبر تک بھی نہ پہنچا تھا کہ مخدوم صاحب نے مرثیہ مکمل کر دیا۔ یہ مرثیہ ان کی کتاب میں بھی موجود ہے۔ اور اسی دن کسی اخبار میں بھی شائع ہوا تھا''۔ ''صریر خامہ'' کے ''اقبال نمبر'' میں اکبر لاہوری کا جو مرثیہ شائع ہوا ہے اس کا پہلا شعر یہ ہے۔

آج وہ مردِ خوش بیاں چپ ہے
جس کی چپ سے بس اک جہاں چپ ہے

علامہ اقبال کے انتقال پر ڈاکٹر تصدق حسین خالد نے بھی ایک نظم لکھی تھی جو ''راوی'' کے ''اقبال نمبر'' مئی جون ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ یوں تو ان کے انتقال پر سارے ہندوستان میں لکھا گیا لیکن میں یہاں صرف ان تحریروں کا حوالہ دے رہی ہوں جو ''صریر خامہ'' کے ''اقبال نمبر'' میں حمایت صاحب نے جمع کی تھیں۔ جو مقالات اس میں شائع کیے گئے ان میں شیخ ایاز مجھے علاوہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کا مقالہ ''اقبال کے نظامِ فکر میں سائنس کا مقام'' پروفیسر علی عباس جلال پوری کا مقالہ ''اقبال اور تقابل وعقل وجدان'' اور ضمیر علی بدایونی کا مقالہ ''اقبال وجودیوں کے درمیان'' بھی شامل ہے۔ ان مقالوں کے عنوانات سے ہی ان کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس نمبر میں سندھ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء کے مقالات بھی شامل ہیں۔ بالخصوص ڈاکٹر مصطفےٰ خان کا مقالہ ''علامہ اقبال اور حضرت مجدد الف ثانی''، تعلیمی ادارے کے میگزین میں ایسے مضامین کی شمولیت میرے خیال میں حمایت صاحب کی استادانہ بصیرت ہے۔ انھوں نے اس نمبر میں ایسے اشعار اور ایسی تحریروں کا سراغ بھی دیا ہے جن سے علامہ اقبال کی شاعری نے جلا پائی۔ ان کا ایک بہت مشہور شعر ہے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اس شعر کا بنیادی خیال، دراصل کبیر داس کے اس دوہے سے ماخوذ ہے۔

کبیر، من نرمل بھیو، جوں گنگا کو نیر
پاچھے پاچھے ہری پھرے کہت کبیر کبیر

علامہ اقبال کا یہ شعر بھی بہت مشہور ہے۔

متاعِ بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

اس شعر کا خیال علامہ اقبال نے یقیناً اس تحریر سے لیا تھا۔

''اے قادرِ مطلق صداقت ازلی کو تو اپنے ہی پاس رہنے دے اور تلاشِ حق مجھے عنایت فرما، کیوں کہ تیری ذاتِ مطلق کی یہ خصوصیت ہے کہ تو مطلق حق کا مالک ہوتے ہوئے بھی حی و قیوم رہ سکتا ہے۔ مجھے اگر معرفت کلی حاصل ہوگی تو میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔ میری زندگی کا جوہر اصلی، طلب اور کوشش ہے اور وہ اسی حالت میں باقی رہ سکتی ہے کہ تلاشِ حق ہمیشہ جاری رہے''۔

اقبال کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے ان حوالوں سے حمایت صاحب نے طلبہ کو وہ حوصلہ دیا کہ وہ بڑی شخصیات کا تقابلی مطالعہ کر سکیں۔ ورنہ ہمارے معاشرے تو شخصیت پرستی ''بت پرستی'' تک پہنچی ہوئی ہے جب کہ ہمارا مذہب ''بت شکنی'' کی تعلیم دیتا ہے۔ مجھے ''صریر خامہ'' کے ''اقبال نمبر'' کا مطالعہ کرتے ہوئے وہ بیانات اور مراسلے یاد آ رہے تھے جو حمایت صاحب کی تقرری کے موقع پر مختلف اخبارات میں شائع ہوئے تھے۔ میں نے اپنی کتاب ''بارش سنگ سے بارش گل تک'' میں ان کے خلاف چلائی جانے والی مہم کے حوالوں میں ایک مراسلے کا خاص طور پر ذکر کیا تھا۔ جو ''وزارتِ تعلیم حکومتِ پاکستان'' کے نام اکتوبر یا نومبر ۱۹۷۷ء کو روزنامہ ''جسارت'' میں شائع ہوا تھا۔ ملاحظہ کیجیے:

''یہ ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ سابقہ حکومت (ذوالفقار علی بھٹو) نے تعلیم و تدریس کے مقدس شعبوں میں بھی سیاسی بنیادوں میں تقرریاں کیں جس کے باعث تعلیمی ڈھانچہ بُری طرح متاثر ہوا ہے۔ سیاسی بنیادوں پر تقرری کا سب سے بڑا ثبوت سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے شیخ ایاز کا تقرر ہے۔ لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ حال ہی میں ایک مشہور ترقی پسند شاعر حمایت علی شاعر کا تقرر سندھ یونیورسٹی میں بحیثیت استاد کیا گیا ہے۔ آخر ان کا تقرر کس بنیاد پر کیا گیا ہے۔ اوّل تو ان کے پاس کوئی ''اعلیٰ ڈگری'' نہیں ہے دوسرے ان کی شخصیت اس قابل نہیں ہے کہ وہ نوجوانوں کی تربیت کر سکیں۔ ان حقائق کے پیشِ نظر میں متعلقہ حکام سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ حمایت علی شاعر کے تقرری کے احکامات واپس لے لیں۔ کیوں کہ اس ملک کو صرف ایسے قابل نوجوانوں کی ضرورت ہے جن کے دل سوشلسٹ نظریے کے بجائے اسلام کی روشنی

سے منور ہوں۔'' مراسلہ نگار اور اخبار ''جسارت'' کی مجلس ادارت نے یہ بھی زحمت گوارا نہیں کی کہ حمایت صاحب کے بارے میں درست معلومات حاصل کر لیں۔ حمایت صاحب نے سن ۶۴ء میں سندھ یونیورسٹی سے ہی ایم۔اے کیا تھا۔ وہ پی ایچ۔ڈی بھی کرنا چاہتے تھے لیکن مکمل نہ کر سکے (اپنی قلمی مصروفیات کے بناء پر) اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک بڑے کنبے کی کفالت ان کے ذمہ تھی۔ معاشی مسائل سب کے ساتھ ہوتے ہیں، ان کے ساتھ بھی رہے لیکن اس کے باوجود انھوں نے قابل رشک مثالیں قائم کیں۔ خود بھی تعلیم حاصل کی اور تمام بچوں کو بھی اعلیٰ تعلیم دلائی۔ شاعری میں غیر معمولی مثالیں قائم کیں مثلاً ساڑھے تین ہزار اشعار پر مشتمل منظوم سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' اور مختصر ترین صنف سخن ''خلائی'' کی ایجاد اور پھر فلمی دنیا سے وابستگی کے باوجود ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے منسلک رہے اور اعلیٰ ادبی اور تحقیقی پروگرام پیش کرتے رہے۔ کسوٹی جیسا علمی اور ادبی پروگرام آج تک لوگوں کو یاد ہے۔

میں سمجھتی ہوں کے ایسے پڑھے لکھے اور فعال روی کے خلاف کسی قسم کا محاذ بنانا اور اسے آگے بڑھنے سے روکنا کتنا غیر انسانی فعل ہے۔ اس سلسلے میں بھی میں نے بہت مواد جمع کر کے کتابوں کی شکل میں محفوظ کر دیا ہے۔ آئندہ کسی باب میں اس پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی جائے گی۔ یہاں فی الحال ان کی علمی خدمات کو تنقید اور تحقیق کے حوالوں سے دیکھا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حمایت علی شاعر صاحب نے ان دونوں شعبوں میں بھی بڑا کام کیا ہے۔ ان کی آنے والی کتابوں میں ایک کتاب ''نئی پود'' کے نام سے ہے جو ادب کی نئی نسل کا تنقیدی مطالعہ ہے اور دو کتابیں ''نقطۂ نظر'' اور ''چنگاریاں'' کے نام سے بھی مرتب کی گئی ہیں۔ ''نقطۂ نظر'' میں وہ مقالے ہیں جو تحقیق اور تنقیدی زاویوں سے لکھے گئے ہیں اور ''چنگاریاں'' میں صرف شاعرات کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ (بڑا معنی نام ہے) ان کے اکثر مضامین مطبوعہ ہیں۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں ادیب اور شاعر اپنی کتابیں خود چھاپتے اور خود ہی ان کو ''ٹھکانے'' بھی لگاتے ہیں کیوں کہ زیادہ تر پبلشر سستا ادب چھاپنا پسند کرتے ہیں۔ یہ ایک المیہ ہے، کراچی کے اہل قلم کی کتابیں صرف کراچی میں چھپتی اور تقسیم ہو جاتی ہیں۔ لاہور کا کوئی پبلشر ان کی کتابیں نہیں چھاپتا۔ چناں چہ لاہور اور پاکستان کے دوسرے شہروں میں (کسی دکان پر) کراچی کے شاعروں اور ادیبوں کی کتابیں دکھائی نہیں دیتیں۔ ایسا کیوں؟ آپ بھی سوچیے۔

باب پنجم

فلم، ٹی وی، سٹیج اور ریڈیو

ڈرامے اور غنائیے

حمایت علی شاعر نے جہاں شاعری کی ہر صنف میں اپنے تخلیقی جوہر کا اظہار کیا ہے وہیں ڈرامہ نگاری میں بھی اپنا ہنر دکھایا ہے۔ انھوں نے نہ صرف منظوم ڈرامے لکھے بلکہ غنائیے بھی تحریر کیے ہیں۔ ان کے ڈرامے طبع زاد بھی ہیں اور سندھ کی لوک کہانیوں سے ماخوذ بھی۔ غنائیے اپنی جگہ فکر انگیز اور قابل مطالعہ ہیں۔ اس کے علاوہ حمایت صاحب نے ڈراموں میں بھی کچھ تجربے کیے ہیں۔ ان کا ایک ڈرامہ ''شکست کی آواز'' احمد ندیم قاسمی کے رسالے ''فنون'' (لاہور) میں ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا، بعد میں وہ حمایت صاحب کے طویل افسانوی اور تمثیلی نظموں کے مجموعے ''تشنگی کا سفر'' میں شامل کیا گیا ''یہ ایک کردار'' ڈرامہ ہے۔ اس کی کہانی کچھ اس طرح ہے۔

ایک پروفیسر جو ساری عمر عقل کی گتھیاں سلجھانے میں گزار دیتا ہے آخر عمر میں جب ناکامی کے احساس سے دوچار ہوتا ہے تو اس کی ذات کا وہ روپ جو اس کے جذبات سے عبارت ہے اور جس کی طرف وہ کبھی توجہ نہ دے سکا تھا ایک کردار کی شکل میں اس کے مقابل آ جاتا ہے اور اپنے مطالبات کے حصول کے لیے اکساتا ہے۔ ایک شخصیت کے دونوں پہلو ''دو کرداروں کی صورت'' آپس میں نبرد آزما ہوتے ہیں اور آخر کار دونوں معاشرتی اقدار کی نذر ہو جاتے ہیں۔

انسان کا یہ نفسیاتی مطالعہ جس ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا ہے اور حمایت صاحب نے اپنے اشعار سے جس طرح اسے سنوارا ہے وہ بلاشبہ ان کے کمال فن کی دلیل ہے۔ یہ ڈرامہ ریڈیو پاکستان حیدر آباد اور کراچی سے نشر ہوا اور حمایت صاحب ہی نے ان دونوں کرداروں کی صداکاری کی۔ کراچی اسٹیشن سے پیش کیا جانے والا یہ ڈرامہ ''جشن تمثیل'' کا بہترین ڈرامہ قرار دیا گیا تھا۔ میں اس ڈرامے کے مکالماتی انداز کی ایک مثال پیش کرتی ہوں۔

آواز آج معلوم ہوا اپنی حقیقت کیا ہے؟
دل کے بازار میں اک ذہن کی قیمت کیا ہے؟

پروفیسر (چونک کر) کون ہو تم؟

آواز مجھے تم بھول گئے ہو شاید۔ میں وہی کشتۂ افکار گراں مایہ ہوں

پروفیسر میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے تم کو شاید۔

آواز میں اِسی پیکرِ ادراک کا ہمسایہ ہوں۔
ہم ہیں وہ دوست کہ ہر بُعد کے باوصف ہمیں
ایک ہی نام سے دنیا نے پکارا برسوں
ہم ہیں وہ ثابت و سیار۔ خلاؤں میں جنھیں
وقت کی گردشِ پیہم نے سہارا برسوں
ہم ہیں اک شاخِ دو پھول۔ وہ گل ہائے دو رنگ
اپنے ہی ذوقِ تماشا نے نکھارا ہے جنھیں
ہم ہیں اک بحر کی موجیں، وہ سبک رو موجیں
عیشِ ساحل نے تلاطم پہ ابھارا ہے جنھیں

پروفیسر (الجھ کر) میں نہیں سمجھا کہ تم کون ہو،
کیا کہتے ہو؟

آواز تم تو اپنے ہی خیالوں میں نہاں رہتے ہو۔
اک نظر مجھ کو ذرا غور سے دیکھو تو سہی
کیا میں آئینہ تمھارا نہیں؟

پروفیسر ہاں ہو تو سہی۔

آواز میں وہی ہوں، جسے تم مار چکے ہوائے دوست
آج یہ بازی بھی تم ہار چکے ہوائے دوست

پروفیسر (حیرت سے) کیا کہے جاتے ہو۔۔۔!

آواز (بات کاٹتے ہوئے) جی۔ میں ہوں وہی خانہ خراب

مُشتِ خوں جان کے۔۔۔

(پہچانتے ہوئے) تم! تم ہو؟

جناب!
میں تمہارا دلِ مرحوم ہوں اور زندہ ہوں
آج تک زیست سے محروم ہوں اور زندہ ہوں
میری آنکھوں میں ابھی تک وہ دنیا بے خواب
جس کے آفاق پہ ابھرا نہیں کوئی مہتاب
میرے ہونٹوں پہ تڑپتی ہے ابھی تک وہی پیاس
جس کو ساغر کی کھنک تک کبھی آئی نہیں راس
میری رگ رگ میں وہی خون ہے اب تک رقصاں
جس کے ہر قطرے میں دوزخ کی تپش ہے پنہاں

یہ ڈرامہ چھ سو (۶۰۰) مصرعوں پر مشتمل ہے۔ روانی میں اکثر قافیہ بند اشعار بھی نظم ہو گئے ہیں۔ بیشتر آزاد نظم کی صورت میں ہیں۔ مکالموں میں کہیں حسبِ ضرورت پابند اشعار کو ٹکڑوں میں بھی تقسیم کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حمایت صاحب کو شعر گوئی پر کتنی قدرت حاصل ہے۔ وہ مشکل سے مشکل مقام سے بھی نہایت آسانی سے گزر گئے ہیں۔ دراصل ڈرامہ نگاری ان کا ایک "تخلیقی جوہر" ہے۔ وہ ریڈیو کے صفِ اوّل کے صداکاروں میں شمار ہوتے تھے۔ مشکل سے مشکل کردار ادا کرتے تھے۔ ریڈیو کے سب سے بڑے فن کار زیڈ اے بخاری جو سب سے بڑے افسر بھی تھے اپنے جن چند شاگردوں پر ہمیشہ نازاں رہے ان میں شاعر صاحب کا نام بھی شامل ہے۔ وہ خود بھی اقرار کرتے ہیں کہ انھوں نے بخاری صاحب سے بہت کچھ سیکھا۔ وہ رفیع پیرزادہ کی بھی بہت عزت کرتے ہیں۔ انھیں بھی اپنا استاد مانتے ہیں۔ کراچی میں جن دنوں حمایت صاحب ریڈیو سے متعلق تھے (۵۲ تا ۱۹۵۵ء) ان دنوں رفیع پیرزادہ، چراغ حسن حسرت، احمد بشیر، احمد فراز، سلیم احمد، عبدالماجد اور احمد عبدالقیوم بھی صاحبِ علم اور منجھے ہوئے ادیب اور فنکار ریڈیو سے متعلق تھے۔ پھر حمایت صاحب نے (اپنے ذاتی مسائل کی بناء پر) اپنا ٹرانسفر ریڈیو پاکستان حیدرآباد میں کروالیا جو انھیں دنوں قائم ہوا تھا۔

انھوں نے بیشتر ڈرامے حیدرآباد ریڈیو کی سروس کے دوران لکھے۔ ایک منظوم ڈرامہ ''دستک'' ہے جو ایک سنگ تراش کے تخلیقی خلجان کا آئینہ دار ہے۔ چند مصرعے درج ذیل ہیں جو خود کلامی کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان چند مصرعوں سے آپ کو حمایت صاحب کی تخلیقی قوت اور شاعرانہ مہارت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

آذر:۔ میری تخئیل۔۔۔ مرے فن کا وہ شہکار عظیم
کن خلاؤں میں ہے گم
تیشہ بے چین ہے پتھر پہ مچلنے کے لیے
سنگ بے تاب ہے، اک جسم میں ڈھلنے کے لیے
آنکھیں بے خواب کہ تعبیر نظر آئے کوئی
ذہن بیدار کہ تنویر نظر آئے کوئی
انگلیاں چاہتی ہیں پیکرِ تخئیل کا لمس
(ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے)
کوئی خاکہ ہے نہ سایہ، کوئی پرتو ہے نہ عکس
کچھ نہیں۔۔۔ کچھ بھی نہیں
کوئی صورت نہیں شرمندۂ سنگ
کوئی عنواں نہیں منت کش رنگ
دور و نزدیک خلاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں
تیرہ و تار فضاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں
(سر جھکا کر بیٹھ جاتا ہے)
(تیشے کو اٹھاتے ہوئے ناتراشیدہ پتھروں کو دیکھتا ہے)
اپنی تخئیل کا وہ نقش ابھاروں کیسے
زیست اور موت کو پتھر میں اتاروں کیسے
زیست اک حسن، سحر دم گل خنداں جیسے
موت اک حزن، خزاں دیدہ گلستاں جیسے

یہ ہے آغاز تو انجام ہے وہ
یہ ہے اک صبح تو اک شام ہے وہ
ایک آغاز کو انجام بناؤں کیسے
صبح اور شام کے فرسنگ مٹاؤں کیسے
ایک ساعت میں سمیٹے ہوئے اک عمر کا طول
ایک پتھر میں یہ دوران، دکھاؤں کیسے
ایک پتھر میں یہ جذبات، جگاؤں کیسے

دراصل اس ڈرامے کو پورا پڑھ کر ہی لطف لیا جا سکتا ہے یا پھر اس کی ریڈیائی تشکیل سماعت کی جائے۔ حمایت صاحب کا ایک اور ڈرامہ بہت فکر انگیز ہے جس کا عنوان ہے ''دائرے''۔ یہ ڈرامہ بھی ریڈیو سے نشر ہو چکا ہے۔ اس ڈرامے میں زندگی کو شطرنج کی بازی سے تعبیر کیا گیا ہے کھیلنے والے دو کردار اپنے مُہروں سے کھیلتے ہیں۔ انھیں بالکل یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ مُہرے ''انسان'' بھی ہو سکتے ہیں وہ بھی جینا چاہتے ہیں۔ شاہ و وزیر کے تابع ہو کر بھی وہ کسی کا کھلونا بننا نہیں چاہتے۔ مگر کھلاڑی اپنی شکست و فتح کے احساس میں کھوئے ہوئے ہیں اور مسلسل ان کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں۔ شاعر صاحب نے انھی مُہروں کی معرفت یہ بتایا ہے کہ انسان کتنا بے بس اور مجبور ہے اور ہر انسان ایک کھلونا ہے۔ اس حوالے سے کھلاڑیوں کا یہ مکالمہ ملاحظہ فرمایئے:

نمبر۱ تو یوں اک پیادے کو قربان کر کے تم اس اسپ پر وار کرنے چلے ہو
میں سمجھا
مجھے باتوں باتوں میں بہلا رہے تھے
حضور آپ کی ایک اک چال میں جانتا ہوں
یہ جو فلسفہ آپ سمجھا رہے تھے
یہ باتیں بہت اونچی، بے حد ہیں گہری
جو ظاہر ہے میری سمجھ سے تو باہر ہیں۔۔۔ لیکن
یہ شطرنج کی ہے بساط
آپ اس پر نگاہیں جمائے رکھیں

ہاں۔۔یہی آپ کے حق میں بہتر رہے گا
ادھر دیکھئے گا۔
یہ فرزیں۔۔یہاں آ گیا ہے
(ہنستے ہوئے) کہو! اب تمھارے پیادے کی قسمت میں کیا ہے
بلاوجہ مروادیا نا؟ (ہنستا ہے)

نمبر۲ (سوچتے ہوئے) پیادہ تو مر ہی گیا ہے
مگر اک پیادے کے مرنے سے ہوتا ہے کیا ہے
چلو۔۔میں نے اس فیل کے واسطے راہ ہموار کر لی
کم از کم تمھارا کوئی اسپ ہی اس پیادے کی قیمت چکائے۔

نمبر۱ بہت خوب!
اِس اسپ پر تھی نظر آپ کی۔۔خیر چلیے۔
یہ نقصان ہم کو گوارا۔مگر۔۔اب
یہ فرزیں کہاں بچ سکے گا؟
حضور اب تو شہہ کو بچانے کا سامان کیجیے۔
(قہقہہ لگاتا ہے)
کہو کوئی صورت ہے بچنے کی؟ فرمایئے گا
نہیں نا؟
یہ ضرب ایسی کاری پڑی ہے کہ بچنے کی کوئی بھی صورت نہیں ہے

نمبر۲ (کھسیانی ہنسی ہنس کر) یہی کچھ نظر آ رہا ہے۔

نمبر۱ تو اب مانتے ہو کہ تم مات بھی کھا چکے ہو؟

نمبر۲ بھلا اس میں انکار کی بات کیا ہے۔
چلو پھر سے کھیلیں۔جماؤ بساط۔

اور پھر یوں دوسری بازی جم جاتی ہے اور گھر کے گھر خاندان کے خاندان تباہ ہوتے رہتے ہیں۔
حمایت صاحب نے ان مُہروں کو انسانی شکل دے کر حقیقت کا آئینہ دکھایا ہے اور قاری کو مجبور کیا

ہے کہ وہ ان کھلاڑیوں کے بارے میں سوچے۔
حمایت علی شاعر کے سبھی ڈرامے اسی قسم کے سوالات قاری کے ذہن میں پیدا کرتے ہیں۔اور انھیں سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ان کے منظوم ڈرامے ہوں یا منثور (نثری ڈراموں پر آگے چل کر بات کروں گی) لمحۂ فکریہ ضرور عطا کرتے ہیں۔فی الحال ایک اور منظوم ڈرامہ سے متعلق کچھ سطریں ملاحظہ فرمایئے۔

یہ سندھ کی ایک لوک کہانی ہے۔۔''عمر ماروی''۔۔محبت کی یہ کہانی بھی عجیب ہے۔ہر ایسی کہانی دو چاہنے والوں سے منسوب ہوتی ہے۔''مومل رانو''۔''ہیر رانجھا'' اور ''سوہنی مہینوال'' وغیرہ۔ان کہانیوں میں دونوں چاہنے والے اپنی محبت میں فنا ہو کر امر ہو جاتے ہیں۔لیکن ''عمر ماروی'' میں ''ماروی'' ایک مظلوم کردار ہے وہ بادشاہ عمر کی قید میں ہے۔روتی جاتی ہے اور اپنے عاشق ''کھیت'' اور اپنے گاؤں ملیر کو یاد کرتی رہتی ہے۔اسے شاہی محل سے زیادہ اپنا گاؤں عزیز ہے کچی مٹی کے گھر عزیز ہیں۔اسے اپنی سہیلیاں اور پنگھٹ یاد آتے ہیں (جہاں سے عمر کے سپاہیوں نے اسے اغوا کیا تھا) اس اعتبار سے عمر اس کہانی کا منفی کردار ہے لیکن ماروی کے ساتھ نام ہمیشہ اسی کا آتا ہے۔وہ ماروی کا عاشق تو ہے لیکن ماروی اسے ناپسند کرتی ہے اسے ظالم سمجھتی ہے۔شاہ بھٹائی کی کافیوں سے یہی بات جھلکتی ہے۔لیکن یہ بات قاری کو سوچنے پر اکساتی ہے کہ ماروی کا نام اس کے نام کے ساتھ منسوب کیسے ہو گیا۔دوسری بات یہ کہ ماروی کے اصل عاشق ''کھیت'' کو کوئی نہیں جانتا۔

حمایت صاحب نے اس ڈرامے میں اسی سوال کا جواب پیش کیا ہے کہ محبت کسی کے دل میں ہو، قابلِ قدر ہوتی ہے۔محبت کے دربار میں شاہ و فقیر ایک ہوتے ہیں، محبت ایثار پسند ہوتی ہے قربانی دیتی ہے۔جب عمر کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی محبت یک طرفہ ہے تو وہ اپنی محبت کو اپنے سینے میں دفن کر دیتا ہے اور ماروی کو کھیت کے حوالے کر دیتا ہے۔وہ بادشاہ ہو کر بھی ماروی کو خدا کی امانت سمجھ کر خود کو اس سے دور رکھتا ہے۔

یا میر تقی میر کے الفاظ میں:

دور بیٹھا غبارِ میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

مولانا حسرت موہانی نے یہی بات کچھ اس طرح کہی ہے:

دیکھنا اور اسے دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں، حسن کو رسوا کرنا

ان اشعار کی روشنی میں عمر کے کردار پر نظر کیجیے۔ آپ کا دل گواہی دے گا کہ عمر کی محبت ''کھیت'' سے زیادہ قابل قدر تھی اسی لیے وقت اور تاریخ نے اس محبت کا احترام کیا اور عمر کو ماروی سے منسوب کر دیا۔ ڈرامہ بہت پر لطف ہے اور میرے خیال میں اسے پڑھنا زیادہ بہتر ہو گا۔ اب حمایت صاحب کے ڈراموں کا دوسرا مجموعہ ''مہران موج'' زیر طبع ہے۔ اس میں سندھ کی لوک کہانیوں پر لکھے ہوئے سبھی ڈرامے شامل ہیں۔ ''عمر ماروی'' کے علاوہ ''مومل رانو'' بھی حمایت صاحب کا ایک منظوم ڈرامہ ہے۔

ان ڈراموں کی ایک خوبی اور بھی ہے۔ ان میں سندھ کی مخصوص دھنوں میں لکھے ہوئے گیت اور کافیاں بھی ہیں۔ ایک طرح سے یہ منظوم اور نثری ڈرامے اپنی غنائی کیفیت بھی رکھتے ہیں۔ ان میں چند ڈرامے مثلاً ''لیلاں چنیسر''، ''نوری جام تماچی''، ''سسی پنوں'' اور ''سورٹھ رائے ڈیاچ'' وغیرہ بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

ریڈیو پر گراموں میں ''غنائیہ'' کو بڑی مقبولیت حاصل رہی ہے، یہ بھی ایک طرح کی غنائی تمثیل ہوتی ہے۔ ان میں گیت بھی ہوتے ہیں اور علامتی کرداروں کے منظوم مکالمے بھی۔ ایک غنائیہ ''بدلتے زاویے'' میں نئے اور پرانے آدمی کی گفتگو پیش کی گئی ہے، وقت کو بھی ایک آواز کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

آواز۔۔ زندگی۔۔ایک سفر
وقت۔۔ایک راہگزر
آدمی۔۔بت کدۂ دہر کا رنگیں پیکر
اپنے آذر کا ترا شا ہوا اک نقش۔۔مگر
خود نگر۔۔خود شکن و خود گر
جس کی تقدیر۔۔سفر اور سفر

اس کے بعد ایک نغمے کی صورت کرداروں کو پیش کیا گیا ہے

''جہان کن'' کے راز داں ہیں کون ۔۔ ہم
قدم قدم پہ کامراں ہیں کون ۔۔ ہم

اس غنائیے میں زندگی، آدمی اور وقت کا مطالعہ تاریخ کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ پرانے آدمی کا اندازِ فکر اور اس کی نفسیات کا مقابلہ نئے آدمی کے اندازِ فکر اور اس کی نفسیات کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ میں صرف ایک مختصر سا مکالمہ پیش کرتی ہوں۔

پرانا آدمی۔ وقت تو ایک بگولہ ہے کہ اڑتا ہی چلا جاتا ہے
زندگانی میں کوئی لمحۂ شاداب نہیں
روح حیران ہے، آنکھوں کے جزیرے ویراں
دل کے صحرا میں کہیں چشمۂ مہتاب نہیں
محض دھوکہ ہے یہ دنیا نہیں بدلے گی کبھی
اس شبِ تار کی قسمت میں کوئی صبح نہیں
مجھ کو معلوم ہے دنیا کی حقیقت کیا ہے
محض اعجازِ نظر ہے یہ مہ و مہر و زمیں
ہم سب آئینہ در آئینہ ہیں ایک عکسِ خیال
زندگی اس کے سوا کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں

نیا آدمی۔ کتنے نادان ہو، تم۔ جو ہے وہ ''ہے'' تو اے دوست
ہے کو ہم کیسے ''نہیں'' کہہ کے گزر سکتے ہیں
عکس و آئینہ کے جس ربط کا حاصل ہے حیات
اس تعلق کو ''زمیں'' کہہ کے گزر سکتے ہیں
جس عقیدے سے عبارت رہا انساں کا وجود
اس عقیدے کا جگر چاک بھی کرنا ہو گا
آگہی نے جو چراغاں سا کیے رکھا ہے
اس سے ''امکان'' کا ادراک بھی کرنا ہو گا

وہی ''امکان'' جو ہر عہد کے باطن کا ہے عکس
غیر ممکن میں ہمیشہ سے جو ''ممکن'' کا ہے عکس
اسی ممکن سے عبارت ہے سفر کی تاریخ
فکر، احساس، خبر اور نظر کی تاریخ

پورا غنائیہ اسی قسم کے فلسفیانہ اشعار سے مرتب ہے اور یوں نئی اور پرانی فکر کا مقابلہ و موازنہ کیا گیا ہے۔ آخر پرانے آدمی کے اس اقرار پر یہ گفتگو ختم ہوتی ہے۔

زندگی مجھ کو بھی آواز دے، میں آتا ہوں
مجھ کو بھی اذنِ تگ و تاز دے، میں آتا ہوں

شاعر صاحب کے بھی غنائیے اس قسم کے رجائی اندازِ فکر کے آئینہ دار ہیں۔ ''نوید انقلاب'' پاکستان کی منظوم تاریخ بھی ہے اس میں سیاسی، معاشرتی اور معاشی مسائل سے بحث کرتے ہوئے ان حقیقتوں کو اجالا گیا ہے جو برسوں سے مذہب اور اپنے روایتی عقیدوں کے دبیز پردوں کے پیچھے پوشیدہ تھے۔ اس غنائیے کا اختتام ایک کورس پر ہوتا ہے جس کا پہلا بند یہ ہے۔

گاؤں گاؤں سناؤ آج --- بدلے رسم و رواج
اپنے پیارے دیس میں ہو گا --- آج سے اپنا راج
راہنما کا روپ نہ دھارے --- اب کوئی رہزن
اب نہ خزاں کی زد میں آئے ہرا بھرا گلشن
یوں ہی دمکتا رہے ہمیشہ حسنِ صبحِ وطن
گاؤں گاؤں سناؤ آج --- بدلے رسم و رواج

حمایت علی شاعر نے جہاں فکر انگیز مسائلی غنائیے لکھے وہیں ہلکے پھلکے لطیف قسم کے محسوسات اور جذبات کے ترجمان غنائیے بھی لکھے ہیں۔ اس حوالے سے ان کا ایک غنائیہ ''کلفٹن کی ایک شام'' بہت دل چسپ ہے۔ اس میں زندگی کے مختلف شعبوں کی عکاسی کی گئی ہے یہ غنائیہ سنجیدہ فکر پر بھی اکساتا ہے اور زندگی کی لطافتوں کی مختلف تصویریں بھی دکھاتا ہے۔ اس غنائیے کا آغاز سمندر کے کنارے اس گیت سے ہوتا ہے۔

ایک دلِ ویراں کا سہارا -- ساگر ترا کنارا

شہر میں جوں جوں سورج ڈوبے، دل بھی ڈوبتا جائے
جیون نیا کو جب کوئی اور نہ پار لگائے
تیرے طوفانوں کا دھارا، بن جاتا ہے کنارا
ایک دلِ ویراں کا سہارا

مختلف گیتوں کے بعد حمایت صاحب نے بندر نچانے اور چنے پکوڑے بیچنے والوں کے گیت بھی لکھے ہیں جو ہمارے معاشرے پر ایک خوب صورت طنز ہیں۔

ناچ چھنا چھن ناچ -- کہ ناچے سارا جگ سنسار
یہ دنیا کیا ہے اک بازار -- یہاں بس ہوتا ہے بیوپار
نہ کوئی دوست نہ کوئی یار -- فقط اک سکے کی جھنکار
اِسی جھنکار پہ تن من وار
کہ ناچے سارا جگ سنسار

اسی طرح ایک اور گیت بھی ملاحظہ فرمائیے:

چنے پکوڑی دہی بڑے جو میرے کھا کر جائے
زمانہ گیت اسی کے گائے
سارے ولایت بھر میں میری پکوڑیوں کی دھوم
دہی بڑے جاتے ہیں میرے ترکی، برما، روم
امریکہ کو مرے چنے کا مزہ جو ہو معلوم
دیکھو کیا کیا جی للچائے

اس قسم کے تفریحی گیت انھوں نے بچوں کے لیے بھی لکھے ہیں۔ جو نونہال اور پھول کے علاوہ دیگر رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ حمایت علی شاعر کے گیت اور نغمات کا ذکر میں تفصیلاً اگلے باب میں کروں گی کیوں کہ انھوں نے خاصا وقت فلمی دنیا میں گزارا ہے اور فلمی نغمہ نگاری کے علاوہ اسکرین پلے اور مکالمے بھی لکھے ہیں۔ فلم سازی بھی کی ہے اور ہدایت کاری بھی۔ میں یہاں ان کے منظوم ڈراموں اور غنائیوں کے بعد نثری ڈراموں کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ ۲۰۰۵ء میں ان کے ڈراموں کا مجموعہ ''حمایت علی شاعر کے ڈرامے'' کے نام سے شائع ہوا ہے

(میرے خیال میں اس کا نام حمایت علی شاعر کے تحریر کردہ ڈرامے ہونا چاہیے تھا)۔ یہ بات میں پہلے بھی عرض کر چکی ہوں کہ حمایت صاحب کی یہ تخلیقات ریڈیو کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں یعنی ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۲ء تک، جب وہ حیدرآباد سندھ میں برسرکار تھے۔ وہیں انھوں نے اپنی تعلیم مکمل کی اور سندھ یونی ورسٹی سے ایم۔اے کیا۔ ریڈیو پر تحقیقی پروگرام پیش کیے اور اسٹیج ڈرامے بھی لکھے۔ ڈراموں کے اس مجموعے میں حمایت صاحب کے چھ عدد ریڈیائی اور ایک اسٹیج ڈرامہ شامل ہے۔ ریڈیو کے نشری ڈرامے بھی ان کے مخصوص افکار کے نمایندہ ہیں۔ ''دشمن آسماں اپنا'' ایک نفسیاتی ڈرامہ ہے۔ ایک بدصورت شاعر کی خوب صورت شاعری جس نے اس کی خود اعتمادی کو خود فریبی میں بدل دیا تقدیر کا ایک خوف ناک مذاق مگر تدبیر کے ہاتھوں اس کی ناکامی۔ اس ڈرامے کی تکنیک بھی قابل داد ہے۔ جس کو (Flash by Flash) کا نام دیا جاسکتا ہے۔ دوسرے ڈرامے کا نام ہے ''برزخ''۔۔ یہ ایک تین منزلہ عمارت کے مکینوں کی کہانی ہے۔ جو ہمارے معاشرے کی ان کہی حقیقتوں کے راز کھولتی ہے۔ ''فاصلے'' جو تسخیر ہو کر بھی ناقابل تسخیر رہتے ہیں۔ سائنسی ایجادات کے سبب جتنی تیزی سے یہ دنیا سمٹ رہی ہے دلوں کے درمیان اتنی ہی تیزی سے فاصلے پیدا کر رہی ہے۔

انسانی ارتقاء کا ایک داخلی مطالعہ۔۔ ''پتھر کی لکیر'' موئن جوڈرو کی کھدائی میں ایک پتھر کی دریافت جس کے نقوش کو چار ہزار سالہ سمجھا گیا، صرف چالیس سال پرانے نکلے۔ عہد قدیم میں عہد جدید کی کہانی جس نے زمانوں کا فرق مٹا دیا اور مستقبل کو حال بنا دیا۔۔ ''بگولہ'' جو ہوا کے دوش پر بھٹکتا رہتا ہے لیکن اس کی بھی ایک سمت متعین ہوتی ہے۔ فکری انتشار میں قلبی یک سوئی کی کہانی ہے۔

کتاب کا آخری ریڈیائی ڈرامہ حمایت صاحب کے اس مصرعے کا تمثیلی روپ ہے:

مرنا ہے تو دنیا میں تماشا کوئی کر جا

ڈرامے کا عنوان ہے ''مرنا ہے تو''۔۔ دراصل یہ ایک فرانسیسی کہانی سے ماخوذ ڈرامہ ہے بہت دل چسپ اور موت کو آسان بلکہ ایک کھیل بنا لینے کا طریقہ۔ اس کتاب میں ایک اسٹیج ڈرامہ بھی شامل ہے جس کا نام ہے ''اندھیرے اجالے'' یہ ہمارے ملک کے سیاسی مسائل سے متعلق ہے جاگیردارانہ سماج میں انقلاب کے خواب دیکھنا اپنی تباہی کے مترادف ہے۔ علامہ اقبال کا ایک شعر ہے جو انھوں نے مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کے بارے میں لکھا تھا اسے تھوڑے سے

تصرف کے ساتھ یوں بھی برتا جاسکتا ہے:

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا ''جاگیردار''
انتہائے سادگی سے کھا گیا ''دہقان'' مات

(اس ڈرامے کے مرکزی کردار کی باغیانہ سوچ کے محرکات کو (اسٹیج پر) ایک سفید پردے پر مختلف مناظر کی پرچھائیوں یعنی سایوں کے ذریعے پیش کیا گیا تھا۔ یہی اس کا آغاز تھا اور یہی انجام گویا مسلسل بغاوت ہی انقلاب کی شرط ہے)

یہ ڈرامہ ۱۹۵۹ء میں گورنمنٹ گرلز کالج حیدرآباد سندھ کے اسٹیج پر ایک ثقافتی انجمن ''ارژنگ'' کے زیر اہتمام کھیلا گیا تھا۔ یہ انجمن حمایت صاحب اور ان کے چند دوستوں نے قائم کی تھی۔ اس ڈرامے میں محمد علی اور مصطفیٰ قریشی (فلم اسٹار) نے پہلی بار کام کیا تھا اس میں کچھ شاعروں اور ادیبوں نے بھی اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔ چناں چہ کنٹرولر براڈ کاسٹنگ زیڈاے بخاری اور انفارمیشن سیکریٹری (ر) فضل احمد کریم فضلی بھی مہمانان خصوصی کے طور پر کراچی سے مدعو کیے گئے تھے۔ ان دنوں فضلی صاحب نے ''دبستان لمیٹڈ'' کے نام سے کراچی میں ایک فلمی ادارہ قائم کر رکھا تھا اور ان کی پہلی فلم ''چراغ جلتا رہا'' کی کاغذی تیاریاں جاری تھیں۔ فضلی صاحب ''اندھیرے اجالے'' میں محمد علی کی اداکاری سے بہت متاثر ہوئے، اپنی فلم کے لیے منتخب کرلیا۔ محمد علی جوان دنوں ریڈیو پاکستان حیدرآباد میں ایک صداکار کے طور پر کام کرتے تھے اور سٹی کالج میں انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے کراچی چلے گئے اور فضلی صاحب کی پکچر میں کام کرنے لگے۔ کچھ ہی عرصے بعد مصطفیٰ قریشی بھی فلمی دنیا میں آ گئے۔ انھوں نے پہلے سندھی اور پھر اردو اور پنجابی فلموں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ پہلی پرفارمنس ایک اسٹیج پر دینے والے یہ دونوں ہی فن کار بہت جلد شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئے اور ہماری فلم انڈسٹری کے ستون کہلانے لگے۔

فلموں میں نغمے لکھنے کا سلسلہ حمایت صاحب نے ۱۹۶۰ء میں شروع کیا تھا اس کی تفصیل آپ اگلے باب میں ملاحظہ فرمائیے۔

☆☆

باب ششم

حمایت علی شاعر کے تراجم، انٹرویوز اور خطوط

حمایت علی شاعر کی بیشتر تخلیقات کا انگریزی کے علاوہ پاکستان اور ہندوستان کی مختلف زبانوں میں بھی ترجمہ ہوتا رہا ہے۔ سب سے پہلے عالمی امن کے موضوع پر ان کی طویل افسانوی نظم ''بنگال سے کوریا تک'' کا انگریزی ترجمہ پنجاب یونیورسٹی پٹیالہ (انڈیا) کے پروفیسر راجندر سنگھ ورما نے Flowers In Flames کے نام سے کیا تھا۔ یہ نظم حمایت صاحب نے ۵۲ء اور ۵۳ء کے درمیان لکھی تھی۔ اس کے مختلف حصے پاکستان کے مختلف رسائل میں چھپتے رہے اور پھر مارچ ۱۹۵۴ء میں شاہراہ دہلی کے سالنامے میں پوری نظم شائع ہوئی، ان دنوں ترقی پسند شاعر وامق جونپوری اس کے ایڈیٹر تھے۔ راجندر سنگھ ورما کا ترجمہ انڈیا میں شائع ہوا تھا اور پاکستان میں بھی اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ ''شاہراہ'' (دہلی) میں حمایت علی شاعر کا لکھا ہوا حسب ذیل نوٹ بھی شائع ہوا تھا۔

''بنگال اور کوریا ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ بنگال گزشتہ عالم گیر جنگ سے دوررہ کر بھی پچاس لاکھ انسانوں کا مدفن بن گیا اور کوریا تازہ ہیروشیما ہے اور یہ ہیروشیما جس تیزی سے پھیلتا جائے گا۔ بنگال بھی اسی سرعت سے پھیلتا جائے گا۔ یہ نظم ہندوستان کے بیدار ہوتے ہوئے شعور کی داستان ہے۔ جو گزشتہ جنگ سے مختلف ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا آج اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ جنگ بازوں کو نئے کوریا کی تلاش مشکل ہو گئی ہے۔''

اس نوٹ سے اس نظم کے تخلیقی محرکات کا سراغ بھی ملتا ہے۔ گزشتہ عالم گیر جنگ کے دوران ۱۹۴۳ء میں بنگال کا خوفناک ''مصنوعی قحط'' اور پھر ۱۹۴۵ء میں امریکہ کے ہاتھوں ایٹم بم کے طفیل جاپان کے شہر ہیروشیما اور ناگاساکی کی ہولناک تباہی۔ تاریخ عالم کا وہ المیہ ہے جو انسانیت کے ماتھے پر ہمیشہ ایک سیاہ داغ کی طرح نمایاں رہے گا۔ ''بنگال سے کوریا تک'' کو بھی ناقدین نے

حمایت صاحب کی بہترین نظم قرار دیا تھا دو سو چھ بہتر اشعار کی یہ نظم حمایت صاحب نے ایک ہی بحر میں لکھی تھی اور جنگ کے خلاف لکھی جانے والی نظموں میں اسے اوّلیت کا مقام حاصل تھا۔ بعد میں یہ نظم کئی ''بہترین نظموں کے انتخاب'' میں بھی شامل ہوئی۔ ہندوستان میں سلیمان اریب نے اسے ''حیدر آباد کے شاعر'' (حصہ دوم) میں منتخب کیا۔ پاکستان میں اس نظم کی بنیاد پر حمایت علی شاعر کے پہلے مجموعہ کلام ''آگ میں پھول'' کو صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ''آگ میں پھول'' کا سندھی زبان میں ترجمہ ڈاکٹر ام۔ ای۔ عالمانی نے ''گل باہ مہ'' کے عنوان سے کیا اس کے علاوہ سنا ہے کہ بنگالی اور تلگو زبان میں اس کے تراجم ہوئے۔ اسے ہندی کا روپ مولانا آزاد کالج اورنگ آباد کے پروفیسر جی۔ این۔ ندّاف نے بخشا ہے۔

حمایت علی شاعر صاحب کی ایک اور طویل نظم ''حرف حرف روشنی'' کے نام سے موجود ہے جو انھوں نے اپنے بچوں سے مخاطب ہو کر کہی ہے۔

مرے لہو کے چراغو، مرے جگر پارو
سنو! یہ میری نصیحت بھی ہے وصیت بھی

ان کی یہ نظم ۲۱ حصوں پر مشتمل ہے جملہ ایک سو ایک اشعار ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں جامعہ ملیہ دہلی کے ادارہ مکتبہ جامعہ نے حمایت صاحب کے کلام کا ایک انتخاب شائع کیا تھا۔ جن میں غزلوں، نظموں اور ثلاثیوں کے علاوہ یہ نظم بھی شامل تھی۔ اس کتاب کا نام بھی ''حرف حرف روشنی'' رکھا گیا تھا۔ پروفیسر راجندر سنگھ ورما نے اس کتاب کے انگریزی ترجمہ کا عنوان Every Word Aglow رکھا اور یہ کتاب انڈیا کے علاوہ پاکستان میں بھی اسی نام سے شائع ہوئی تھی۔ ہندوستانی شاعر قاضی رئیس نے اسے ''شبد شبد پرکاش'' کے نام سے ہندی میں منتقل کیا اور ہندی کے ایک اور ادیب مسٹر بھکتل نے بھی اسے ہندی جامہ پہنایا۔ حمایت صاحب کی مختلف نظموں غزلوں اور ثلاثیوں کے ترجمے مختلف اہل قلم نے اپنے اپنے انگریزی مضامین کے سلسلے میں بھی کیے ہیں۔ جن میں یونس احمر، پروفیسر عبدالقوی ضیا، پرکاش چندر، پروفیسر اظہر قادری، سکندر مسرور، نسیم سیماب اور حمیرا اشتیاق کے نام معروف ہیں۔

حمایت صاحب پر ایک کتاب انگریزی میں بھی مرتب کی گئی ہے۔ جس کا نام The Scholar Poet ہے۔ یہ کتاب عبدالقوی ضیا کا کارنامہ ہے۔ اس کتاب میں مندرجہ بالا اہل قلم کے علاوہ

ڈاکٹر محمد علی صدیقی، خشونت سنگھ، اکرام بریلوی، پروفیسر نظیر صدیقی، آفتاب احمد خان، نسیم نیشوفوز، سیّد رضوان اللہ، آصف نورانی، بلدیو مرزا اور انور نسیم کے مضامین شامل ہیں۔ یہ کتاب کینیڈا میں مرتب کی گئی ہے۔ حال ہی میں حمایت صاحب کے چھ ریڈیائی ڈراموں اور ایک اسٹیج ڈرامہ ایک مجموعہ کی شکل میں شائع ہوا ہے۔ یہ ڈرامے انھوں نے سن ۱۹۵۵ء سے سن ۱۹۶۲ء کے دوران ریڈیو پاکستان حیدرآباد کے لیے لکھے تھے۔ ان ڈراموں میں چار یا پانچ ڈرامے سندھی زبان میں بھی ترجمہ ہوئے جن کی تفصیل یہ ہے۔

ڈرامہ ''فاصلہ'' مفاصلہ کے نام سے رشید احمد لاشاری نے ترجمہ کیا۔ ''دشمن آسماں اپنا'' کو ''دشمن آسماں پنجو'' کے نام سے ام۔ بی۔ انصاری۔ نے ''بگولا'' کو واچوڑو کے نام سے ممتاز مرزا نے اور ''برزخ'' برزخ ہی کے نام ہی سے محمد اسحاق پیر سرہندی نے سندھی میں ترجمہ کیا۔

مشاعروں اور ادبی کانفرنسوں کے سلسلے میں حمایت صاحب دنیا کے مختلف ممالک میں بھی جاتے رہے، وہاں کی مقامی زبانوں میں بھی حمایت صاحب کے کلام کے تراجم ہوئے اور مقامی اخبار و رسائل میں شائع ہوتے رہے مثلاً نارویجین (ناروے) افریقان (جنوبی افریقہ) روسی (ماسکو) چینی (بیجنگ) وغیرہ اسکے علاوہ بعض مستشرقین نے پاکستان اور ہندوستان میں لکھے جانے والے اردو شعر و ادب پر اپنی اپنی زبانوں میں جو مقالے لکھے ہیں، شاعر صاحب کی نظموں کے حوالے وہاں بھی تراجم کے ساتھ موجود ہیں۔

''بنگال سے کوریا تک'' کا ایک انگریزی ترجمہ ٹائمز آف انڈیا کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر (لکھنو) پرکاش چندر نے بھی کیا جس کا عنوان انھوں نے Flute And Bugle رکھا ہے۔ اس سلسلے میں حمایت صاحب کا کہنا ہے کہ جب وہ انڈو پاک مشاعرے میں شرکت کرنے کے لیے لکھنو گئے تھے تب ان کی ملاقات پرکاش چندر سے ہوئی تھی اس سے قبل سن ۱۹۶۰ء دہلی کے کلاتھ ملز کے ایک مشاعرے میں بھی ان سے ملاقات کر چکے تھے۔ چناں چہ جب دہلی میں دوبارہ ملاقات ہوئی تو اس وقت پروفیسر راجندر سنگھ ورما ''بنگال سے کوریا تک'' کا ترجمہ Flowers In Flames کے نام سے کر چکے تھے اور ہندوستان کے بے شمار رسائل اور اخبارات میں اس کتاب پر کئی تبصرے بھی ہو چکے تھے۔ پرکاش چندر کا پیدائشی تعلق راولپنڈی (پاکستان) سے تھا۔ تقسیم ہند کے بعد بچپن ہی میں وہ ہندوستان چلے گئے اور لکھنو میں آباد ہو گئے گویا وہ ایک ایسے پنجابی تھے جن کی

انی تربیت لکھنو میں ہوئی تھی۔ پروفیسر ورما کا ترجمہ ان کی نظر سے گزرا تو انھوں نے حمایت صاحب سے ایک دل چسپ بات کہی تھی۔

''سردار جی نے تمھاری نظم ''اردو'' میں پڑھی۔ اس کے بارے میں ''پنجابی'' میں سوچا اور ''انگریزی'' میں ترجمہ کر دیا''

بچپن لکھنو میں گزارنے کے سبب پرکاش چندر کے دل میں اہلِ زبان کی خصوصیات گھر کر چکی تھیں۔ یعنی اردو زبان کے مختلف آداب، الفاظ کی نزاکتیں، لہجے کی ملائمت وغیرہ۔ حمایت صاحب نے ان سے کہا ''تو گویا تم ''لکھنوی پنجابی'' ہو۔۔؟'' ''ہاں اور میں چاہتا ہوں کہ ''لکھنوی انگریزی'' میں اس کا ترجمہ کروں''۔ دونوں دوست ہنس پڑے اور کچھ عرصہ بعد پرکاش نے اس کا دوسرا ترجمہ کر دیا اور جب وہ ہندوستان میں Flute And Bugle کے نام سے شائع ہوا تو اس پر بھی بڑے تبصرے ہوئے اور خشونت سنگھ جیسے جرنلسٹ نے بھی اسے سراہا۔ پرکاش نے تمام تبصرے حمایت صاحب کو پوسٹ کر دیے اور اصرار کیا کہ اب یہ ترجمہ تمام تبصروں کے ساتھ پاکستان میں شائع کراؤ اور حمایت صاحب نے تبصروں کے انتخاب کے ساتھ Flute And Bugle کو پاکستان میں شائع کرا دیا۔ یہ دراصل ایک دل چسپ ''تقابلی مطالعہ'' ہے جو نہایت مہذب انداز میں ایک تخلیق کے دو عکس پیش کرتا ہے۔

شاعر صاحب کی اکثر نظموں کے ایسے تراجم ہوئے ہیں۔ ''حرف حرف روشنی'' (انگریزی کے علاوہ) کے ہندی روپ بھی جن جن حضرات کی نگاہ سے گزرے ہیں وہ بتا سکتے ہیں کہ اس ''تقابلی مطالعہ'' سے ان پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ کسی نے قاضی رئیس کی تعریف کی تو کسی نے مسٹر بھکتل کی۔ حمایت صاحب نے بھی ان تراجم کا لطف اٹھانے کے لیے ہندی سیکھنا شروع کر دی تھی مگر وہ جو حضرت داغ نے کہا ہے:

نہیں داغ آسان یارو سے کہہ دو
کہ آتی ہے ''اردو'' زباں آتے آتے

تو حمایت صاحب بھی اس نتیجے پر پہنچے ''کہ آتی ہے 'ہندی زباں' آتے آتے''۔ حالاں کہ ہندی اور اردو ایک ہی آئینے کے دو عکس ہیں۔ بقول حمایت صاحب[1] ''اردو اور ہندی دو سگی بہنیں ہیں ایک

اپنوں میں بیاہی گئی ہے ایک غیر ملکیوں میں۔ ایک کا لباس ''ہندوستانی'' ہے اور دوسری کا ''ایرانی''، لیکن دونوں زبانیں اپنے خمیر کے اعتبار سے اپنی تہذیب کے لحاظ سے ایک ہی ماں کی اولاد ہیں۔ ہندی میں سنسکرت اور اردو میں فارسی اور عربی الفاظ کی ''زیادتی'' حکمرانوں کی ''سیاست'' کا نتیجہ ہے۔ خدوخال کے لحاظ سے دونوں کا حسن ہندوستانی ہے جسے مقامی زبانوں کی آمیزش نے اور بھی سنوار دیا ہے۔

شاعر صاحب کی منظوم سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' جو پاکستان میں لکھی جانے والی سب سے طویل نظم ہے اور منظوم سوانح کے لحاظ سے اردو شاعری میں پہلا تجربہ بھی، جس کا اب انگریزی میں ترجمہ ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ ''آئینہ در آئینہ'' کو ''رومن'' میں تبدیل میں نے کیا ہے۔ اور اس کے بارے میں یہ خیال ہے کہ ایک ہی کتاب اردو، رومن اور انگریزی تینوں میں شائع کی جائے لیکن اس کے لیے کچھ انتظار کرنا ہوگا۔ تقابلی مطالعے کی خاطر میں کچھ جھلکیاں یہاں پیش کرتی ہوں۔ (نظم کا انگریزی ترجمہ راجندر سنگھ ورمانے کیا ہے)

آدمی

کل بھی میں جنگل میں تھا اور آج بھی جنگل میں ہوں
کل مرے ہمسائے تھے خونی درندے، بھیڑیے
آج انسانوں میں ہوں اور خون کے جل تھل میں ہوں
مجھ کو تہذیبوں نے آئینہ دکھایا تو کھلا
روح کا قاتل ہوں میں اور جسم کے مقتل میں ہوں

MAN

Yesterday I lived in the woods E'en today I live in the woods.

Yesterday my neighbours were Bloody beasts and gory wolves.

Living in the midst of men Now I dip in sea of blood

As the civilizations held Mirror upto me, I learnt

That I'm killer of my soul And in body's slanghtery live.

جب کہ اس نظم کا ترجمہ یونس احمر نے اس طرح کیا ہے۔

As I was in the wildenness yesterday, so I m today

Yesterday the bloody beasts, were my neighbours

and the wolves

Today I m among human beings dreanched in

blood

The civilisation showed me the mirror

And I was my self in it.

And I saw my self in it.

As the assassin of my soul

Lying in the slaughter house of my body.

اب دو بند ''حرف حرف روشنی'' کے پیش کرتی ہوں۔ اس کا انگریزی ترجمہ راجندر سنگھ ورمانے کیا ہے۔

مرے لہو کے چراغو مرے جگر پارو
سنو یہ میری نصیحت بھی ہے وصیت بھی
میں آج تم میں ہوں موجود کل نہیں ہوں گا
مگر جو تم ہو، تو میں ہوں سدا سلامت بھی
تم اپنا نقطہ آغاز ہی سہی لیکن
تمھارے ساتھ رواں ہے میری روایت بھی

O lamps of my blood

O bits of my heart

Tis my counsel and

My will as well, hark!

I'm today with you

Morrow I won't be

میں اپنے ماضی مرحوم کی امانت تھا
سو آج تم سے ہے منسوب یہ امانت بھی
مجھے جو غم ہے تو اتنا کہ اپنے ہی گھر میں
تمھارا ورثہ ہے میرا عذاب ہجرت بھی
میرے لہو کے چراغو مرے جگر پارو
دروغ و مکر کا انبار ہے مری تاریخ
برائے نام خدا ہے برائے نام ہے دیں
خدا و دیں کی گنہگار ہے میری تاریخ
نہ آدمی کی حقیقت نہ زندگی کا سراغ
فقط قصیدۂ دربار ہے مری تاریخ
فقیہہ و شاعر و فن کار، سب وظیفہ خوار
غلام فکر کا بیوپار ہے مری تاریخ
جو آج ''شاہی محلّہ'' ہے کل یہی تھا حرم
حقیقتاً پسِ دیوار ہے مری تاریخ

But if you exist

I for ever be

You may make a start

Of your career will

My tradition too

Continues with you

I was store of my

Past bereft of life

This deposit now

I entrust to you

My sole regeret is

That i your own house

You inherit mine

Anguish of exile

O Lamps of my blood!

O bits of my heart!

Ah! my annals are

Heap of lies N fibs

Nominal is GOD

Nominal is faith

My annals gave sinned

Gainst the Lord N faith

Not a clue of man

Nor a trace of life

My annals are just

Panegyrics of courts

Artists, Jourists, Poets

You will inherit the
anguish of my immigration
******

O' The lamp of my blood
O' the fragments of my heart
Ah, my annals are
(nothing but) heaps of
lies and hypoerisy
Meaningless is GOD
Insighificant is belief
My annals portary
my sins against the Almighty
and faith
Neither there is a clue of man
Nor a trace of existence
My annals are the
Panegyrics of stately decorum

Jurists, poets and artists
receive stipends for survival
Ah! my annals, are a sole deed
of slavish mentality

What is known as "Shahi Mohalla"

Living on stipends
My annals are but
Deals of salvaish thought

Then was harem what's
"Shahi Mohalla" now
O my chronicle's
But a shady deal

انہی اشعار کا ترجمہ پروفیسر عبدالقوی ضیاء کے الفاظ میں اس طرح ہے:

O' fragments of my heart
O' the lamps of my blood
'Tis my advice and my
last tetament as well, hark
I am present amongst you today
Tommorow, I would be non-existent
But with your survival
(then) my own existence will achieve eternity
You may make your own start
But my legacies will live along with you
I was a bequest of my decadent past
Now, I am dedicating my legacies to you
My main regret is
That in your own abode

Now - was Harmen yesterday

What a shame

My annals are shameful deals.

پروفیسر عبدالقوی ضیاء نے بعض غزلوں کے اشعار کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا ہے:

شمع کی مانند اہل انجمن سے بے نیاز
اکثر اپنی آگ میں چپ چاپ جل جاتے ہیں لو

Like the taper, indifferent to the audience

complain in the fire they lit themselvesMany people burn without

کتنے سادہ دل ہیں اب بھی، سن کے آوازِ جرس
پیش وپس سے بے خبر، گھر سے نکل جاتے ہیں لوگ

How simpleton are folk

s Hearing clarion call

They step out of their homes without demur

ہر قدم پر نت نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ
دیکھتے ہی دیکھتے، کتنے بدل جاتے ہیں لوگ

People revitalize their pattern of life at every step

They change instantaneously (without remorse)

کچھ مثالیوں کے انگریزی ترجمے جوراجندر سنگھ ورمانے کیے ہیں۔

الہام

کوئی تازہ شعر، اے ربِ جلیل
ذہن کے غارِ حرا میں کب سے ہے

فکر۔۔۔محوِ انتظارِ جبریل

LEARNING

Bless me with some fresh Verse, O lord of lords

In the "hera" cave Of Mind, thought

Has been waiting long For Gabriel the great

زاویۂ نگاہ

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت تراش لے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت نواز دے تو یہی خدا ہے

POINT OF VIEW

Lying on the Path

This one humble stone

Can be God in faith Is bestowed on it

شاعری

POETRY

ہر موجِ بحر میں کئی طوفاں ہیں مشتعل
پھر بھی رواں ہوں ساحلِ بے نام کی طرف
لفظوں کی کشتیوں میں سجائے، متاعِ دل

Many a storm's commove In each wave of the sea
Still I press towards Beach without name
Donning fund of the heart In the boats of Word

جب کہ عبدالقوی ضیا صاحب نے ان ثلاثیوں کا ترجمہ کچھ اس طرح کیا ہے:

REVELATION

Bless me with
some fresh
verse, O' Lord of
Lords'
in the Hara, the
cave of
intellactual
maturity,
the sublimity of
thought
still awaits
Gabriel

ANGLE OF VISION

The
msignificant
sotne

stranded on the
pathway
can attain
divinity
if adorned with
faith

POETRY

In every wave of
bulging sea
many of storm
commove
yet I feel
attracted
to and
unidentifiable
beach
adorning the
vessels of
speech
with heartfelt
emotions

آخر میں آپ ایک اور نظم کا مطالعہ فرمایئے اس کے بعد ان کے انگریزی ترجمے بھی ملاحظہ

فرمائیں۔ اس کا انگریزی ترجمہ راجندر سنگھ ورمانے کیا ہے۔

سنگ میل

میرے سینے کے دہکتے ہوئے انگارے کو
اب تو جس طرح بھی ممکن ہو بجھا دے کوئی
اپنی آنکھوں میں بھی ہوں، آنکھ سے اوجھل بھی ہوں
میں گماں ہوں کہ حقیقت ہوں، بتا دے کوئی
دھوپ چھاؤں کا یہ انداز رہے گا کب تک
مجھ کو اس خواب کے عالم سے جگا دے کوئی
میں ہوں اِس دشت طلسمات کا وہ شہزادہ
جس کے سر پر ہے فلک، گنبدِ بے در کی طرح
میری منزل میرے سینے پہ لکھی ہے لیکن
اپنی ہی راہ میں ہوں نصب، میں پتھر کی طرح
رہنما ہوں مگر اک گام نہیں چل سکتا
ایسی اک ضرب کہ ٹوٹے یہ مسلسل سکتہ

MILESTONE

Let someone put out some-how
embrers in my heart a flame
In sight, and yet out of sight
Fact of fancy-what am I?
How long game of sun N shade?
Let someone shatter my sleep
I'm the prince of fantasque waste
Which sky lids like doorless dome

On my bosom's writ my goal
Stone-like to my path I stick
Though guide I can't walk a step
O for blow that breaks the silence continuous

اور اب یونس احمر کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

No matter whatever way, let someone
Put out the burning flames of my heart!
I'm inside my eyes but lost at the same time
I'm a presumption of truth, let someone tell me
How long will this game of sunshine and
shadow go on'
Let someone wake me up from the slumber
I'm that prince of this magical wilderness
On whose head the sky is standing like a dome
without any door
My goal is writ large on my chest.
But I'm planted on my own path like a stone.
I need a hard blow to break this constant
silence!

مندرجہ بالا چند تراجم میں نے انگریزی کے پیش کیے۔ ان میں الفاظ کا جو فرق ہے وہ غور طلب ہے اور ہمیں ترجمے کے بارے میں دعوتِ فکر دیتا ہے۔ ترجمہ کسی زبان میں کیا جائے اصل تخلیق دوسری زبان میں ''آئینہ و عکس'' کی مانند منتقل نہیں کی جا سکتی۔ سبھی ترجمہ نگار اس پر متفق ہیں، جو تراجم تخلیق کی روح کو اس کے حسن بیان کے ساتھ سمیٹ لے اسی کو کامیاب ترجمہ کہا جاتا ہے۔ حمایت صاحب کی تخلیقات کے بھی مختلف زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں۔

انگریزی میں چونکہ یہ کام زیادہ ہوا ہے، اس لیے میں نے اسی کی مثالیں پیش کی ہیں۔ اس میں کس ترجمہ نگار کو کہاں تک کامیابی ہوئی ہے، اس کا فیصلہ صرف پڑھنے والے ہی کر سکتے ہیں۔

☆☆

انٹرویوز

پچھلے ابواب کے مطالعے سے یہ بات پوری طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ حمایت علی شاعر اپنے عہد کی ایک اہم ترین شخصیت رہے ہیں۔ جن کے فن کے متنوع پہلو میں تفصیل سے پیش کر چکی ہوں۔ پڑھنے والے اس امر سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ جب کوئی شخصیت کسی بھی حوالے سے شہرت حاصل کر لیتی ہے تو عوام اس کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں اور پوشیدہ گوشوں سے واقفیت چاہنے لگتے ہیں۔ اخبار، رسالے اس مشہور شخصیت سے تفصیلی گفتگو کرتے ہیں اور اپنے قارئین کو یہ معلومات فراہم کرتے ہیں۔ لیکن جب بات آ جائے حمایت علی شاعر کی تو پھر معاملہ ہی کچھ اور ہو جاتا ہے۔ ان کے فن کے مختلف پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے اخبار و رسائل اور جراید کے علاوہ ریڈیو ٹی وی نے بھی ان کے بے شمار انٹرویو ریکارڈ کیے اور نہ صرف کراچی بلکہ دنیا بھر کے شہروں کے ذرائع ابلاغ نے حمایت صاحب کو دل کھول کر نوازا ہے۔ وہ ''جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے'' کے مصداق ہر پرچے اخبار اور ٹی وی کے مہمان بنے اور اپنی معلوماتی گفتگو سے عوام کو استفادے کا موقع دیا۔ یہ جملہ میں نے یہاں دانستہ تحریر کیا ہے کیوں کہ پڑھنے والے یہ بھی جانتے ہیں کہ انٹرویو کئی قسموں کے ہوتے ہیں اور ہر ذریعہ ابلاغ کی ضرورت کے مطابق کیے جاتے ہیں۔ یہ امر بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ انٹرویو کے ''جاندار'' ہونے کا دارومدار سوال کرنے والے یا انٹرویو نگار پر بھی ہوتا ہے اور اگر خوش قسمتی سے انٹرویو دینے والی شخصیت پڑھی لکھی، عالم فاضل اور دور رس نگاہ رکھنے والی ہو تو سونے پر سہاگہ ہو جاتا ہے۔ حمایت صاحب کا شمار ایسی ہی شخصیات میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے اندر معلومات کا ایک وسیع خزانہ رکھتے ہیں کیوں کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع اور گہرا ہے، اس لیے وہ ہر موضوع پر خوب بولتے ہیں۔ مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ حمایت صاحب کو بولنے پر اکساتا ہے اور وہ جب موڈ میں آ جائیں تو ''وہ'' کہیں اور سنا کرے کوئی'' کا عالم ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں عموماً انٹرویو کو بہت محدود دائرے میں رکھا جاتا ہے اور روایتی گفتگو اور لگے

بندھے سوالات ہوتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس طرح کے انٹرویوز سے مقصد پورا نہیں ہوتا۔ حمایت صاحب کے پاس بے شمار انٹرویوز کے ریکارڈ موجود ہیں۔ میں نے بہت سخت انتخاب کے بعد ان کے کچھ انٹرویوز سے چند حصے یہاں شامل کیے ہیں کیوں کہ میری خواہش ہے کہ پڑھنے والے ان کی گفتگو سے فیض یاب ہوں اور یہ بھی دیکھیں کہ مختلف موضوعات پر وہ اپنا مدعا کس طرح بیان کرتے ہیں۔ (ہندوستان میں ایک گفتگو)

س: حمایت صاحب سب سے پہلے آپ پاکستان کی ادبی صورتحال پر روشنی ڈالیں؟

ج: ''دیکھیے بہت کچھ تو ویسا ہی ہے جیسا یہاں ہے۔ یہاں اپنی روایت کا احساس بہت گہرا ہے اور لکھنے والا بھی بہت بے باک ہے، ہمارے یہاں احتیاط دامن گیر رہتی ہے۔ پھر ہندوستان اور پاکستان کی حکومت میں جو فرق ہے وہی ادب میں بھی ہے اور یہ فضا زندگی پر بہرحال اثر انداز ہوتی ہے اور زندگی کا آئینہ ادب ہے۔ یوں ادب میں بے راہ روی کم ہے، پاکستان کی جدید شاعری بعض معاملوں میں ہندوستان سے بہتر ہے۔ آپ کے یہاں مشاعرے کی روایت نے زبان کے ارتقا اور کلاسک کی بقا میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ پاکستان میں اب ترنم مشاعرے کی ضرورت نہیں رہا۔ پھر اردو فہمی کا مسئلہ بھی غور طلب ہے لیکن ایک بڑا فرق اور بھی ہے اور وہ یہ کہ آپ کے یہاں اردو صرف ''ادب'' ہو کر رہ گئی ہے، زندگی کے دوسرے شعبوں میں اس کا استعمال ہرگز نہیں ہے۔ ہمارے ہاں صورت حال دوسری ہے، اردو زبان زندگی کی زبان ہے۔ یوں آپ یہ اعتراض کر سکتے ہیں اردو فہمی و سخن فہمی میں ایک حد فاصل ہے، ہمارے ہاں اردو کا دائرہ قدرے وسیع ہے۔'' ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ ہندوستان میں بیٹھ کر ہندوستانی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے ایک طرف سچائی اور دوسری طرف اپنی زبان اور اپنے ملک سے محبت کا ذکر کس انداز سے کیا گیا۔

ایک اور انٹرویو میں ایک سوال یہ بھی کیا گیا۔

س: عروج کے زمانے میں فلمی دنیا کیوں چھوڑی؟

ج: ''اس وقت میرے بچے بڑے ہو رہے تھے اور مجھے ڈر لگا کہ کہیں یہ بچے کالج چھوڑ کر فلم اسٹوڈیو کا رخ نہ کریں، یوں ان کی تعلیم ادھوری رہ جائے گی اور میرے خواب چکنا چور ہو جائیں گے۔ سو میں نے اسٹوڈیو چھوڑ کر یونی ورسٹی کی راہ لی۔ خود پڑھانا شروع کر دیا تا کہ بچوں کے دل میں علم کی رفعت بڑھ جائے۔''

دیکھا آپ نے کہ اپنے وقت کا مشہور صدا کار، اداکار، ہدایت کار، فلم ساز اور شاعر جب ''باپ'' بن کر سوچتا ہے تو وہ کس قدر مختلف نظر آتا ہے۔

س: آپ کے بچپن کا کوئی ناقابل فراموش واقعہ؟

ج: ''میری یادوں میں تو اس وقت بھی کئی واقعات نقش ہیں۔ لیکن میرے لیے سب سے اہم اور ناقابل فراموش واقعہ میری والدہ کے انتقال کا ہے۔ اُس وقت میں صرف تین سال کا ایک معصوم سا بچہ تھا جب میں نے گھر کے آنگن میں ماں کا جنازہ رکھا دیکھا۔ اس جنازے کی ایک مبہم سی تصویر آج بھی میرے ذہن میں نقش ہے۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا رکھا ہے۔ ماں اس طرح لیٹی ہوئی کیوں ہے۔ پھر مجھے بتایا گیا کہ میری ماں فلاں قبرستان میں ہیں۔ انھی حالات میں جب میں ذرا بڑا ہوا تو ذہن پر اتنا غم طاری تھا کہ مستقل قبرستان میں گھومتا رہتا۔ پانچویں کلاس میں تھا تو میرے والد نے دوسری شادی کر لی۔ بعض بچے اتنے حساس ہوتے ہیں کہ وہ یا تو ان محرومیوں سے فرسٹریشن کا شکار ہو جاتے ہیں یا پھر ایک چیلنج سمجھ کر اسے قبول کرنے کا جذبہ ان میں بیدار ہو جاتا ہے۔ مجھ پر کافی عرصے تک یہ دونوں جذبے طاری رہے۔ لیکن کچھ ایسے دوستوں کی صحبتیں اور کچھ ایسی کتابیں پڑھنے کو ملیں جس کے نتیجے میں میرے اندر ایک باغی انسان بیدار ہو گیا۔ اس طرح میں نے فرسٹریشن سے نکل کر دوسرے جذبے کے ساتھ زندگی گزارنے کا ارادہ کر لیا۔ جو جذبہ مجھے خودکشی کی طرف لے جا رہا تھا وہ زندگی سے لڑنے میں بدل گیا۔''

س: شاعری میں خواتین کے کردار اور عمل دخل سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ آپ کن شاعرات کو موضوع بناتے ہیں؟

ج: ''ہمارے ہاں اردو شاعری میں جو پہلی شاعرہ کہلاتی ہیں وہ تقریباً ڈھائی سو سال پرانی شاعرہ تھیں ان کا نام تھا مہ لقابائی چندا وہ بہت اچھی شاعرہ تھیں۔ مگر ہمارے معاشرے میں عورت کو تعلیم ہی نہیں دی جا رہی تھی اس لیے وہ اپنی حدود سے باہر نہ آ سکی۔ ہمارے یہاں تو عالم یہ ہے کہ محبوب کا ذکر ہمیشہ صیغہ مذکر میں آتا ہے، عورت اور مرد کی تفریق جو قدرت نے کی ہے وہ شاعری میں نہیں ہے۔ ہم تو سچائی سے ہمیشہ دور بھاگتے رہے ہیں، ہماری بزدلی اور کم علمی بھی قابل ذکر ہے۔ لیکن جو ادب زنجیریں توڑ کر باہر آیا ہے اسے کوئی نہیں روک سکا۔ آخر عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر جیسی ادیبہ بھی ہمارے سامنے آئیں جن کی علمی ادبی خدمات سے آپ منہ نہیں موڑ سکتے۔ پھر

میں ذکر کروں گا ادا جعفری کا جنھوں نے پہلی بار لکھا کہ ''میں ساز ڈھونڈتی رہی''۔ یہاں تو اس سے قبل عورت نسائیت کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ میچورڈ ذہنوں کو ادب قبول کرتا ہے، منٹو پر ہمیشہ مقدمے چلائے گئے مگر ججوں نے انھیں بَری کر دیا۔''

س: آپ نے درست طور پر عصری ادب میں مختلف تحریکات کے باعث انتشار کی نشاندہی فرمائی، حالاں کہ آج کے دور میں نظریہ اور ازم قصۂ پارینہ بن چکے ہیں جبکہ ماضی میں نظریاتی اور غیر نظریاتی کا کافی غلغلہ اور گھن گرج تھی؟

ج: ''میں نے عصری ادب میں انتشار کی بات اس ''بے چہرگی'' کے حوالے سے کی جو جدیدیت تجریدیت اور اسی قسم کی دوسری تحریکوں کے سبب شعر و ادب میں در آئی تھی۔ اس روش سے ''ابلاغ'' مفقود ہو کر رہ گیا تھا۔ لفظ بے معنی ہو گئے۔ حقیقت سے استعارے اور کنایے کا بھی رشتہ ٹوٹ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادب کا قاری غائب ہو گیا اور ادیب و شاعر بھی ایک دوسرے کی بات سمجھنے کے قابل نہیں رہے۔ تنقید حاشیہ آرائی اور لفاظی ہو کر رہ گئی۔ مانا کہ یہ اس نظریاتی گھن گرج کا ردِ عمل تھا جو پچھلی نصف صدی میں ابھر کر شعر و ادب پر چھا گئی تھی۔ ہر تحریک کے ابتدا میں یہی کچھ ہوتا ہے مگر جب شور بیٹھ جاتا ہے اور نظریہ دل و دماغ میں گھل کر لہو میں تحلیل ہو جاتا ہے تو ادب میں ایک نئی قدر بن کر نمایاں ہوتا ہے۔''

س: کیا ہمارے ہاں تنقید مروّجہ اصولوں کے مطابق لکھی جا رہی ہے؟

ج: ''تنقید ہمارے ہاں کئی مراحل سے گزری ہے ایک وہ دور تھا جس کا آغاز مولانا حالی سے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد ویسی کتابیں دوبارہ نہیں لکھی گئیں۔ ترقی پسندی کے زمانے میں بھی معیاری تنقید سامنے آئی، کیا اس حوالے سے پروفیسر مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین، پروفیسر مجتبیٰ حسین اور پروفیسر ممتاز حسین کی خدمات کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ دور کی تنقید گروہی ہو گئی ہے۔ دوستی نبھائی جاتی ہے۔ نظریہ بیچ میں سے غائب ہو گیا ہے۔ تقریباتی تنقید پر زیادہ زور ہے۔ تو صفی مضامین لکھے جا رہے ہیں۔ ہر نقاد اپنے حلقے کے لوگوں کو آگے بڑھانے میں مصروف ہے۔ لاہور کا نقاد وہاں کے لوگوں کے لیے اور کراچی کا نقاد یہاں کے لوگوں کے لیے لکھ رہا ہے۔ ہر چیز خانوں میں بٹ گئی ہے۔ نتیجتاً ادب کی اکائی رفتہ رفتہ ٹوٹ رہی ہے۔ اس صورت حال سے نئی نسل باغی ہو گئی ہے۔ موجودہ عہد کے نقادوں سے نئی نسل کی بدگمانی شاید اسی عمل کا ردِ عمل ہے۔ چناں چہ

اب نوجوانوں کی کتابیں بغیر پیش لفظ اور دیباچے کے بازار میں آ رہی ہیں۔ نقادوں کو اپنا کھویا ہوا وقار بحال کرنے کے لیے دیانت داری کے تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا۔ بہرحال ہمارے ہاں تنقید کی صورت حال اطمینان بخش نہیں ہے۔''

س: موجودہ تعلیمی نظام کے حوالے سے آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

ج: ''دنیا کہاں سے کہاں جا رہی ہے۔ وہاں کیا پڑھایا جا رہا ہے اور ہمارے ہاں کیا پڑھایا جاتا ہے جو انگریزوں کا دیا ہوا سسٹم ہے۔ ہماری مذہبی تعلیم بھی ناقص ہے، مسلمان فرقوں میں بٹ چکے ہیں۔ آنے والی نسل کل یہ ضرور سوچے گی کہ کیا وجہ ہے کہ عرب سے کوئی بڑا نام سامنے نہیں آیا۔ عربی کا ایک شاعر خلیل جبران سامنے آیا وہ بھی عیسائی تھا۔ ہم عربی کو فارسی کے حوالے سے جانتے ہیں۔ فارسی نے عربی کے جن الفاظ کو قبول کیا وہ ہم تک پہنچے ورنہ عربی نے تو کوئی فارسی لفظ قبول نہیں کیا۔ انگریزی زبان کے لفظ استعمال کر لیتے ہیں لیکن فارسی کے ''حروف'' سے بھی گریز کرتے ہیں۔ بچے ہم سے یہ سوال کرتے ہیں تو ہم جواب نہیں دے پاتے۔ زبان کو وسعت دینا ہوگی۔ اگر اس میں انگریزی کے لفظ شامل ہوتے ہیں تو کوئی بُرائی نہیں۔ انگریز دو سو سال تک ہم پر حکومت کر گئے ہیں اس دو سو سالہ غلامی نے ہمیں علم بھی دیا ہے۔ اسی زمانے میں مغرب کی ساری ایجادات یہاں آئیں۔ غلامی نے جہاں سیاسی طور پر نقصان پہنچایا وہیں فائدے بھی پہنچائے، زبانوں سے نفرت نہ کیجیے جو بھی علم حاصل کر سکتے ہیں حاصل کریں۔ وہ کسی بھی زبان میں ہو۔''

س: اگر ہندوستان اور پاکستان کی ثقافت ایک ہے تو پھر دو قومی نظریہ کیا ہے؟ نیز یہ بھی بتایئے کہ نظریہ پاکستان کیا ہے؟

ج: ''دیکھیے! دو قومی نظریے کا تعلق مذہب سے زیادہ اقتصادیات اور مسلمانوں کی سماجی حیثیت سے ہے۔ اس کا آغاز سرسید سے ہوا تھا۔ سرسید نے یہ محسوس کیا کہ مسلمان تعلیم کے میدان میں پیچھے رہے تو ہندوستان کی ایک پس ماندہ قوم بن کر رہ جائیں گے۔ اسی لیے انھوں نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کریں اور پھر علی گڑھ تحریک کی بنیاد رکھی جس کے ہمارے علماء مخالف تھے۔ مولانا مودودی کی تحریریں اور خطبات ہمارے سامنے ہیں وہ پاکستان کے کٹر مخالف تھے، خاکسار تحریک کے علامہ مشرقی بھی پاکستان کے مخالف تھے، مولانا ابوالکلام آزاد تو مخالف تھے ہی۔ نظریہ پاکستان کی اصطلاح تو بہت بعد میں گڑھی گئی۔ آپ علامہ اقبال کا خطبۂ الٰہ آباد اٹھا

کر دیکھ لیں، اس میں ''مسلم اسٹیٹ'' نہیں بلکہ ''اسٹیٹس'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ علامہ اقبال صرف اس خطے کے صوبوں کی طرف دیکھ رہے تھے اور ان کا خیال تھا کہ سندھ، سرحد، بلوچستان اور پنجاب میں مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہو سکتی ہیں۔ حالاں کہ ہندوستان میں بنگال سب سے زیادہ مسلم اکثریتی صوبہ تھا۔ مگر علامہ اقبال نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ بہرحال پاکستان تو وہ ریاست ہی نہ بن سکا جو قائداعظم کے تصور میں تھی۔''

س: اردو زبان کا کیا مستقبل ہے؟

ج: اردو نہ سرکاری زبان بن سکی اور نہ ہی تعلیمی۔ برائے نام ''قومی زبان'' ہے۔ پنجاب آج ہاتھ اٹھا لے تو اردو ختم ہو جائے گی۔ پنجاب اردو کی آخری پناہ گاہ ہے۔ پنجاب والوں کے اردو پر بہت احسانات ہیں جبکہ ان کی مادری زبان اردو نہیں ہے پھر بھی وہ اردو میں لکھتا ہے۔ اردو کی خدمت کرتا ہے۔ مگر اردو کا کوئی شاعر ایسا نہیں جس کا عرس منایا جاتا ہے۔ میر، غالب، اقبال کا عرس کبھی نہیں منایا گیا۔ اردو جب تک علمی زبان نہیں ہوگی بڑی زبان کے طور پر سامنے نہیں آ سکتی، ہماری بدنصیبی تو یہ ہے کہ ہم سندھ میں آباد ہیں اور سندھی نہیں بول سکتے۔''

س: موجودہ صورت حال میں آپ پاکستان کا مستقبل کیا دیکھتے ہیں؟

ج: اللہ پاکستان کو سلامت رکھے۔ ملک عوام سے وابستہ ہوتے ہیں، تبدیلی آتی ہے عوام سے، جب تک عوام برداشت کریں گے یہ سب چلتا رہے گا۔ جب عوام برداشت نہیں کریں گے انقلاب آ جائے گا۔ لیڈر شپ اچھی ہونی چاہیے اور ہمارے یہاں اسی کا فقدان ہے۔ ہندوستان ہمارے مقابلے میں بہت بڑا ملک ہے لیکن ان کے پاس سب سے بڑی نعمت جمہوریت ہے۔ دوسری بڑی بات یہ ہے کہ مذہب اگرچہ سب کو اپنا اپنا عزیز ہوتا ہے لیکن وہاں کروڑوں مسلمان آباد ہیں۔ سات سو سال تک ہندو مسلم اکٹھے رہے کوئی فساد نہیں ہوا۔ اب ان کے درمیان نفرتوں کو پروان چڑھایا گیا۔ ماضی میں کہیں بادشاہتیں رہیں۔ کیا ہندو کے اندر غیرت نہیں ہوتی۔ کیا ہندو کے اندر آزادی کا جذبہ نہیں ہوتا۔ کیا ہندو انسان نہیں ہوتا۔ پھر بھی آپ نے کئی سو سال ان پر حکومت کی۔ آج ہندوستان میں نفرتیں ختم کرنے کے لیے صوفیا اولیا کا مسلک اپنانا ہوگا۔ مولوی ازم نفرتوں کا پرچار ہے۔ صوفیاء اولیا محبتوں کے داعی ہیں۔''

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ ایک باعلم اور باخبر قلم کار دوسروں کے مقابلے میں کتنی انفرادیت رکھتا

ہے۔حمایت صاحب ایک پڑھے لکھے۔اپنی سوچ رکھنے والے اور گہرا مشاہدہ رکھنے والے انسان ہیں۔آپ نے کئی سوالوں کے جواب میں یہ بات محسوس کی ہوگی کہ انھوں نے ایک بالکل مختلف جواب دیا ہے۔کہیں بھی مصلحت یا دروغ گوئی سے کام نہیں لیا بلکہ جو چیز جہاں جیسی محسوس کی اپنے انداز سے اس کو پرکھتے ہوئے بیان کیا ہے۔یہ مختصر سا انتخاب اسی لیے پیش کیا گیا تا کہ ان کی شخصیت کا کوئی بھی پہلو پوشیدہ نہ رہے اور آپ ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ صحیح معلومات حاصل کر سکیں۔

☆☆

شاعر کے خطوط

حمایت علی شاعر کے خطوط بھی ادب میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ عام خطوط کی طرح حال احوال اور روزمرہ کے معمولات پر مبنی نہیں ہیں بلکہ ان خطوط میں اکثر مسائل پر دوسرے اہل قلم سے گفتگو ہوتی ہے اور بعض ایسے مباحث چھیڑے گئے ہیں جو صرف ادبی ہی نہیں بلکہ اپنے عہد کے سیاسی مسائل سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔وہ باتیں جو غیر اہم سمجھ کر مقالات کا موضوع نہیں بنائی جاتیں اور روزمرہ کے کھاتے میں ڈال دی جاتی ہیں۔جب وہ خطوط میں موضوع گفتگو بنتی ہیں تو ان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ بڑے اہل قلم کے خطوط بھی محفوظ کیے جاتے ہیں تا کہ ان کی روشنی میں ان کے عہد کا تجزیہ کیا جا سکے۔خطوط کی تحریر میں چوں کہ بے ساختگی ہوتی ہے۔ہنسی مذاق کا انداز بھی ہوتا ہے بے تکلفی ہوتی ہے اس لیے اہل قلم کے مزاج کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ان کی نفسیات کے اہم رخ نمایاں ہوتے ہیں اور معاشرے میں مختلف انسانوں کے باہمی تعلقات کا بھی ہمیں علم ہوتا ہے۔

حمایت صاحب کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ان کے خطوط کا مطالعہ بھی بہت ضروری ہے۔وہ چوں کہ بنیادی طور پر شاعر ہیں اس لیے انھوں نے اکثر منظوم خطوط بھی لکھے ہیں ان خطوط کی خاص بات یہ ہے کہ یہ سہل ممتنع میں ہیں۔سہل ممتنع کی تعریف یہ ہے کہ وہ اشعار جن کی نثر نہ ہو سکے، مثلاً غالب کا یہ شعر:

لالہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ان اشعار کی نثر نہیں ہو سکتی حالاں کہ یہ شعر ایک ہی بحر میں ہے۔ان میں قافیہ اور ردیف دونوں موجود ہیں۔شاعری میں ایسی بحریں بھی ہوتی ہیں جو مسلسل ہوتی ہیں۔رکن بڑھاتے جایئے بحر طویل سے طویل ہوتی جائے گی۔حتیٰ کہ جب تحریر ختم ہوگی تو معلوم ہوگا کہ ساری تحریر ایک ہی ''مصرعہ'' ہے۔اسے شاعری کی اصطلاح میں جو بھی کہا جائے یا جو بھی نام دیا جائے ہم اسے ''منظوم تحریر'' کہیں گے۔چناں چہ اس انداز میں منظوم افسانہ بھی لکھا جا سکتا ہے اور منظوم مقالہ بھی۔منظوم مقالے تو شاید ہی لکھے گئے ہوں مگر بعض شعرا نے منظوم افسانے ضرور لکھے ہیں۔گو کہ ایسی مثالیں کم ہیں مگر ہیں۔ویسے مثنویاں اور مختلف بحروں میں طویل افسانوی نظمیں بہت لکھی گئی ہیں۔ایسی افسانوی نظمیں اور ڈرامے حمایت صاحب نے بھی کافی لکھے ہیں۔اس وقت میں بات کر رہی ہوں ان کے خطوط کی۔حمایت صاحب نے منظوم خطوط بھی لکھے ہیں اور جیسا کہ میں عرض کر رہی ہوں ان کے بعض خطوط ایک خصوصیت رکھتے ہیں۔اس قسم کے خطوط عموماً تاریخی مسائل سے متعلق ہیں جو انھوں نے اپنی بیوی یا اپنے کسی بیٹے کو لکھے ہیں۔ان کا سب سے چھوٹا بیٹا بلند اقبال جو کہ ڈاکٹر ہے زمانہ طالب علمی میں کسی بات پر اپنی امی سے روٹھ کر منہ پھلا کر بیٹھ گیا تھا۔گھنٹوں کسی سے بات نہ کی کھانا بھی نہیں کھایا۔ظاہر ہے کہ ماں پریشان ہوگی لہٰذا انھوں نے حمایت صاحب کو اس کی طرف متوجہ کیا اور چاہا کہ کسی طرح اس کا غصہ اُتر جائے۔چناں چہ شاعر باپ نے، اپنے بیٹے کو منانے کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا اور بیٹے کو ایک منظوم خط لکھ ڈالا۔میں یہاں اس خط کی چند سطور نقل کرتی ہوں آپ بھی محظوظ ہوں

مرے بیٹے، مرے پیارے بلند اقبال میرے خوبرو بیٹے
سنا ہے تم کو اپنی پیاری امی کی نصیحت کچھ گراں گزری

سنا ہے وہ تمھیں یہ کہہ رہی تھیں۔اپنے کالج کے سوا تم دوستوں کے ساتھ تفریحاً کہیں جاؤ۔تو ابا جان یا امی کو بتلا بھی دیا کرنا۔سنا ہے کچھ یہی باتیں تھیں جن پر تم بہت جھلائے اور آنسو بہا کر اپنے کمرے میں چلے آئے۔

میرے بیٹے تمھیں میں کیسے سمجھاؤں، تمھارے ذہن پر تو سارے گھر کو ناز ہے اتنا کہ ہم سب دل

ہی دل میں فخر کرتے ہیں۔

خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے آخری بیٹا بھی ہم کو اتنا پیارا، اس قدر اچھا دیا۔ اللہ سب کو ایسے بیٹوں سے نوازے.....

خط طویل ہے پورا خط وزن اور بحر میں ہے اور شاعری کی اصطلاح میں ''پورا خط ایک مصرعہ'' ہے۔

یہاں یہ بات بھی نامناسب نہ ہوگی اگر میں کہوں کہ شاعر باپ کے اس بیٹے میں بھی ادبی ذوق کہیں اندر ہی اندر پل رہا تھا اور وہ اس خط کو پڑھتے پڑھتے ہی ٹھیک ہو گیا، کیوں کہ وہ اس نظر سے خط کو پڑھ رہا تھا کہ کہیں مصرعہ وزن سے تو نہیں گر گیا ہے۔ یہ خط بلند اقبال نے بہت سنبھال کر رکھا اور اپنے ایک مضمون میں بھی اس خط کا ذکر کیا ہے۔

حمایت صاحب ۱۹۵۱ء میں جب ہندوستان سے پاکستان آئے تھے تو ان کی شادی کو صرف دو سال گزرے تھے اور وہ روزانہ ایک خط بھابی معراج کو لکھا کرتے تھے۔ ان خطوط میں کچھ خطوط منظوم ہیں۔ ایک خط کا اقتباس پیش خدمت ہے:

تمھارا خط مل گیا ہے معراج
پڑھ کے بے حد خوشی ہوئی
کہ میری ننھی سی بیٹی اب
پاؤں چل رہی ہے
کہ میری بیٹی ادھورے فقروں میں یاد کرنے لگی ہے مجھ کو
وہ صبح اٹھتے ہی ریڈیو کو تھپکنے لگتی ہے۔ ابا ابا پکارتی ہے۔
وہ یہ سمجھتی ہے بند ہیں ریڈیو میں اُس کے ''حضور ابا''
وہ کس قدر عقل مند ہے، کتنی نکتہ رس ہے
میں آج ان ننھے ننھے قدموں، ادھورے فقروں سے دور اس اجنبی زمیں پر
خدا کی آزاد مملکت میں
بہ فیض افلاس، اپنی ویران خلوتوں کو سمیٹے آوارہ پھر رہا ہوں

یہ خط بہت پیارا ہے، بیٹی کی محبت، باپ بننے کا نیا نیا احساس، بیوی کی جدائی اور ایک نئے ملک میں، زندگی دوبارہ آغاز کرنے کا تجربہ اور پھر یہاں کے حالات سے متاثر ہو کر شاعری کرنا۔ نظمیں

لکھنا سبھی کا حوالہ ہے۔ ایک خط کے آخری مصرعے میں:

میں آج اپنے شکستہ لفظوں کو جوڑ کر
ایک نظم کہنے لگا ہوں
دیکھو
وہ کوئی نظم ہوتی ہے یا کوئی مرثیہ ہمارا
تم اس کو پڑھ لو
مگر اسے پھاڑ دو خدارا

حمایت صاحب کے نجی خطوط میں بھی، زندگی کے عمومی اور بعض اہم مسائل اپنے مخصوص پس منظر کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ جس سے ان کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس سے پہلے کہ میں ان کے نثری خطوط کی طرف آؤں ان کے حالیہ کچھ منظوم خطوط یاد آ گئے، کراچی سے ایک رسالہ نکلتا ہے۔ ''شاعری'' اس کے ایڈیٹر سہیل غازی پوری ہیں اس کی خصوصیت یہ ہے کہ رسالے میں طبع شدہ ہر تحریر منظوم ہوتی ہے حتی کہ اشتہارات بھی۔ چناں چہ اس میں حمایت صاحب نے بھی منظوم خطوط لکھے ہیں۔ ان میں بعض خطوط تنقیدی ہیں۔

مجھے اک بات کہنی ہے
جو غزلیں آپ نے چھاپی ہیں وہ کچھ اور بہتر ہوں تو اچھا ہو
رسالے میں بہت غزلیں ہیں شاید سو (۱۰۰)
خدا کے واسطے کچھ کم بھی کیجیے
پڑھنے والوں پر ذرا سا رحم بھی کیجیے
مگر خود آپ بھی مجبور ہیں شاید

بقولِ قیصرِ تمکین.. ہمارے ملک میں جس سمت بھی دیکھیں ''غزلچی ہی غزلچی ہیں''

بہت مظلوم یہ صنفِ سخن ہے یعنی ہر دل پھینک شاعر اس پہ قسمت آزماتا ہے۔ مگر یہ بھی تماشہ دیدنی ہے۔ ہر غزل میں چند ہی اشعار ہوتے ہیں اگر ان میں بھی کچھ بے وزن مصرعے ہوں تو سوچیں دل پہ کیا گزرے؟

میں کچھ اشعار لکھتا ہوں۔

ہمارے حصے میں آتی تھی جس کی ویرانی
کچھ ہم سے بھی تو اس آباد گھر کی بات کرو

☆☆

یہاں اک لفظ نے کیا ظلم ڈھایا ہے
اک اچھا شعر ضائع ہوگیا ہے

اسی طرح اور اشعار پر بھی تنقیدی نظر ڈالی ہے۔

''شاعری'' کے مختلف شماروں میں ایسے منظوم خطوط ملتے ہیں جو مختلف ادبی مسائل کا جائزہ لیتے ہیں۔ ایک خط میں علامہ اقبال کے ان فارسی اور اردو ''قطعات'' کا ذکر کیا ہے جن پر عنوان کے طور پر ''رباعیات'' لکھا ہوا ہے۔ اس پر ایک صاحب نے (نثر میں) حمایت صاحب کو گستاخی کی حد تک غصیلا خط لکھ دیا۔

''تم نے حضرت اقبال کے بارے میں جو بکواس کی ہے۔ اس سے میں بے حد خفا ہوں تم کو یہ تھوڑی شہرت کیا ملی، آپے سے باہر ہوگئے ہو..... یہ چھوٹا منہ بڑی باتیں۔ کبھی آئینہ دیکھا ہے؟ کہاں وہ اور کہاں تم! تم تو اس کے پاؤں کی جوتی کے بھی لائق نہیں ہو.....''

جناب شاعر نے جواباً اسے لکھا (منظوم)

''مرے اس ''دوست'' نے جو کچھ بھی لکھا ہے، میں اس کی قدر کرتا ہوں۔ یقیناً میں تو علامہ کے خاک پا کے بھی لائق نہیں ہوں۔ ہاں مگر اک عرض ہے..... ایسی پرستش آدمی کی شخصیت کو ''بت'' بنا دیتی ہے اور بت کی پرستش فکر کو جامد۔ (جمودِ فکر کے علامہ بھی قائل نہیں تھے) ہاں۔ اگر علامہ نے ایسا کیا کہ اپنے قطعوں کو ''رباعی'' لکھ دیا تو اس کا بھی کوئی سبب ہوگا کہیں میں نے پڑھا تھا۔ حضرتِ اقبال ''بابا طاہر عریاں'' کے پرستاروں میں تھے جو فارسی کے ایک بڑے شاعر تھے، اپنے چار مصرعوں کو ترانہ نام دیتے تھے، یگانہ بھی بڑے شاعر تھے (عریاں کے پرستاروں میں تھے)۔ ان کی رُباعی کا جو پہلا مجموعہ شائع ہوا تھا، اس کا بھی حضرت یگانہ نے ''ترانہ'' نام رکھا تھا۔ ذرا سوچو تو۔ آخر کیوں؟

ترانہ اور رُباعی میں کوئی تو قدر باہم مشترک ہوگی۔ کسی نقاد نے یہ بھی لکھا ہے ''حضرتِ اقبال نے یہ سارے قطعے ''بابا طاہر عریاں'' کے ترانوں کے تتبع میں لکھے ہوں گے۔ ''ترانہ'' ہی ''رباعی'' کا محرک ہے۔

پھر حمایت علی شاعر نے علامہ اقبال کے فارسی اردو قطعات لکھے جو ظاہر ہے کہ ''رباعی'' کی بحروں میں نہیں ہیں۔ مثلاً

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوہ تقدیرِ یزداں
تو خود، تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

☆☆

تراش از تیشۂ خود، جادۂ خویش[2]
براہ دیگراں رفتن عذاب است
اگر زردستِ کار نادر آید
گناہ ہے ہم اگر باشد ثواب است

یہ تو تھے منظوم خطوط کے کچھ مباحث۔ نثر میں جو خطوط ہیں ان میں مذہبی، سیاسی اور فلسفیانہ موضوعات پر بھی بحثیں ملتی ہیں۔ ان کے بعض خطوط کا انتخاب مجلّہ ''شخصیت''[1] میں بھی پیش کیا گیا ہے۔ جس میں ایک تفصیلی خط پروفیسر ریاض صدیقی[2] کے نام ہے۔ جس میں پاکستان کے بارے میں علامہ اقبال، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور بعض اسلامی تحریکات کا حوالہ ہے۔ پروفیسر ریاض صدیقی کی کتاب (مطالعہ اقبال) میں کچھ ایسے مسائل چھیڑے گئے تھے۔ حمایت صاحب نے ان مسائل کا تجزیہ تاریخی پس منظر میں کیا ہے اور بعض حقائق نمایاں کیے ہیں۔ یہ خط خاصا طویل ہے اور اس میں علامہ اقبال کے ان اشعار سے بھی بحث کی گئی ہے جو انھوں نے اپنی مختلف کتابوں میں مولوی اور مُلّا کے بارے میں لکھے ہیں اور مودودی صاحب کی ان تحریروں کا بھی حوالہ دیا ہے جو ان کی کتاب ''مسلماں اور موجودہ سیاسی کشمکش'' (۳ رجلدیں) مطبوعہ ۱۹۳۷ء، ۱۹۳۸ء اور ۱۹۴۰ء میں شامل ہیں۔ بعد ازاں ان سے متعلق توجیہات ان کے رسالے ''ترجمان القرآن'' ستمبر،

اکتوبر ۱۹۴۵ء اور فروری ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئیں۔ حمایت صاحب نے مولانا اسعد گیلانی کی کتاب ''اقبال، مودودی اور دارالسلام'' اور ایک اور کتاب ''تشکیل پاکستان'' کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ جس میں علامہ اقبال اور مودودی صاحب کے تعلقات اور خطوط کا ذکر ہے۔ حمایت صاحب نے ثابت کیا ہے کہ علامہ اقبال اور مودودی صاحب کے درمیان کبھی کوئی تعلق نہیں رہا اور نہ علامہ کی کسی تحریر میں مودودی صاحب کا ذکر ہے۔ انھوں نے دلائل کے ساتھ یہ بھی ثابت کیا ہے کہ مودودی صاحب، علامہ اقبال اور پاکستان میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ حمایت علی شاعر نے اقبال کے ان خطوط کا بھی ذکر کیا جو تصور پاکستان کے تعلق سے انھوں نے مولانا راغب احسن اور ڈاکٹر تھامسن کے نام لکھے تھے۔ علامہ اقبال نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ:

''پاکستان اسکیم نے کیمبرج یونیورسٹی میں جنم لیا ہے''

ان کا اشارہ چوہدری رحمت علی کی طرف تھا۔

جہاں تک خطبہ آلہ آباد ۱۹۳۰ء کی بات ہے علامہ نے اس بارے میں بھی ایک خط میں واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ

''پاکستان میری اسکیم نہیں ہے۔ میں نے اپنے خطبے میں جس مسلمان صوبے کا ذکر کیا تھا یعنی شمال مغرب کا وہ علاقہ جہاں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے۔ میری اسکیم کے تحت یہ نیا صوبہ ہندوستانی وفاق کا ہی حصہ ہوگا۔''

(ڈاکٹر تھامسن کے نام خط۔ مورخہ ۴ر مارچ ۱۹۳۴ء)

انھوں نے قائداعظم اور مسلم لیگ کو بھی مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی سرگرمیوں کا مرکز دہلی اور لکھنؤ کے بجائے پنجاب کو بنائیں اور اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو استعمال کرتے ہوئے یہ خیال رکھیں کہ وہ ''ہجرت'' پر مائل نہ ہوں۔ حمایت صاحب کا یہ خط پہلے ماہنامہ ''طلوع افکار'' (کراچی، فروری ۱۹۸۸ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس خط میں اور بھی بہت سی اہم باتیں ہیں جو ہمیں سوچنے پر آمادہ کرتی ہیں۔

حمایت صاحب اپنے ہم عصروں میں غالباً وہ واحد شخص ہیں جو دنیا کے ہر براعظم میں جا چکے ہیں۔ امریکہ، کینیڈا، یورپ اور ایشیاء کے علاوہ افریقہ اور آسٹریلیا کے مختلف ملکوں اور شہروں میں قیام پذیر ہو چکے ہیں۔ اُن مقامات سے بھی انھوں نے اپنے گھر اور اپنے دوستوں کے علاوہ مختلف

رسائل کو بھی کچھ خطوط لکھے ہیں۔ جو ان دنوں ''نئی قدریں'' (۱۹۶۳ء) ''ادب لطیف'' اور ''تخلیق'' (لاہور) ''کتاب نما'' (دہلی) ''افکار''، ''سب رس'' اور ''فاران'' (کراچی) ''سفیر'' (پشاور) اور ''اخبار جہاں'' (کراچی) ۱۹۸۲ء سے ۱۹۹۵ء تک کے مختلف شماروں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ مجلّہ ''شخصیت'' میں جو خطوط شامل ہیں وہ پاکستان، ہندوستان کے علاوہ بنگلہ دیش، گیمبرون (بوٹسوانا افریقہ) کنگسٹن اور ونڈسر (کینیڈا)، میامی (امریکہ)، یازو (لندن) اور سڈنی (آسٹریلیا) سے لکھے گئے تھے۔ انھوں نے اپنے کچھ خطوط میں تحقیقی بحثیں کی ہیں مثلاً ایک خط میں فیض صاحب کی ایک نظم میں شامل ''محبوب علی خاں آصف'' کے تین مصرعے جنھیں فیض صاحب نے داغ کے حوالے سے اپنایا تھا اور بیشتر ادبی حلقے انھیں فیض صاحب ہی کی تخلیق سمجھ رہے تھے، ان کے حوالے سے بھی بات کی ہے۔ وہ تین مصرعے درج ذیل ہیں۔

لاؤ تو قتل نامہ مرا، میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مُہر ہے سر محضر لگی ہوئی

اور اسی غزل میں ایک اور مصرعہ

تہمت تمھارے عشق کی ہم پر لگی ہوئی

یہ شعر اور مصرعہ محبوب علی خاں آصف کا ہے۔ ان کی اس غزل کا یہ شعر بھی بہت مشہور ہے کہ:

الفت کا جب مزا ہے کہ دونوں ہوں بے قرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

حمایت صاحب کی نظر سے محبوب علی خاں آصف کی یہ غزل اس کتاب میں گزری تھی جو ۱۹۲۴ء میں بمبئی سے چھپی تھی۔ کتاب کا نام تھا ''گنج موسیقی'' (چراغ ہارمونیم) (مولفہ) پروفیسر چراغ دین (ہارمونسٹ) سیالکوٹی۔ حمایت علی شاعر کا اس کتاب کے حوالے سے یہ بھی کہنا ہے کہ ''اس کتاب میں جو بھی کلام منتخب کیا گیا تھا اس کے بارے میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ اُس کی دھن کس راگ میں ہے وہ دادرہ میں ہے یا ٹھمری میں؟'' اس کتاب میں آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں کے بعض گیتوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ حمایت صاحب کی لائبریری میں مجھے اس نادر کتاب کو پڑھنے کا بھی موقع ملا۔ محبوب علی خاں آصف کی مذکورہ غزل کی دھن ''راگ بروا'' میں بنائی گئی تھی۔

اسی طرح ترقی پسند مصنفین کانفرنس (بھیموی) ۱۹۴۹ء ایشین پوئٹری فیسٹیول (ڈھاکہ) ۱۹۸۷ء جشن احمد ندیم قاسمی (عرب امارات) کے بارے میں ان کے لکھے ہوئے خطوط بھی قابل مطالعہ ہیں۔

خطوط سے متعلق یہ مضمون کافی طویل ہوتا جارہا ہے۔ میں یہاں یہ بھی بتاتی چلوں کہ جب مجھے ان نادر خطوط کا بڑا ذخیرہ نظر آیا تو میں نے ایک اور منصوبہ بنایا کہ میں ان خطوط کا ایک انتخاب کتابی شکل میں شائع کردوں آپ نے بھی اوپر درج شدہ مثالوں سے ان خطوط کی علمی اور ادبی اہمیت کا اندازہ لگا ہی لیا ہوگا۔

باب ہفتم

حمایت علی شاعر اور معاصرین

حمایت علی شاعر کا خاندانی نام میر حمایت ہے لیکن وہ ادبی دنیا میں حمایت علی شاعر کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ۱۴ر جولائی ۱۹۲۶ء کو اورنگ آباد حیدرآباد دکن میں سیّد تراب علی کے گھر ولادت ہوئی۔ ابھی صرف تین سال کے تھے کہ والدہ محترمہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئیں۔ یہ پہلا جھٹکا تھا جو حمایت صاحب کے ذہن و دل کو اس چھوٹی سی عمر میں لگا تھا اور میں سمجھتی ہوں کہ اسی جھٹکے نے ان کے ذہن اور ان کی شخصیت کو جس طرح متاثر کیا اس کے اثرات ساری زندگی ان پر مرتب ہوتے رہے اور آج وہ جو کچھ بھی ہیں انھی اثرات کے باعث ہیں۔ بس یہ اللہ کا خاص کرم اور شاید ان کے نام کا اثر ہے کہ وہ ان تمام باتوں کے نتیجے میں ایک پازیٹو شخصیت بن کر اُبھرے ورنہ جن حالات کا سامنا حمایت صاحب نے کیا وہ ایک مکمل نیگیٹو شخصیت با آسانی بن سکتے تھے۔ والدہ کی وفات کے چند ہی سال بعد حمایت علی شاعر کی اکلوتی اور بڑی بہن نے بھی عدم آباد کا سفر اختیار کیا اور یوں حمایت صاحب بالکل تنہا رہ گئے۔ خدا محرومی کے اس احساس سے بچوں کو دُور رکھے۔

میرے خیال میں ماں اور بہن کے انتقال کے اثرات شعوری اور لاشعوری طور پر حمایت صاحب کے محسوسات پر اتنے شدید تھے کہ جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو وہ اندر سے بالکل ٹوٹ چکے تھے۔ انھی حالات کی بنا پر اسکول کی تعلیم میں بھی ان کا دل نہ لگتا تھا۔ وہ مطالعے کے بہت شوقین تھے لیکن نصابی کتابوں کے بجائے دوسری کتابیں اور رسائل ان کے زیرِ مطالعہ رہتیں جو انھیں نیا شعور عطا کر رہی تھیں۔ سماجی، سیاسی اور مذہبی اعتبار سے وہ نئے انداز میں سوچنے لگے اور اورنگ آباد کے روایتی تنگ نظر ماحول سے نکل کر اس فضا میں آنا چاہتے تھے جو انھیں ایک نئی دنیا کی بشارت دے رہی تھی۔ ان کے محبوب شعرا میں علامہ اقبال اور مخدوم محی الدین اور نثر میں علامہ نیاز فتح پوری شامل تھے۔ انھی کو پڑھ پڑھ کر پہلے اپنے ہم عمروں میں اور بعد میں بزرگوں کے ساتھ بحث و مباحثہ کرنے لگے اور آخر کار اپنے ماتھے پر خاندان کے بگڑے ہوئے نوجوان کا لیبل لگا کر

ایک روز گھر سے نکل کھڑے ہوئے یہ کہہ کر کہ اب اپنی زندگی خود بنائیں گے اور یوں وہ اورنگ آباد سے حیدرآباد دکن چلے آئے۔ یہاں سے ان کی پریکٹیکل لائف کا آغاز ہوتا ہے۔ یہاں انھوں نے اخباروں میں کالم لکھے۔ پھر ریڈیو پہنچے۔ اناؤنسر اور نیوز ریڈر منتخب ہوگئے اور اس طرح ان کے لکھنے پڑھنے کا سلسلہ بھی برقرار رہا اور روزی کا بھی بندوبست ہوگیا۔ یہیں انھیں محبت کی معراج بھی حاصل ہوئی یعنی انھوں نے پہلا اور آخری اور یک طرفہ عشق کیا اور اس راہ کے تمام کانٹے چنتے ہوئے ۱۴ فروری ۱۹۴۹ء کو شادی بھی کرلی۔ آپ اس کی تفصیل ''آئینہ در آئینہ'' (جوان کی منظوم سوانح حیات ہے) میں پڑھ کر لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ حیدرآباد دکن میں ایک بھجن لکھنے کی پاداش میں ان کو پاکستان کا سفر اختیار کرنا پڑا اور کراچی میں قائداعظم کے مزار کے اطراف میں بنی ہوئی جھونپڑیوں میں سے ایک ان کا مسکن ٹھہری۔ یہاں انھوں نے کراچی ریڈیو سے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ جب وہ پاکستان آئے تو صرف میٹرک پاس تھے، لہٰذا انھوں نے ۱۹۵۲ء میں اردو کالج میں داخلہ لے کر اپنے تعلیمی سفر کو جاری رکھا۔ ۱۹۵۵ء میں حیدرآباد سندھ میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا تو حمایت صاحب نے اپنا تبادلہ وہاں کرالیا۔ میرے خیال میں یہ شاید نام کی کشش تھی جو حمایت صاحب کو کھینچ کر وہاں لے گئی۔ حیدرآباد میں سٹی کالج سے گریجویشن کرنے کے بعد سندھ یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم اے کیا۔ پی ایچ۔ ڈی کرنا چاہتے تھے لیکن اپنی روزانہ بڑھتی ہوئی مصروفیات کے باعث نہ کر سکے۔ گو کہ حمایت صاحب جیسے انسان کے لیے یہ ذرا بھی مشکل نہ تھا۔ ۱۹۵۶ء میں دو ماہی رسالے شعور کا آغاز کیا۔ ریڈیو کے لیے ڈرامے، غنائیے اور گیتوں بھری کہانیاں لکھیں۔ تنقیدی اور تحقیقی مضامین لکھے اور ۱۹۶۰ء میں ''ثلاثی'' بھی لکھنا شروع کی۔ اسی دوران وہ فلمی نغمہ نگاری بھی کرنے لگے جو بالکل حادثاتی طور پر شروع ہوئی۔ ہوا یوں کہ ان کی ایک نظم ''آن کہی'' مشاعروں میں بہت مقبول تھی اور ان کے ریڈیو کے ایک ساتھی موسیقار خلیل احمد کو بھی بہت پسند تھی۔ انھوں نے اس کے کچھ اشعار فلم ''آنچل'' کے لیے سلیم رضا کی آواز میں ریکارڈ کر لیے۔ ''تجھ کو معلوم نہیں تجھ کو بھلا کیا معلوم'' یہ نغمہ لاہور میں ریکارڈ ہوا اور اتنا مقبول ہوا کہ پروڈیوسر نے پھر اپنی فلم کے تمام نغمے ہی حمایت صاحب سے لکھوائے اور جب فلم ریلیز ہوئی تو اس فلم کے ایک نغمے پر انھیں بہترین نغمہ نگار کا نگار ایوارڈ حاصل ہوا۔ وہ نغمہ تھا ''کسی چمن میں رہو تم بہار بن کے رہو'' اور یہاں سے وہ فلم نگر کی سیر کو روانہ ہوگئے۔ بڑی محبتیں بڑی چاہتیں، بہت دولت

بہت شہرت اور بہت سے اعزازات حاصل ہوئے۔ پھر جب انھوں نے یہ محسوس کیا کہ اب ان کا فلم انڈسٹری میں رہنا ٹھیک نہیں ہے کیوں کہ بچے بڑے ہو رہے ہیں کہیں فلم نگر کی چکاچوند انھیں منزل سے نہ بھٹکا دے تو انھوں نے فلم انڈسٹری چھوڑ دی اور سندھ یونیورسٹی میں استاد کے منصب پر فائز ہوگئے۔ میں نے قدم قدم پر یہ محسوس کیا ہے کہ شاعر صاحب ہر کام بہت قرینے سے سلیقے سے اور بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ انھوں نے تعلیم سے اپنا رشتہ ہمیشہ جوڑے رکھا اور نہ صرف اپنے والد کی خواہش کے احترام میں خود اعلیٰ تعلیم حاصل کی بلکہ اپنے ماشاءاللہ ۸ بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔

یہ تو حمایت صاحب کی ذاتی زندگی یا شخصیت کے حوالے سے ایک سرسری سا خاکہ تھا جو میں نے پیش کیا۔ حمایت صاحب آج ماشاءاللہ اکیاسی برس کے ہیں۔ اللہ انھیں سلامت رکھے۔ انھوں نے زندگی بھر سخت محنت کی ہے وہ ایک مکمل فن کار ہیں۔ اس لیے میں مناسب سمجھتی ہوں کہ ان کی فنی زندگی کی بھی ایک جھلک آپ کو دکھلا دوں۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ شاعر صاحب زندگی بھر مختلف ذمہ داریاں نبھاتے رہے جن میں صحافت ادارت اور تدریس کے شعبے نمایاں ہیں۔ تدریس کے فرائض کا آغاز انھوں نے چکل سرمست کالج حیدرآباد سندھ سے کیا پھر سندھ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو سے وابستہ رہے۔ صحافت وادارت سے منسلک ہونے کے باعث وہ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا دونوں سے وابستہ رہے۔ ریڈیو کی ابتدا حیدرآباد دکن اور آل انڈیا ریڈیو سے ہوئی جو کراچی سے ہوتی ہوئی حیدرآباد سندھ تک جا پہنچی اور یہ سفر آج بھی جاری ہے۔

ٹی وی پر انھوں نے کراچی، لاہور اور اسلام آباد اسٹوڈیوز سے مختلف نوعیتوں کے پروگرام پیش کیے جو آج بھی لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں۔ کچھ پروگراموں کے نام آپ کو یاد دلاتی ہوں:

۱۔ محبتوں کے سفیر	سندھی شعرا کا اردو کلام ۵۰۰ سال پرمبنی	۱۹۵۹ء میں
۲۔ غزل اس نے چھیڑی	اردو غزل کے ۷۰۰ سال	۱۹۷۴ء میں
۳۔ خوشبو کا سفر	علاقائی زبانوں کے شعرا کا اردو کلام ۵۰۰ سال پرمبنی	۱۹۸۸ء میں
۴۔ عقیدت کا سفر	اردو نعتیہ شاعری کے ۴۰۰ سال	۱۹۸۸ء میں
۵۔ لب آزاد	احتجاجی شاعری کے ۴۰۰ سال	۱۹۸۹ء میں

۶۔عقیدت کاسفر	پاکستان میں نعتیہ شاعری	۱۹۹۵ء میں
۷۔نشورِ آزادی	تحریک آزادی میں اردو شاعری کا حصہ ۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء	۱۹۹۶ء میں

ٹی وی پر مختلف پروگرامز کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ٹی وی کے علاوہ حمایت صاحب کا تعلق فلم سے بھی براہِ راست رہا ہے۔انھوں نے فلم کے نغمات، مکالمے اور منظر نامے تحریر کیے۔۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۶ء تک وہ فلموں سے منسلک رہے۔بحیثیت نغمہ نگار ان کی پہلی فلم ''آنچل'' ۱۹۶۲ء میں۔ بحیثیت نغمہ نگار و مکالمہ نگار پہلی فلم ''تصویر'' ۱۹۶۵ء میں بحیثیت فلمساز و نغمہ نگار پہلی فلم ''لوری'' ۱۹۶۶ء میں اور بحیثیت فلمساز، ہدایتکار اور نغمہ نگار پہلی فلم ''گڑیا'' ۱۹۷۶ء میں منظر عام پر آئی۔

جہاں تک پرنٹ میڈیا کا تعلق ہے تو حمایت صاحب دکن میں روزنامہ ''جناح''، ''منزل''، ''ہمدرد'' اور ''سازِنو'' سے منسلک رہے۔ پاکستان آنے کے بعد انھوں نے ''شعور'' حیدرآباد سندھ میں ادارتی خدمات انجام دیں۔ان کے علاوہ سندھ یونیورسٹی میں مجلّہ ''صریرخامہ'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔شاعر صاحب کی مطبوعات کی ایک طویل فہرست ہے جو مندرجہ ذیل ہے:

۱۔آگ کادریا	نظموں، غزلوں اور رُباعیات پر مبنی شعری مجموعہ	۱۹۵۶ء میں
۲۔مٹی کا قرض	ثلاثیاں۔نظمیں۔غزلیں	۱۹۷۶ء میں
۳۔تشنگی کا سفر	طویل افسانوی و تمثیلی نظمیں	۱۹۸۱ء میں
۴۔ہارون کی آواز	نظمیں اور غزلیں	۱۹۸۵ء میں
۵۔حرف حرف روشنی	منتخب کلام	۱۹۸۶ء میں
۶۔عقیدت کا سفر	نعتیہ شاعری کے سات سو سال	۱۹۹۹ء میں
۷۔آئینہ در آئینہ	منظوم خودنوشت سوانح حیات	۲۰۰۱ء میں
۸۔شیخ ایاز (نثر)	جدید سندھی ادب کا عہد آفریں شاعر	۱۹۷۸ء میں
۹۔شخص و عکس (نثر)	تنقیدی مقالات و مباحث	۱۹۸۴ء میں
۱۰۔کھلتے کنول سے لوگ	دکن کے اہلِ قلم	۲۰۰۰ء میں
۱۱۔حمایت علی شاعر کے ڈرامے	(ڈرامے)	۲۰۰۵ء میں
۱۲۔کلیات	شاعری	۲۰۰۸ء میں

شاعر صاحب کی اکثر کتابوں کے تراجم انگریزی، ہندی اور سندھی زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔مزید بیس کتابیں طباعت کے مختلف مراحل میں ہیں جن میں منظوم و منثور دونوں شامل ہیں۔حمایت صاحب کے فن کے قدرداں پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور یوں حمایت صاحب امریکا، کینیڈا، برطانیہ، ناروے، سوئیڈن، جنوبی امریکا، ماریشس، چین، سعودی عرب، کویت، مسقط، بحرین، عرب امارات، ہندوستان، بنگلہ دیش اور آسٹریلیا کا سفر چکے ہیں۔ جب کہ ۱۹۹۵ء میں وہ اپنی ادبی خدمات کے اعتراف میں امریکا کی اعزازی شہریت بھی حاصل کر چکے ہیں۔

اب جب بات اعتراف کی آ ہی گئی ہے تو بتاتی چلوں کہ انھیں ۵۹ء میں صدارتی ایوارڈ۔۶۳، ۱۹۶۲ء میں نگار ایوارڈ۔۱۹۷۴ء میں رائٹرز گلڈ آدمجی ادبی ایوارڈ۔۱۹۸۵ء میں علامہ اقبال ایوارڈ۔ ۱۹۸۷ء میں عثمانیہ گولڈ میڈل اور نقوش ایوارڈ۔ ۱۹۸۸ء میں نگار ایوارڈ۔ ۱۹۸۹ء میں مخدوم محی الدین عالمی ایوارڈ۔ ۱۹۹۱ء میں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ۔۱۹۹۳ء میں ریڈیو کا ایوارڈ برائے اعلیٰ کارکردگی اور جامعہ عثمانیہ کا ایوارڈ۔ ۱۹۹۴ء میں وثیقۂ اعتراف ہمدرد فاؤنڈیشن اور لائف لانگ اچیومنٹ ایوارڈ نیوجرسی۔۱۹۹۹ء میں بہترین ڈرامہ نگار اور ٹاپ ٹین ایوارڈ۔۲۰۰۰ء میں نشانِ اردو آسٹریلیا، نیاز فتح پوری ایوارڈ اور نشانِ فضیلت سادات امروہہ۔۲۰۰۱ء میں نشانِ اعزاز جامعہ عثمانیہ اور لائف اچیومنٹس ایوارڈ واشنگٹن۔۲۰۰۲ء میں صدارتی ایوارڈ برائے حسنِ کارکردگی یعنی پرائیڈ آف پرفارمنس عطا کیے جا چکے ہیں۔حمایت صاحب نے ساری زندگی بہت متنوع کام انجام دیے لیکن ان پر بھی بہت کام ہوا جس کی ایک جھلک میں پیش کرتی ہوں۔

حمایت علی شاعر نمبر ۲رجون ۱۹۸۵ء روزنامہ ''اورنگ آباد ٹائمز'' مہاراشٹر، گوشۂ حمایت علی ۱۰راگست ۱۹۸۷ء۔روزنامہ ''کلیم''، سکھر۔گوشۂ حمایت علی شاعر جولائی ۱۹۹۵ء ماہنامہ ''طلوعِ افکار'' کراچی۔گوشۂ حمایت علی شاعر اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۵ء سہ ماہی مجلّہ ''عثمانیہ'' کراچی اور ''لوح ادب'' حیدرآباد۔حمایت علی شاعر نمبر ۴رجولائی ۱۹۹۶ء مجلّہ شخصیت کراچی (۶۰۰ صفحات پر مبنی)۔ ان کے علاوہ ایک ضمیمہ ''دی اسکالر پوئٹ'' کے نام سے جسے کینیڈا میں پروفیسر عبدالقوی ضیا نے مرتب کیا تھا اور یہ سارے مضامین انگریزی زبان میں لکھے گئے ہیں۔حمایت علی شاعر فن اور شخصیت برائے ایم اے اردو ادب۔مقالہ نگار رشید احمد۔سندھ یونیورسٹی مقالہ برائے ایم اے

اردو کراچی یونیورسٹی۔ مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی کراچی یونیورسٹی مقالہ نگار رعنا اقبال۔

اس وسیع و عریض دنیا میں حمایت صاحب کے چاہنے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ ان کی شخصیت، ان کا فن، ان کی تمام ادبی خدمات ان کے چاہنے والوں کے لیے خوشی اور مسرت کا پیغام ہیں۔ لیکن ان کی یہ تمام خوبیاں، ان کے تمام اعترافات، ان کے تمام اعزازات چند ہستیوں کے لیے ناقابلِ برداشت بھی رہے ہیں۔ اور وہ ہمیشہ ان پر نکتہ چینی کے فرائض بڑے خشوع و خضوع سے انجام دیتے رہے ہیں۔ حمایت صاحب کے کچھ چاہنے والوں نے ریکارڈ کی درستگی کے لیے وہ تمام چیزیں مرتب کرنے کا فیصلہ کیا اور یوں ۱۹۹۴ء میں ''احوالِ واقعی'' کے نام سے مرزا اسلیم بیگ نے ایک کتاب مرتب کی جس میں حیدرآباد سندھ کی ادبی سیاست کے حوالے سے ایک دستاویز ''چراغِ بکف'' کے نام سے منظرِ عام پر آئی۔ ''آئینہ در آئینہ'' کے بارے میں متنازعہ تحریریں اور اہلِ نظر کے تاثرات کو ''بارش سنگ سے بارش گل تک'' کے نام سے مجھ ناچیز نے مرتب کیا اس کے علاوہ ''تشکیک یا غلاظت'' کے نام سے بھی ایک کتاب راقم الحروف نے مرتب کی۔

حمایت صاحب کی شخصیت اور فن دونوں ہی اس قدر متنوع ہیں کہ ہر پہلو پر ایک ایک ضخیم کتاب تیار کی جاسکتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ایسا ہوگا بھی۔ ابھی ان کے چاہنے والے ان سے محبت کرنے والے بڑی تعداد میں موجود ہیں جو ان کے لیے کام کرتے رہیں گے، آنے والی نسلوں تک حمایت صاحب کے کارنامے پہنچاتے رہیں گے اور صدیوں تک حمایت صاحب کو زندہ رکھیں گے۔ ان تمام باتوں کے باوجود حمایت صاحب اپنے صرف ایک کارنامے کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

بس ایک کام کیا میں نے زندگی بھر میں
کہ سارے بچے ہیں تعلیم یافتہ گھر میں

بلاشبہ یہ کام بہت اہم ہے جو ایک شاعر نے انجام دیا لیکن میں اس کا کریڈٹ بیگم شاعر کو دیتی ہوں کیوں کہ ہر بڑی شخصیت کے پیچھے کسی خاتون کا ہاتھ ہوتا ہے۔

☆☆

حمایت صاحب کم و بیش گزشتہ ساٹھ سال سے قلم سے اپنا رشتہ جوڑے ہوئے ہیں اور بہت صبر کے ساتھ اس میدان میں اپنے قدم جمائے ہوئے ہیں۔ اہلِ علم و ادب ان کی ''تمام تر سرگرمیوں''

سے بخوبی واقف ہیں۔ گو کہ ''سکہ بند ناقدانِ فن'' ان پر وہ ''مہربانیاں'' نہیں کرتے جو انھیں کرنی چاہئیں لیکن ''سنجیدہ اہلِ قلم'' نے کبھی بھی حمایت صاحب سے صرفِ نظر نہیں کیا۔ اکثر اہلِ قلم کے تاثرات مقالے میں مختلف حوالوں سے آ ہی چکے ہیں میں ذیل میں چند اور اہلِ قلم حضرات کی تحریروں سے کچھ اقتباسات پیش کر رہی ہوں۔

فیض احمد فیض حمایت صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''برسوں سے ادب پر طاری جمود کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ عوامی اور جمہوری دور میں شاعر اور ادیب اپنی شاعری اور نثر کے ذریعے معاشرے کو خرابیوں سے پاک اور اُجلا بنانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ موجودہ شاعر اور ادیب زمانے کے جدید تر تقاضوں کے مطابق اپنی تخلیقات عوام کے سامنے پیش کر رہے ہیں اس طرح ادب پر جمود طاری ہونے کی شکایت کی تلافی ہوگئی ہے۔ موجودہ شاعروں کا اندازِ شخصیت اور رنگ جدا جدا ہے۔ حمایت علی شاعر نے جدید شاعری میں بہت سے ایسے پیرائے وضع کیے ہیں جو پہلے نہ تھے۔ ان کی شاعری میں تحمل اور تجسس کا احساس موجود ہے۔ حمایت صاحب نے بیشتر چیزوں کا مطالعہ خارجی فکر سے کیا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب ''مٹی کا قرض'' میں لخت لخت کو بڑی خوبی کے ساتھ جمع کیا ہے۔ وہ بہت ضبط اور نظم کے ساتھ لکھتے ہیں۔ آج کل لوگوں کو پرانی روایات کو توڑنے پھوڑنے کا شوق ہے جو یقیناً صحت مند بات ہے لیکن روایات کو پاؤں تلے روند دینا اچھی بات نہیں ہے، اور حمایت علی شاعر نے ماضی کی روایات کو پائمال نہیں کیا...'' (''مٹی کا قرض'' کی رونمائی میں خطاب۔ جنوری ۱۹۷۵ء)

رئیس امروہوی لکھتے ہیں کہ...

''جن سخن ور حضرات کی ادبی حیثیت سے، دنیا میں روشناسی ہے، ان میں سرفہرست جناب حمایت علی شاعر کا نام بھی ہے۔ ادب شناسی، شعر فہمی، نکتہ رسی تو ضمنی خصوصیتیں ہیں اصل صفت ان کا پاکیزہ ادبی شعور اور تخلیقی جوہر ہے۔ حمایت علی شاعر کے سینے میں دلِ زندہ دھڑک رہا ہے اور اس دلِ زندہ میں انسانیت کے درد اور نوعِ انسانی کے سوزِ نہاں کی برق چندہ چمک رہی ہے۔ ان کی ایک طویل نظم ''بنگال سے کوریا تک'' بڑی خوب صورت اور دل کش نظم ہے۔ اس نظم کے پس منظر میں جراحت خوردہ انسانیت کی غم ناک موسیقی گونج رہی ہے۔ تیسری دنیا کی زبوں حالی، مظلوم اقوام کی روحانی کش مکش، خوں آشام سامراجوں کے استحصالی ہتھکنڈے! بلاشبہ یہ تم ہر قسم کی ذہنی اور مادی

جارحیت کے خلاف ایک منظم اور منظوم احتجاج ہے۔ حمایت علی شاعر اب تک نثر و نظم کے پیرائے میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ نثر میں ان کی دو کتابیں ''شیخ ایاز'' اور ''شخص و عکس'' بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ حمایت علی شاعر کی نگاہِ نکتہ رس، تنقیدی ذوقِ پاکیزہ اور تحقیقی میلان، غیر جانب دارانہ اور محرمانہ ہے۔''

پروفیسر قمر رئیس ''دھرتی کی مہک کا صورت گر'' کے عنوان سے اپنے ایک مضمون[۲] میں لکھتے ہیں کہ...

''حمایت علی شاعر ایسے شعرا کی صف سے تعلق رکھتے ہیں جن کے علم و آگہی کا دائرہ خاصا معتبر اور مبسوط ہے، جو ایک طرف اُن کی تخیلی اڑانوں پر قابو رکھتا ہے تو دوسری جانب انھیں موضوع اور تخلیقی اظہار کے نت نئے تجربے کرنے پر اُکساتا ہے۔ جو انھیں طویل منظوم آپ بیتی سے ثلاثی کی شعری اکائی تک لے جاتا ہے۔ درمیان میں ''حرف حرف روشنی'' جیسی اوسط ضخامت کی نظمیں بھی ہیں۔ ناقدین کو حیرت ہوتی ہے کہ ان تینوں دائروں میں ان کا تخلیقی شعور تقریباً ایک جیسی فنی مہارت کا ثبوت دیتا ہے۔ حمایت علی شاعر کی متعدد نظموں میں بعض استعارے معنی خیز اور تہہ دار علامت کا روپ لے لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''لمحہ فکر'' میں سنگ یا پتھر کا استعارہ۔ جب زخمِ سر کھلتا ہے تو شاعر کو سنگ کے سرایت ہونے کا سراغ ملتا ہے۔ اس جہانِ معنی کی بے معنویت کا احساس ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر شے اسے سنگ پیراہن یا سنگ آئین نظر آتی ہے۔ دنیا ہو یا دین، ادب ہو یا آرٹ ہر خطہ میں اسے سنگ زاد نظر آتے ہیں۔ ان کی ایک مختصر سی نظم ہے ''پا بہ گل''۔ اس میں جنگل کی آزادہ روی سے عہدِ حاضر کی تمدنی زندگی تک انسانی فکر و شعور کے ارتقا کی روداد، بڑے compact شعری اسلوب میں بیان کی گئی ہے۔ یہ زمین کی چھاتی سے لگے، پا پیادہ انسانوں کا سفر بقولِ شاعر، ہر خواب، ہر حقیقت اور ارتقا کے ہر مرحلے کا گواہ ہے۔ لیکن اس طرح کہ زمین، اس کی مٹی، مہک اور اس کی ہوا، جو دھوپ کے لمس سے نمو اور روئیدگی کی ضمانت بنتی ہیں، اس کے تخیل میں مسلسل اذان دیتی ہیں، حمایت کی غزلوں کے دریچوں سے بھی زمین، ہوا، مٹی اور ہریالی سے انسان کی ازلی اور ثمر آور وابستگی جھانکتی نظر آتی ہے۔ حمایت علی شاعر کی فکر میں یہ زمین ناقابلِ تقسیم ہے۔ ایک اکائی ہے۔ بنی نوع انسان کی طرح ایک وحدت ہے۔ جغرافیائی اور سیاسی حد بندی، اس نظام کی مجبوری ہے جس کے خلاف انسان ہر دور میں احتجاج کرتا آیا ہے۔ شاعر اس کرۂ زمین کا ہی نہیں اس کو اپنی تہذیب سے آباد کرنے والے انسان کا بھی مدح خواں ہے۔

حمایت علی شاعر کی شاعری، اس زمین، اس کے رنگ و بو، اس کی ہریالی اور اس کے امن و اخوت کے خوابوں کی ہی صورت گری ہے۔''

مرزا ادیب ''اردو شاعری میں پتھر کا استعارہ'' کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ...

''حمایت علی شاعر نے اردو ادب کو زندہ و پائندہ شاعری دی۔ بہت ہی خوب صورت نظموں کا بہت ہی خوب صورت شاعر۔ شاعر کی ایک بڑی مختصر نظم کا عنوان ''زاویہ نگاہ'' ہے مگر یہ زاویہ نگاہ پتھر ہی کے کردار سے متعین ہوتا ہے اس لیے اس نظم میں پتھر کی بڑی اہمیت ہے۔

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت تراش لے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت نواز دے تو یہی خدا ہے

کتنی بڑی، کتنی واضح اور کتنی گہری حقیقت، ایک ایک لفظ بولتا ہوا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعر، بلاغت کی انتہائی بلندیوں کو چھو لیتا ہے۔ اس نظم کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ شاعر نے جس انداز سے انکشافِ حقیقت کیا ہے اس کی وضاحت کے لیے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ شاعر نے تین مصرعوں میں جو بات کہہ دی ہے اس کی متحمل طویل سے طویل نظم بھی نہیں ہو سکتی۔ یہ نظم ''ثلاثی'' کی تکنیک میں ہے اور یہ طرز خاص ایجاد ہے حمایت علی شاعر کی۔ مثلث ہمارے ہاں رائج ہے۔ مثلث ایک ایسی نظم ہوتی ہے جس کے ہر بند میں تین مصرعے ہوتے ہیں۔ مگر شاعر نے تین مصرعوں کو پوری نظم بنا دیا ہے۔ ''ثلاثی'' ہماری اپنی ایک صنف سے پھوٹی ہے اور نتیجتاً ہماری اپنی ہے۔ شاعر نے اس کی وساطت سے جو تخلیقی تجربہ کیا ہے وہ بہت کامیاب اور بہت مؤثر ہے۔''

اختر الزماں ناصر نے اپنے ایک مضمون بہ عنوان ''ماضی کا امین، مستقبل کا شاعر'' میں لکھا ہے کہ...

''مشاہدے کی تلخی اور تجربات کے روزنوں سے جھانکتے ہوئے امکانات کے روشن چہرے شاعر کے مخصوص اور پسندیدہ موضوعاتِ فکر ہیں اور اسی لیے میں ان کو ماضی کا امین اور مستقبل کا سخن ور تسلیم کرتا ہوں۔ ان کی طویل نظم ''حرف حرف روشنی'' اگر ایک طرف کلاسیکی دروبست کے باعث اردو کی شعری لفظیات میں ایک گراں قدر اضافہ ہے تو دوسری طرف نئی نسل کے نام ایک ایسا زندہ اور زندگی بخش پیام ہے جو اردو کے فکری سرمائے کو کبھی گھٹنے یا لٹنے نہیں دے گا۔

شمس الرحمٰن فاروقی۔ حمایت صاحب کی طویل منظوم خودنوشت سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اتنی ضخیم خودنوشت اور اتنے مفصل حالات سے بھرپور اور وہ بھی منظوم... میں نے نہیں دیکھی۔ پھر یہ کہ ساری کتاب ایک ہی بحر میں (چند نظموں کو چھوڑ کر) اور کہیں بھی روانی میں کمی نہیں۔ بھلا میں آپ کی تعریف کیا کرسکتا ہوں۔ اس وقت سب سے پہلے یہ عرض کروں گا کہ ''محاسبہ'' جیسی نظم اور خاص کر اس کا پہلا بند اگر میں کہہ لیتا تو سمجھ لیتا کہ میری زندگی کامیاب رہی۔ آپ نے ملک کی سماجی اور سیاسی تاریخ کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور واقعات بیان کرنے میں کچھ کمی بھی نہیں کی ہے۔ اس پر کمال یہ کہ کہیں تلخی یا تنگ نظری کا اظہار نہیں ہوا۔ جگہ جگہ ہلکا پھلکا طنز ضرور ہے لیکن اس سے کتاب کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ آپ نے ذاتی اور سیاسی دونوں طرح کے حقائق سے آنکھ ملانے میں کہیں بھی کمی نہیں کی۔ اس زبردست کتاب کی توصیف میں جو کچھ بھی لکھوں کم معلوم ہوتا ہے۔

نوشاد نوری کے ایک خط سے مختصر اقتباس پیش کر رہی ہوں جو ایک اہم موضوع کی طرف متوجہ کرتا ہے:

''تمھاری خودنوشت جو ''افکار'' میں مستقل شائع ہوتی رہی ہے بہت لطف دے گئی۔ اس پر بعض پیارے بہاری برہم بھی ہوئے۔ میں بھی بہاری ہوں۔ میں نے ایک ایک حرف صداقت پر مبنی پایا۔ اپنی مکمل پامالی میں بہاریوں نے خود بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ کتاب چھپ جائے تو مجھے آگاہ کرنا۔'' (ڈھاکہ۔ ۱۲ر جنوری ۲۰۰۰ء)

احمد ہمدانی نے حمایت صاحب کے بارے میں اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:

''حمایت نے اصنافِ شاعری کے سلسلے میں ایک صنفِ ثلاثی کا تجربہ کیا ہے۔ اس کے لیے یہ تجربہ اس کے باطنی دباؤ ہی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے یعنی وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا اس کے لیے ایک مناسب صنف درکار تھی جو اس پر اس کے تخلیقی عمل کے دوران میں منکشف ہوئی جسے اس نے تین مصرعوں کی نظم کی صورت میں پیش کر دیا۔ حمایت کی ثلاثیوں کا موضوع اس کے کسی احساس کی کوئی ہلکی اور نازک سی لہر یا اس کے خیال کی مخفی کرن ہوتی ہے۔ کسی ہلکی اور نازک سی لہر کے لیے مختصر ترین نظم ہی کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ نزاکت کا طوالت کے ساتھ برقرار رہنا اگر ناممکن نہیں تو سخت دشوار

کام ہے۔ البتہ یہ ضروری نہیں ہے کہ نزاکتِ احساس اپنی اثر انگیزی کے عمل میں بھی محدود ہو۔ چناں چہ حمایت صاحب اپنی ثلاثیوں میں اپنے احساس کی نازک سی لہر کو تخیل کی مدد سے پوری زندگی پر منطبق کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے انھیں اثر انگیزی کی ہمہ گیری حاصل ہو جاتی ہے۔ حمایت نے اگر ایک طرف اپنے نازک احساسات کے اظہار کے لیے ''ثلاثی'' جیسی مختصر صنف کو اپنایا تو اپنے پورے عہد کی صورت گری کے لیے طویل نظم کا انتخاب کیا۔

باب ہشتم

اردو شعر و ادب میں شاعر کا مقام

پروفیسر حمایت علی شاعر اردو کے ایک اہم اور منفرد شاعر ہیں ان کی زندگی بھی اتنی ہی ہمہ جہت ہے جتنا ان کا فن۔ ایک طرف وہ قلم کی دنیا میں اپنا نمایاں مقام بنانے میں کامیاب رہے تو دوسری طرف ریڈیو، ٹی وی، فلم اور اسٹیج کی دنیا میں قال ذکر قرار پائے۔ وہ درس و تدریس سے بھی منسلک رہے اور صحافتی خدمات انجام دیں۔ ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی شخصیت بڑی پہلودار اور متنوع ہونے کے باعث ادب کے طالب علم کے لیے بڑی توجہ طلب ٹھہرتی ہے۔ اردو شعر و ادب میں ان کے مقام کا تعین کرنے کے لیے ہمیں یقینی طور پر ان کے تمام تر فنی پہلوؤں کا بغور جائزہ لینا ہوگا اور یہ جاننے کی کوشش کرنا ہوگی کہ یہ ہمہ جہت فن کار کن کٹھنائیوں سے گزر کر کامیابیوں کی ان منزلوں تک پہنچا اور جب شہرتیں ان کا مقدر بنیں تو انھیں کن مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔

ادب کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بہت بڑے بڑے شعرا نے بڑا نادر کلام اپنے پڑھنے والوں کو عطا کیا اور اپنی تمام زندگی شعر و سخن کے گلشن کی آبیاری کرنے میں گزار دی لیکن اگر ہم بات حمایت علی شاعر کی کریں گے تو یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ یہ وہ شاعر ہے جس کا نام اردو شاعری کی تاریخ میں جلی حروف سے لکھا جائے گا کیوں کہ ان کے کمالات پر نظر ڈالنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف شاعری کی دنیا میں ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی بلکہ کچھ نئی اصناف بھی ایجاد کیں مثلاً ''ثلاثی''، ''یک مصرعی نظم'' اور پھر ''طویل منظوم خودنوشت سوانح حیات'' جو اردو شاعری میں پہلا تجربہ ہے۔ انھوں نے مرثیوں کو بھی ''ثلاثی'' کی شکل میں نظم کیا پھر دوسری طرف انھوں نے جب نثر کے میدان کو اپنایا تو اس میں بھی افسانہ، تنقید اور تحقیق کو اپنایا اور ڈرامے منثور و منظوم دونوں لکھے اور کامیاب لکھے۔ اخبار کی دنیا میں آئے تو وہاں بھی کمالات کا ایک انبار لگا دیا جو دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کا سبب ثابت ہوا۔

حمایت صاحب نے صداکاری، ہدایت کاری، اداکاری، فلم سازی، گیت نگاری میں بڑا یادگار کام کیا اور مختلف ایوارڈ کے حقدار قرار پائے۔ ٹی وی پر میزبانی کے علاوہ جو تحقیقی پروگرام کیے وہ آج بھی اہل علم کے ذہنوں میں ہیں تو ایک آدمی میں بہ یک وقت اتنی صلاحیتوں کا ہونا اور پھر ان صلاحیتوں کا خوب صورت مظاہرہ کرنا بھی تو اس کو منفرد بناتا ہے۔ چناں چہ حمایت صاحب اپنی ان تمام صلاحیتوں کی بنا پر ادب کا وہ مضبوط ستون قرار پاتے ہیں جن کی کوئی دوسری مثال حالیہ عہد میں نہیں ملتی وہ ہر لحاظ سے اس ہجوم بے کراں میں نمایاں و ممتاز نظر آتے ہیں جس کا اعتراف ادب کے بہت مستند اہل قلم نے بارہا کہا ہے اور میں یہ بات بہت زور دے کر کہوں گی کہ ہمارے عہد میں تو حمایت صاحب جیسی علم و فن سے محبت کرنے والی شخصیات شاید و باید ہی ہوں۔ بے شک یہ ہماری اور ہمارے عہد کی انتہائی بدقسمتی بھی کہی جا سکتی ہے اور سونے پر سہاگہ یہ کہ ہم اپنے اس سرمائے کی نہ تو حفاظت کرتے ہیں نہ قدر کرتے ہیں بلکہ جہاں موقع ملے زک پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرتے جب کہ ہم اس بات سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ ہمارے ہاں ''سیکنڈ لائن'' تیار کرنے کا تو قطعاً رجحان نہیں ہے تو ایسے میں کیا ہم مطلق فلاش ہو جانے کی حالت میں نہیں ہیں۔ یہ لمحۂ فکریہ ہے کہ جب ہمارے سروں سے یہ ''چند پڑھنے لکھنے'' والے بھی اُٹھ جائیں گے تو ہم کس قدر تہی دامن ہو جائیں گے۔

خیر بات ہو رہی تھی حمایت صاحب کے فن کی ان کی زندگی کی تو میرے اس مقالے سے آپ کو ان کی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں اور بعض ایسے گوشوں سے واقف ہونے کا موقع ملے گا جس میں آپ کو چکی کی مشقت کی مثالیں بھی ملیں گی۔ ان کے ''بہت برے'' وقت کے بارے میں کچھ معلومات ہوں گی۔ ان تمام باتوں کو تفصیل سے پیش کرنے کا مقصد دراصل یہ ہے کہ پڑھنے والوں خصوصاً نئی نسل کو یہ باور کرایا جا سکے کہ ''دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا'' حمایت صاحب نے حالات کی تمام تر سختیوں اور وقت کی تمام تر بے رحمیوں کے باوجود ادب کے خارزار میں ایک ماہر شہسوار کی طرح تمام منزلیں طے کیں اور گلشن ادب کے ہر پھول کی خوشبو کو جانا اور محسوس کیا اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ حمایت صاحب نے ایک طویل عمر اپنا رشتہ قلم سے جوڑے رکھا ہے اور بہت کم عمری میں ہی اپنے اطراف کے حالات سے متاثر ہو کر شعر گوئی کا آغاز کر دیا تھا، دوسری طرف یہ امر خاص اہمیت اور دلچسپی کا بھی باعث ہوگا کہ اس منفرد اور مقبول شاعر نے

اپنی ادبی زندگی کا آغاز نثر سے کیا یعنی منٹو سے متاثر ہو کر افسانے لکھنا شروع کر دیے، ہمارا یہ المیہ ہے کہ ہم کسی بھی بڑے فن کار کے فن کے تمام تر پہلوؤں پر نظر ہی نہیں ڈالتے ہیں یوں تو ہمارے ہاں بڑے بڑے نقاد اور محقق قدم قدم پر ملتے ہیں تو اگر کوئی حمایت صاحب کے افسانوں کو بھی تلاش کر لیتا تو اہل ادب کو معلوم ہو جاتا کہ وہ شاعر ہونے کے باوجود بنیادی طور پر افسانہ نگار ہی ہیں اور میرے خیال میں اسی وجہ سے انھوں نے شاعری کے میدان میں قدم رکھنے کے بعد افسانوی نظمیں بھی تخلیق کیں۔ آپ جب ان کے تخلیق کردہ افسانے پڑھیں گے تو میری اس بات کی تصدیق خود ہی ہو جائے گی اس مقالے میں آپ کو چند افسانوں سے اقتباسات ضرور پڑھنے کو ملیں گے۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ جب حمایت صاحب نے شعر کہنا شروع کیا تو اس کا محرک انھوں نے کرشن چندر کو ٹھہرایا جب کہ وہ اس وقت شاعری میں صرف علامہ اقبال کو حرفِ اوّل کی حیثیت دیتے تھے۔ ان کا باغیانہ مزاج ان کی ابتدائی نظموں میں بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی واضح کرتی چلوں کہ ان کا یہ باغیانہ پن فطری امر تھا کیوں کہ ان کی پرورش جس ماحول میں ہوئی تھی وہاں کسی حساس آدمی کا زیست کرنا ایک امتحان تھا۔ وہ ایک ایسے متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جہاں تعلیم بالکل نہیں تھی اور جہاں تعلیم نہیں ہوتی وہاں جہالت کا راج ہوتا ہے۔ وہاں کے روایتی اور جاہلانہ عقائد تواتر اور تسلسل کے ساتھ نسل در نسل بطور ورثہ منتقل ہوتے چلے جاتے ہیں اور پھر ان گھرانوں میں جتنی بھی برائیاں جنم لیں وہ کم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حمایت صاحب کی شاعری میں مذہبی روایتی عقائد اور مذہبی مذموم شخصیات کے خلاف بھی اظہارِ خیال موجود ہے جن کی راہ بہ قول حمایت صاحب علامہ اقبال کے اشعار نے ہموار کی تھی لیکن اقبال کے علاوہ حمایت صاحب کے ذہن پر اور ان کی شاعری پر خصوصاً مخدوم محی الدین کے اثرات بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔

حمایت صاحب نے اپنی پُرشور نظموں کے باعث نامور شعرا میں اپنا مقام تو بنا ہی لیا تھا لیکن وہ اپنی گرج دار آواز اور خوب صورت ترنم کے باعث مشاعروں کے مقبول شعرا میں بھی شمار کیے جاتے تھے لیکن اس تمام شہرت اور مقبولیت کے باوجود ان کے معاشی حالات کا تقاضا تھا کہ وہ کوئی مستقل ملازمت بھی حاصل کریں چناں چہ انھوں نے ریڈیو میں ملازمت حاصل کر لی اور وہاں فیچرز بھی تحریر کیے، تقریریں بھی لکھیں اور گیت و نغمات بھی لکھے۔ فلم انڈسٹری سے منسلک ہونے کی بھی بڑی

وجہ ان کے خراب معاشی حالات تھے، کیوں کہ وہ ایک بڑے کنبے کے سربراہ تھے اور تمام ذمہ داریاں انھی پر عائد ہوتی تھیں۔

بازار میں آئے ہیں تو بولی بھی اٹھے گی
فن جنس ہی ٹھہرا ہے تو گاہک کی خطا کیا ہے

ان کے فکری پس منظر کی تلاش میں ہمیں ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جو خود کو دریافت کرتی نظر آتی ہیں لیکن ان کی چند ایک نظمیں ایسی بھی ہیں جو اس اسلوب سے ہٹ کر راست گوئی کی تعریف میں آتی ہیں لیکن ان کا اندازِ تمثیلی ہے یا محاکاتی۔ یہ نظمیں اپنے بطن میں ایک خاص نکتہ رکھتی ہیں۔ ابتدا سے آخر تک بنیادی خیال پر ایک پردہ پڑا رہتا ہے۔ بس جب قاری آخری مصرعے پر پہنچتا ہے تو پوری نظم کے معنی روشن ہو جاتے ہیں۔ یہ مختصر نظمیں ہیں ان میں خیال کی ندرت بھی ہے اور بیان کی بھی۔ ان کی اکثر نظموں میں تاریخ کا شعور بھی جھلکتا ہے اور معاشرے کی ہر اس خرابی کا بھی تذکرہ ہے جو ہمارے پاؤں کی زنجیر بنی رہتی ہے یعنی کہیں تقدیر، کہیں طبقات، کہیں ہوس اور کہیں افلاس۔ حمایت صاحب نے انھی تمام چیزوں کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ نظموں کے نامی گرامی شعرا کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں یہ احساس شدت سے ہوتا ہے کہ جس وسیع کینوس پر حمایت صاحب نے اپنی نظمیں تحریر کی ہیں۔ وہ اکثر و بیشتر شعرا کے یہاں مفقود ہے۔ جہاں تک ان کی رومانی شاعری کا تعلق ہے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ زندگی کے وہ تلخ حقائق جو ان کے تحت الشعور میں بسے ہوئے تھے وہ بھی ان کی رومانی شاعری میں در آئے ہیں اور ان کی رومانی نظمیں بھی مسائل حیات سے آلودہ ہیں لیکن وہ نظمیں جو نوجوانی کے اوّلین خوابوں میں آباد تھیں بلاشبہ بہت خوب صورت نظمیں ہیں اور ایسے محسوسات اور جذبات کی ترجمان ہیں جن سے انسان پہلی بار آشنا ہوتا ہے، جن سے انسان کا اندرونی وجود جھلکتا ہے اور جس کے بیان کے لیے صرف ایک شاعر کا دل اور ایک شاعر کی زبان درکار ہوتی ہے۔ ان کے یہاں ہمیں ایسے موضوعات بھی ملتے ہیں جو غزل کی روایت سے قدرے مختلف سمجھے جاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ حمایت صاحب غزل کو محدود کرنے کے قائل نہیں ہیں لیکن اظہار میں غزل کی تہذیب کے طرف دار بھی ہیں وہ ادب کی اعلیٰ اور ابدی قدروں سے بھی واقف ہیں اور ان کو نبھانا بھی جانتے ہیں۔

ان کی شاعری کا کافی بڑا حصہ مسائلی شاعری پر مشتمل ہے۔ ''مٹی کا قرض'' کا بیشتر کلام فکری

شاعری کی تعریف میں آتا ہے اور وہ ''مخصوص فکر'' ان کی مسائلی شاعری میں جھلکتی ہے۔ جب ''مٹی کا قرض'' سے آگے بڑھ کر ''ہارون کی آواز'' تک پہنچتے ہیں تو اس میں بھی اکثر وہی روش نظر آتی ہے جو ایک طرح سے جذباتی اور مسائل پسندانہ ہے۔ ان کے اشعار میں نت نئی علامتیں بھی آتی ہیں اور ان کا کینوس بھی وسیع ہوا ہے لیکن وہ بہر حال ہیں مسائلی نظمیں ہی۔

یہاں ایک اور بہت اہم پہلو کی طرف بھی اشارہ کرتی چلوں کہ ہمارے ہاں شاعری میں مرثیے کا تصور صرف ''کربلا'' اور حضرت امام حسینؓ تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اور دکنی شاعری میں عموماً غزل کی ہیئت میں مرثیہ لکھا جاتا رہا۔ البتہ میر تقی میر اور سودا نے اس کو چار مصرعوں کے بند کی صورت میں نظم کیا۔ کچھ مرثیے ہمیں مخمس اور مسدس کی شکل میں بھی ملتے ہیں لیکن اس خاص اور نازک صنفِ سخن میں حمایت صاحب نے اس طرح انفرادیت کا اظہار کیا کہ مرثیے اور نوحے کے لیے انھوں نے اپنی ایجاد خاص صنف ''ثلاثی'' استعمال کی اور تین مصرعوں کی وحدت سے وہی کام لے لیا جو اکثر شعرا نے مسدس کے ایک بند سے لیا۔ لہٰذا یہاں بھی وہ اختصاص کے حامل قرار پاتے ہیں۔ دوسری طرف جو مثالیں کربلا کے حوالے سے مرثیے کے مخصوص موضوع پر ان کے یہاں ملتی ہیں ان کے علاوہ بھی انھوں نے اپنے عہد کی شخصیات اور عزیزوں، دوستوں کا غم بھی بیان کیا ہے۔ عام طور پر بہ ظاہر ایسے قطعات اور نظمیں بہت لمحاتی اور وقتی سی محسوس ہوتی ہیں لیکن لکھنے والے کے مزاج کی نرمی اس کے دماغ کی وسعت اور اس کی کشادہ دلی کا سراغ ضرور دیتی ہیں۔

آپ کو اس مقالے سے شاعر صاحب کی محبت، شادی اور بیگم سے لافانی محبت کا بھی اندازہ ہو جائے گا اور خاص طور پر جب ان کی بیگم راہی عدم ہو گئیں تو حمایت صاحب کے دل و دماغ کی کیا کیفیت تھی اور ان کٹھن لمحات میں انھوں نے جو نظمیں کہیں وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں اور اب تو ان کی تعداد اتنی ہو چکی ہے کہ وہ ایک علاحدہ مجموعے کی متقاضی ہیں۔

حمایت صاحب کے شاعرانہ کلام کا تفصیلی جائزہ لینے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ انھیں اردو شاعری کی دنیا میں نمایاں مقام دلانے میں ان کی طویل تمثیلی نظموں نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ جب ۱۹۵۱ء میں پاکستان آ گئے تھے اس وقت انھوں نے دو طویل نظمیں لکھیں جن میں سے ایک ''شعلۂ بے دود'' ہے اور دوسری ''بنگال سے کوریا تک'' کے نام سے عالمی جنگ کے خلاف ایک طویل افسانوی نظم ہے اور اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا ان دونوں نظموں کو امن

تحریک میں اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش بھی کہا جا سکتا ہے کیوں کہ یہ عالمی سیاسی مسائل کی روشنی میں لکھی گئی تھیں۔ انھوں نے ایک اور طویل نظم ''حرف حرف روشنی'' کے عنوان سے بھی لکھی جو اس وجہ سے اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں نئی نسل کے سب سے بڑے مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے اور وہ مسئلہ اپنی تاریخ کے تسلسل سے نکل کر مقامی تاریخ سے رشتہ جوڑے رکھنا ہے۔ ''لاشعور'' پر شعور کا قابو پانا اور وقت کی رفتار سے مطابقت پیدا کرنا ایک مشکل ترین عمل ہے اور اس عمل میں کئی نازک مقام بھی حارج ہوتے ہیں۔

حمایت صاحب کا ایک بڑا کارنامہ ''آئینہ در آئینہ'' بھی ہے جو ان کی منظوم خودنوشت سوانح حیات ہے۔ تحقیق سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ حمایت صاحب سے قبل بھی شعرا نے اپنی سوانح منظوم کرنے کی کوششیں کی تھیں جس کا تفصیلی حوالہ اردو کے معروف محقق مشفق خواجہ کے ایک مطبوعہ مضمون ''منظوم آپ بیتیاں'' میں موجود ہے اور یہ ثابت کرتا ہے کہ ''آئینہ در آئینہ'' سے قبل کوئی تخلیق مکمل طور پر منظوم خودنوشت سوانح حیات نہیں کہلائی جا سکتی۔ چناں چہ یہ سہرا بھی حمایت صاحب کے سر ہی جاتا ہے۔ دوسری بہت اہم بات وہ یہ کہ ''آئینہ در آئینہ'' مثنوی کے انداز میں نہیں بلکہ ایک پابند نظم کی صورت میں تحریر کی گئی ہے جس میں ہر شعر مطلع کی صورت میں ہے اور یہ پوری نظم تقریباً ساڑھے تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس نظم کے سنجیدہ مطالعے کے بعد پورے یقین سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ حمایت صاحب کو اردو شاعری میں امر کر دینے کے لیے یہ ایک تخلیق بھی کافی تھی لیکن ابھی ان کے اور کارنامے بھی موجود ہیں جو ان کو اردو شاعری کی دنیا میں اہم بناتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ طویل نظم نگاری ان کا خاصہ ہے اور انھوں نے اردو نظم نگاری میں طویل نظم کی روایت کو مستحکم کیا۔

حمایت صاحب کو دوسروں سے منفرد رہنے کا فن آتا ہے اور وہ اس اختصاص کو برقرار رکھنے کے لیے مسلسل کوشاں رہتے ہیں۔ یہ بات انتہائی قابلِ ذکر ہے کہ انھوں نے جہاں طویل نظموں میں اپنا نمایاں مقام بنایا، وہیں انھوں نے مختصر ترین اصناف میں بھی خود کو آزمایا۔ ہم جانتے ہیں کہ غزل کا شعر دنیا میں سب سے مختصر پیمانۂ اظہار ہے یعنی صرف دو مصرعوں میں بڑی سے بڑی بات بڑے سے بڑا خیال سمیٹ لیا جاتا ہے لیکن انھوں نے اس سے بھی زیادہ مختصر طریقہ اختیار کیا یعنی ''ایک مصرع ایک نظم'' دوسری طرف ایک اور نئی صنفِ سخن ''ثلیثہ'' کے نام سے وجود میں لے آئے

یعنی تین مصرعوں کی وحدت میں مکمل خیال پیش کر دینا۔ میرے اس مقالے میں ''تثلیث یا ثلاثی'' کے عنوان سے ایک مکمل باب موجود ہے جس میں ہر پہلو پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

یہ بات تو اب ثابت ہو چکی ہے کہ حمایت صاحب نے اردو شاعری میں ایک منفرد اور نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے اور اس میں یقیناً ان صلاحیتوں کو بڑا دخل ہے جو انھیں اللہ تعالیٰ نے عطا کیں لیکن ان صلاحیتوں کو جس قرینے سے استعمال کیا گیا وہ حمایت صاحب کی خوبی ہے۔ کیوں کہ یہ خوب صورت اور مترنم شاعر جب فلم نگری کی طرف روانہ ہوا اور وہاں جو میدان سر کیے وہ بھی قابل توجہ اور متاثر کن ہیں۔ دراصل ان کا تعلق ریڈیو اور اسٹیج سے تو انڈیا میں ہی جڑ گیا تھا اور پاکستان آمد کے بعد بھی برقرار رہا پھر وہ فلم کی طرف چلے گئے اور جب پاکستان میں ٹی وی متعارف ہوا تو وہ وہاں خدمات انجام دینے لگے۔ فلم میں انھوں نے پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور رائٹر کی حیثیت سے تو کام کیا ہی لیکن فلموں کو جو سپر ہٹ گانے دیے وہ آج تک ہماری سماعتوں میں رس گھول رہے ہیں اور نگار ایوارڈ کی ایک بڑی تعداد ان کے گھر میں ماضی کی یادوں کو سنہرا رکھے ہوئے ہے۔

میں نے اپنے اس پورے مقالے میں کہیں بھی حمایت صاحب کو کوئی مافوق الفطرت یا عجوبۂ روزگار قسم کی چیز ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی البتہ پوری دیانت داری کے ساتھ ان کے فن کا جائزہ ضرور پیش کیا ہے۔ حمایت صاحب نے قلم سے اپنے ''ویرینہ رشتے'' کو جس طرح نبھایا ہے وہ انھی کا حصہ ہے۔ مقدار اور معیار اور سونے پر سہاگہ متنوع اصناف پر کامیاب طبع آزمائی اور ہیئتوں کے منفرد تجربے انھیں ہر طرح سے ایک کامیاب قلم کار کہلوانے کے لیے کافی ہیں۔ خصوصاً اس لیے کہ حمایت صاحب کے بچپن سے لے کر آج تک کے تمام حالات اور ان کے مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی یہ فتوحات زیادہ قابل ذکر ہیں۔

دنیا کے بیشتر ممالک کا سفر اور وہاں سے حاصل کردہ بے شمار اعزازات اور ایوارڈز بھی یہ باور کراتے ہیں کہ وہ جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ گئے۔

حمایت صاحب کی افسانہ نگاری کے حوالے سے ان کی تحریروں کی سنجیدگی اور گہرائی کا اندازہ ان کے افسانوں سے ہی کہا جا سکتا ہے لیکن میں یہاں صرف چند عنوانات رقم کر رہی ہوں۔ آپ وہ ملاحظہ فرمائیے ''فلسفہ اور حقیقت''، ''غریب''، ''آزادی''، ''تاج کے زیر سایہ''، ''بدلتے زاویے''۔ یہ عنوانات یہاں درج کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ آپ بحیثیت افسانہ نگار حمایت

صاحب کی سوچ اور ان کے ذہنی رجحان کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ میں نے ان افسانوں کو کئی بار پڑھا اور پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ اگر حمایت صاحب باقاعدہ طور پر پڑھنے لکھنے کی طرف نہ آتے تو شاید ان سے زیادہ ''باغی'' انسان کی کوئی دوسری مثال آپ کو نہیں ملتی۔ یہ شاید ان کے نام کا اثر اور ان کے کچھ بزرگ ہم عصروں کی محبت اور تربیت کا نتیجہ ہے کہ انھیں اپنے غصہ اور اپنے باغیانہ خیالات کو کاغذ پر منتقل کرنے کا فن آ گیا۔ میری سمجھ میں ان کے قلمی ناموں کی بھی یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ ''ابن مریم''، ''نردوش'' اور ''ابلیس فردوسی'' جیسے ناموں سے انھوں نے اپنے دل کا غبار نکالا۔

نثر میں حمایت صاحب نے افسانوں کے علاوہ ریڈیو کے لیے بھی بہت کچھ لکھا جن میں گیتوں بھری کہانیاں اور تحقیقی مضامین سرفہرست ہیں۔ مختلف ممالک میں وہ اردو ادب کے بہت اہم موضوعات پر لیکچرز دینے بھی جاتے رہے ہیں اور اپنی شاعرانہ ''نثر'' کی بنا پر پسند بھی کیے گئے۔ ان کے متعدد تنقیدی اور تحقیقی مقالے کتابوں کی شکل میں سامنے آ چکے ہیں۔ سندھ یونیورسٹی میں تدریس کے دوران ان کے مرتب کردہ دو خاص نمبر اپنی جگہ بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ پھر نئی نسل کے لکھنے والوں کے حوالے سے بھی ان کی دو کتابیں منظر عام پر آ رہی ہیں۔ ان سب سے قطع نظر نثر میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ ''ڈرامہ نگاری'' ہے اور منظوم ڈرامے اور غنائیے ان کا اختصاص ہیں۔ کئی لوک داستانوں کو بھی انھوں نے ڈرامائی شکل میں پیش کیا ہے جن میں انھوں نے ان سچائیوں پر سے پردہ اٹھایا ہے جو ایک عرصے سے ان پر پڑا ہوا تھا۔ انھوں نے سندھ کی داستانوں کو بھی ڈرامے کی شکل میں پیش کر کے تاریخی ریکارڈ کو درست حالت میں برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے اگر یہ سلسلہ جاری رہتا تو شاید آج اسٹیج اتنا ویران نظر نہ آتا۔

انھوں نے ریڈیو کے لیے بھی کچھ غنائیے تحریر کیے جو اس دور کے لوگوں کے لیے بڑی دلچسپی کا باعث ہوا کرتے تھے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ بڑی دلچسپ ہے کہ انھوں نے فلم انڈسٹری کے لیے سب سے پہلے ایک قومی ترانہ لکھا۔

حمایت صاحب نے اردو شعر و ادب میں جو منفرد مقام حاصل کیا وہ یقیناً بہت صبر آزما اور جانفشانی کے بغیر ناممکن تھا۔ وہ تقریباً ستر سال سے مسلسل اپنا خون جگر دے کر ادب کا چراغ روشن رکھے ہوئے ہیں اور انھیں بھرپور پزیرائی بھی ملتی رہی ہے وہ آسمان ادب کے روشن ستارے کی مانند ہر سُو

اپنی روشنی بکھیر رہے ہیں اور ایک دنیا ان کی قدرداں ہے ورنہ دنیا کی مختلف زبانوں میں ان کے تراجم نہ ہوئے ہوتے۔ آدھی سے زیادہ دنیا نہ دیکھ چکے ہوتے اور بڑی تعداد میں ایوارڈز اور اعزازات نہ حاصل کیے ہوتے۔ ان پر جتنا کام اب تک ہو چکا ہے وہ بھی میں نے مقالے میں تفصیل سے پیش کیا ہے۔ معتبر اہلِ قلم کی آرا بھی اس مقالے میں شامل ہیں جن کی روشنی میں حمایت صاحب اور ان کے فن کو بہت اچھی طرح سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔

یہ باب میرے مقالے کا آخری باب ہے اس لیے کچھ باتیں میں ذاتی طور پر بھی کرنا مناسب سمجھتی ہوں۔ حمایت صاحب کو میں اپنے بچپن سے جانتی تھی۔ ان کے فلمی نغمے اور ملّی ترانے مجھے ازبر تھے۔ پھر گزرتے وقت کے ساتھ میں نے ان کو باقاعدہ پڑھا ان سے ملاقاتیں ہوئیں جس کے بعد مجھے ان پر کام کرنے کا خیال آیا۔ دو کتابوں کی اشاعت کے دوران میں نے انھیں کافی سمجھ لیا تھا اور یوں میں نے ان پر مقالہ لکھنے کا ارادہ کیا۔ اس مقالے کی تیاری میں ان سے کئی بار ملنے کا بھی موقع ملا اور اس دوران میں نے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور زندگی کے کچھ پوشیدہ گوشوں کو بھی ٹٹولا ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ میں نے ان کے فن پر بلکہ ہر پہلو پر بہت کڑی نظر بھی رکھی ہے۔

حمایت صاحب سے پہروں گفتگو کے دوران میں نے ان کی شخصیت کے مختلف روپ دیکھے۔ میں نے ان کو ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتے، بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے اور دل فگار انداز میں اپنی چہیتی بیگم کا ذکر کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ میں نے ایک خاص چمک ان کی آنکھوں میں اس وقت دیکھی جب وہ اپنے بچوں کا ذکر کر رہے ہوتے تھے۔ میں نے ان کے ہونٹوں پر بہت خوب صورت مسکراہٹ اس وقت دیکھی جب میں نے کسی بہت معنی خیز شعر کی طرف اشارہ کر کے تفصیل پوچھنے کی کوشش کی۔ میں نے ان کو بعض مواقع پر شدید غصے اور اشتعال کے عالم میں بھی دیکھا جب ان سے سچائی اگلوانے کی خاطر کچھ تلخ سوالات کیے۔ غرض یہ کہ میں نے ان کے ساتھ بہت وقت گزارا تاکہ میں ان کے گرم و سرد سے واقف ہو سکوں۔ میں کبھی ان کو ماضی میں کھینچ کر لے جاتی تھی اور کبھی اچانک حال میں گھسیٹ لیتی تھی اور اس آمد و رفت سے میں نے جو کچھ حاصل کیا وہ سب اس مقالے میں موجود ہے۔

میں یہ بھی سوچتی ہوں کہ حمایت صاحب جیسی متنوع اور پہلودار شخصیات اب ہمارے پاس نہ

ہونے کے برابر ہیں۔ یہ اردو ادب کا وہ سرمایہ ہیں جس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے اور ان سے جتنا استفادہ کر لیا جائے وہ اچھا ہے۔

میں اپنے اس مقالے کا اختتام ان الفاظ سے کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ حمایت صاحب کی صحت اور عافیت کے ساتھ عمر میں برکت عطا فرمائے تاکہ وہ تادیر اپنے قلم اور اپنی آواز سے اپنے پسند کرنے والوں کو فیض یاب کرتے رہیں۔ کیوں کہ ہمارے ادبی خزانے میں پہلے ہی لعل و جواہر بہت کم تعداد میں ہیں۔ آخر میں انھی کا ایک شعر:

میں کچھ نہ کہوں اور یہ چاہوں کہ میری بات
خوش بو کی طرح اُڑ کے ترے دل میں اُتر جائے

کتابیات

شاعر حمایت علی، آگ میں پھول، حلقہ ارباب شعور، کراچی، ۱۹۵۶ء

شاعر حمایت علی، مٹی کا قرض، پاک کتاب گھر، کراچی، ۱۹۷۴ء

شاعر حمایت علی، شیخ ایاز، المصنفین، کراچی، ۱۹۷۹ء

شاعر حمایت علی، تشنگی کا سفر، پاک کتاب گھر، کراچی، ۱۹۸۰ء

شاعر حمایت علی، شخص و عکس، المصنفین، کراچی، ۱۹۸۴ء

شاعر حمایت علی، ہارون کی آواز، المصنفین، کراچی ۱۹۸۵ء

شاعر حمایت علی، حرف حرف روشنی، انتخاب، مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۸۶ء

احتشام حسین سیّد، تنقید اور عملی تنقید، لکھنؤ، ۱۹۶۱ء

احتشام حسین سیّد، تنقیدی جائزے، احباب پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۶۳ء

احتشام حسین سیّد، تنقیدی نظریات، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۱۹۶۶ء

احتشام حسین سیّد، ذوق ادب و شعور، لکھنؤ، ۱۹۶۳ء

احتشام حسین سیّد، روایت اور بغاوت، لکھنؤ، ۱۹۶۳ء

اختر انصاری دہلوی، افادی ادب، حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی، س۔ن

اختر اورینوی، تحقیق و تنقید، شاد بک ڈپو، پٹنہ، س۔ن

اختر تلہری، تنقیدی شعور، کتاب نگر، لکھنؤ، س۔ن

اختر حسین رائے پوری ڈاکٹر، ادب اور انقلاب، نیشنل ہاؤس، بمبئی، س۔ن

انصاری اسلوب احمد، ادب اور تنقید، سنگم پبلشرز، الہ آباد، ۱۹۶۸ء

اعجاز حسین ڈاکٹر سیّد، مذہب اور شاعری، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۵ء

اعجاز حسین ڈاکٹر سیّد، مختصر تاریخ ادب اردو، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۶ء

اعجاز حسین ڈاکٹر سیّد، نئے ادبی رجحانات، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، س۔ن

جمیل جالبی ڈاکٹر، ارسطو سے ایلیٹ تک، نیشنل بک فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۷۵ء

جمیل جالبی ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو اوّل، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵ء

جمیل جالبی ڈاکٹر، تنقید اور تجربہ، مشاق بک ڈپو، کراچی، ۱۹۷۵ء

جیلانی کامران، تنقید کا نیا پس منظر، ملتبہ ادب جدید، لاہور، ۱۹۶۴ء

حسن حمیدی، سحر آواز دیتی ہے، عرب امارات، س۔ن

زینت ساجدہ، حیدر آباد کے ادیب، آندھرا پردیش اکادمی، دکن، س۔ن

سکسینہ رام بابو، تاریخ ادب اردو، نولکشور پریس، لکھنؤ، س۔ن

سرور آل احمد، ادب اور نظریہ، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۵۴ء

سرور آل احمد، تنقید کیا ہے، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۴ء

سبط حسن، شہر نگاراں، طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ، کراچی، ۱۹۶۶ء

سردار جعفری، بہترین ادب ۱۹۵۱ء، مکتبہ شاہراہ، دہلی، ۱۹۵۲ء

سردار جعفری، ترقی پسند ادب، ترقی اردو ہند علی گڑھ، ۱۹۵۷ء

سجاد باقر رضوی، مغرب کے تنقیدی اصول، اظہار سنز، لاہور، ۱۹۶۶ء

سجاد ظہیر، روشنائی، مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۵۶ء

سجاد ظہیر، اردو ہندی ہندوستانی، کتب پبلشرز، بمبئی، ۱۹۴۷ء

سلیم اختر ڈاکٹر، تنقیدی دبستان، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۴ء

سلیم اختر ڈاکٹر، اردو کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل، لاہور، ۱۹۷۳ء

سلیمان اریب، حیدر آباد کے شاعر (اوّل)، ساہتیہ اکیڈمی، دکن، ۱۹۷۲ء

سلیمان اریب، حیدر آباد کے شاعر (دوم)، آندھرا پردیش، دکن، س۔ن

شاہد حمید الدین خواجہ، حیدر آباد کے شاعر (اوّل)، آندھرا پردیش، دکن، ۱۹۵۸ء

شمیم احمد، برشِ قلم، قلات پبلشر، کوئٹہ، ۱۹۸۳ء

صدیقی ڈاکٹر ابواللیث، تجربے اور روایت، اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی، ۱۹۵۹ء

علی جواد زیدی، اردو میں قومی شاعری کے سو سال، پرکاش شاکی لکھنؤ، ۱۹۵۷ء

عبدالقوی ضیاء پرویز، وہ آئیں گھر میں ہمارے۔۔۔کینیڈا۔۔۔س۔ن

عبادت بریلوی ڈاکٹر، غزل اور مطالعہ غزل، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۵۵ء

عبادت بریلوی ڈاکٹر، تنقیدی زاویے، مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۵۱ء

عسکری محمد حسن، انسان اور آدمی، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۵۳ء

عسکری محمد حسن، ستارہ یا بادبان، مکتبہ سات رنگ، کراچی، ۱۹۶۳ء
فرمان فتح پوری ڈاکٹر، اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۲ء
فرمان فتح پوری ڈاکٹر، زبان اور اردو زبان، کراچی، ۱۹۷۲ء
فاروقی محمد احسن ڈاکٹر، اردو میں تنقید، مشتاق بک ڈپو، کراچی، س۔ن
فاروقی خواجہ احمد، کلاسیکی ادب، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۵۲ء
کلیم الدین احمد پروفیسر، اردو شاعری پر ایک نظر، عظیم پبلشنگ ہاؤس، پٹنہ، س۔ن
مغنی تبسم ڈاکٹر، آواز اور آدمی، الیاس ٹریڈرز، دکن، ۱۹۸۳ء
محمد حسن ڈاکٹر، جدید اردو ادب، غضنفر اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۴ء
مجنوں گورکھ پوری، ادب اور زندگی، اردو گھر، علی گڑھ، ۱۹۶۵ء
محمد حسن ڈاکٹر، ادبی تنقید، لکھنؤ، ۱۹۵۴ء
محمد حسن ڈاکٹر، اردو ادب میں رومانوی تحریک، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، لاہور، س۔ن
ممتاز حسین، نقد حیات، پبلشرز الہ آباد، ۱۹۵۰ء
میراجی، مشرق و مغرب کے نغمے، اکادمی پنجاب، لاہور، ۱۹۵۸ء
نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، اردو مرکز، لاہور، ۱۹۶۰ء
نیاز فتح پوری علامہ، انتقادیات، ادارہ ادب العالیہ، کراچی، ۱۹۹۸ء
وحید قریشی ڈاکٹر، تنقیدی مطالعے، مکتبہ کارواں، لاہور، ۱۹۶۷ء
وزیر آغا ڈاکٹر، ۱۹۶۴ء کی بہترین نظمیں، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۶۵ء
یونس حسنی ڈاکٹر، اختر شیرانی اور جدید اردو ادب، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۷۶ء

ڈاکٹر رعنا اقبال

پروفیسر حمایت علی شاعر اردو کے ایک اہم اور قابل ذکر شاعر ہیں لیکن ان کی زندگی بڑی ہمہ جہت ہے اور اسی طرح ان کے فن کے پہلو بھی متنوع ہیں۔ وہ نثر نگار بھی ہیں، محقق بھی ہیں، صحافی بھی ہیں، نغمہ نگار بھی، مکالمہ نویس بھی ہیں اور ریڈیائی ڈراموں کے مصنف بھی، اداکار بھی رہے اور صداکار بھی، اسی طرح ان کی ادبی شخصیت بڑی پہلودار، بہت متنوع اور ادب کے طالب علم کے لیے بڑی توجہ طلب بن جاتی ہے۔ آپ بحیثیت استاد سندھ یونیورسٹی سے منسلک رہے۔ عمر کی ایک منزل میں آپ نے فلمی گیت اور کہانیاں بھی لکھیں، لیکن آپ کا بنیادی حوالہ شاعری ہی ہے۔ آپ اردو میں ایک نئی صنف ''ثلاثی'' کے موجد بھی ہیں اور ایک بحر میں منظوم خودنوشت لکھنے کا سہرا بھی انہی کے سر جاتا ہے۔

زیر نظر کتاب میں ڈاکٹر رعنا اقبال نے آپ کے فکر وفن کے متنوع پہلوؤں کو سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ آپ وفاقی جامعہ اردو کراچی سے وابستہ ہیں۔

www.nla.gov.pk